PAGES MISSING WITHIN THE BOOK ONLY

UNIVERSAL
LIBRARY
OU_224193
UNIVERSAL
LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۸۹۱۵ ح ۳۰ ہ Accession No.

Author ذرئے ادب

Title ذرئے ادب (۱۹۶۲ء)

This book should be returned on or before the date last marked below.

انجمنِ اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

کا

سہ ماہی رسالہ

نوائے ادب

ناشر

ادبی پبلشرز (شعبۂ اشاعت انجمنِ اسلام) ممبئی ۸

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

(بمبئی یونیورسٹی سے ملحق)

کے

اغراض و مقاصد

١. ایم اے کی تعلیم کا انتظام

٢. پی ایچ ڈی اور دوسرے تحقیقاتی کام کرنے والوں کی اعانت۔

٣. تحقیقاتی کام کرنے والے اداروں اور جامعوں سے تعاون۔

٤. ایک جامع کتب خانہ کا قیام۔

٥. مختلف کتب خانوں کے اردو کے مخطوطات کی فہرست کی ترتیب۔

٦. نایاب مخطوطات و مطبوعات کی اشاعت۔

٧. اردو سے متعلق ایک علمی و تحقیقاتی سہ ماہی رسالہ کا اجراء۔

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

کے

سہ ماہی رسالہ نوائے ادب کی خصوصیات

١. اردو زبان و ادب سے متعلق مختلف پہلوؤں پر بحث و تحقیق۔

٢. گجرات و دکن کی غیر مطبوعہ اردو تصانیف کی اشاعت

٣. اردو سے متعلق تحقیقاتی کاموں کی اطلاع۔

٤. اردو کے علمی و ادبی رسائل کے مضامین کی تلخیص و اشاعت۔

رسالہ سال میں چار بار شائع ہوگا

جنوری　اپریل　جولائی　اکتوبر

چندہ سالانہ :-	چار روپے	مع محصول ڈاک
ششماہی :-	دو روپے	
فی پرچہ :-	ایک روپیہ	

ایڈیٹر: نجیب اشرف ندوی

ترسیل مضامین و خط و کتابت

ڈائرکٹر

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

٩٢۔ دادا بھائی نوروجی روڈ

بمبئی ١

خریداری و ترسیل زر

ہندوستان میں :-

ادبی پبلشرز

٨ شیفرڈ روڈ، بمبئی ٨

Checked 1975

نوائے ادب بمبئی

جلد ۱۳ — جنوری اکتوبر ۱۹۶۲ ع — شمارہ ۱

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	شذرات	پروفیسر نجیب اشرف ندوی	۲
۲	غالب و ذوق کے سہرے	مہر محمد خان شہاب	۵
۳	امیر خسرو بحیثیت ہندی شاعر	ڈاکٹر صفدر آہ	۲۷
۴	اردو ٹائپ میں تلفظ کا مسئلہ؛ ایک نئی تجویز	سید شہاب الدین دسنوی	۵۲
۵	تبصرے		۶۲
۶	مقالہ نما (ضمیمہ)	ڈاکٹر عالی جعفری و دیگر مرتبین	۱-۱۶

شذرات

اردو زبان و ادب کی بقا و ترقی کے سلسلہ میں جس جوش و زور سے غلغلہ بلند کیا جاتا ہے افسوس کہ عملی دنیا میں اس کا کوئی تسکین بخش و تسلی زا ثبوت نہیں ملتا۔ اگر ہم گذشتہ سال کی ادبی و علمی تصانیف کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ انفرادی اور اداراتی دونوں حیثیتوں سے جو اچھی اور تعمیری کتابیں شائع کی گئی ہیں ان کی تعداد کچھ بہت زیادہ نہیں ہے پھر ابھی تک بہت سے ایسے موضوع ہیں جن کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی ہے۔

اردو میں اقتصادیات اور تاریخ پر اب تک کتنی کتابیں لکھی گئی ہیں؟ علوم کے سلسلہ میں تو ہمارا خزانہ اب تک تقریباً خالی ہی ہے۔ یہ سائنس کا عہد ہے لیکن اس پر علمی تصانیف کا تو ذکر ہی نہیں، عام مطالعہ کے لائق بھی نصف درجن سے زیادہ کتابیں نہیں ملیں گی اور شاید اسی کمی کو محسوس کرکے حکومت ہند نے دوسرے انعاموں کے ساتھ سائنس کی ایسی کتابوں پر بھی جسے ایک عامی مطالعہ کرسکے انعامات مقرر کئے ہیں۔ اس سلسلہ میں اردو کی دو تصانیف کو بھی اس سال انعام ملا ہے۔

اسی طرح بچوں کا صحت مند اور صحت بخش ادب بھی اچھی رفتار اور اچھے معیار پر شائع نہیں کیا جا رہا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ اس ادب کے لکھنے والوں کے لئے ایک خاص قسم کے تربیت یافتہ دماغ کی ضرورت ہے جو ملک و ملت کی تاریخ، زبان اور بچوں کی نفسیات سے واقف ہو۔ پھر اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ ایسی کتابیں تصویروں اور رنگین نقشوں کے ذریعہ بچوں کے لئے دلکش بنائی جائیں۔ اگر ہم نے آج کے بچوں میں اچھا ادبی ذوق پیدا کردیا تو یہی بچے اردو کے پڑھنے والوں اور لکھنے والوں کی محدود تعداد میں خوشگوار اضافہ کرسکیں گے۔

اس سال کی پاکستانی مطبوعات کی ایک ممتاز خصوصیت یہ بھی ہے کہ اردو میں انگریزی، عربی اور دوسری زبانوں کی اہم ادبی، تاریخی، سوانحی، اقتصادی اور سائنسی کتابوں کے ترجمے بھی شریک ہیں۔

طباعت کے سلسلہ میں یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ دونوں ملکوں کے اردو بولنے والوں نے اردو ٹائپ کو پسند کرنا شروع کردیا ہے اور اسی کا نتیجہ

ہے کہ ٹائپ میں چھپی ہوئی خوبصورت اور دیدہ زیب کتابیں بازار میں آ رہی ہیں. یہ سلسلہ اگر قائم رہا تو مستقبل قریب میں اپنی کتابوں کا معیار بہت زیادہ بڑھاسکیں گے. ٹائپ کے سلسلہ میں لغت نویسی میں جو دقتیں پیش آتی ہیں ان پر اسی اشاعت میں ایک مضمون شائع کیا جا رہا ہے جو غور و فکر اور تجربے کا نتیجہ ہے ہمارے ماہرین سے جو ٹائپ کی طباعت اور لغت نویسی کے سلسلہ میں ہر لفظ کے صحیح ہجے بتانے کی مشکلات سے واقف ہیں اور جو اس سلسلہ میں سونچتے اور کسی عملی نتیجہ پر پہنچتے رہے ہیں، درخواست ہے کہ اس طرف توجہ کریں اور اس موضوع پر اپنے خیالات سے مطلع فرمائیں.

ہمارے ملک میں ابتدائی درجوں کو چھوڑکر ذریعہ تعلیم کا مسئلہ بھی ابھی تک خاطر خواہ طے نہیں ہوا ہے اور سہ لسانی تجویز کے مطابق اردو والوں کے لئے اردو کے ذریعہ تعلیم دینے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں ہے کہ وہ نہ صرف اردو کے ثانوی مدارس خود کھولیں بلکہ جہاں علاقائی زبانیں اعلیٰ تعلیم کے لئے ذریعۂ تعلیم ہیں وہاں اپنے کالجوں کا بھی انتظام کریں. یہ صورت بڑی حد تک نا قابل عمل معلوم ہوتی ہے. اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم کو کم از کم تمام سرکاری کاموں کے لئے علاقائی زبان اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ہندی کی بھی اتنی ہی استعداد جس کے ذریعہ ہم ان زبانوں میں کام کرسکیں، پیدا کرنا ہے. ضرورت ہے کہ ہمارے یہاں کے اردو دوست ماہرین تعلیم بڑی سنجیدگی اور عاقبت بینی سے اس مسئلہ پر ہر زاویۂ نگاہ سے غور کریں کہ اردو کے مقام کو ہندوستان میں باقی رکھتے ہوئے ذریعۂ تعلیم کیا ہو؟ ہم کو جذبات سے ہٹ کر حقائق کی روشنی میں اس مسئلہ کو طے کرنا چاہئے کہ اردو اس طرح داخل نصاب رہے کہ ہر منزل پر طالب علم اس کو کم از کم اختیاری مضمون کی حیثیت سے پڑھ سکے.

دسمبر میں دانشگاہ تہران کے شعبۂ فنون کے صدر اور شعبۂ اشاعت و تمدن کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ذبیح‌اللہ صفا نے اپنی تشریف آوری سے ادارہ کی عزت افزائی فرمائی اور ادارہ کے مقصد اور کام کی نوعیت سے اپنی خوشنودی کا اظہار کرتے ہوئے وعدہ فرمایا تھا کہ وہ کوشش کریں گے کہ دانشگاہ تہران اور ادارے سے علمی رشتہ قائم ہوجائے. اس سلسلہ میں انھوں نے دانشگاہ تہران کی ترسٹھ کتابیں

شذرات

اردو زبان و ادب کی بقا و ترقی کے سلسلہ میں جس جوش و زور سے غلغلہ بلند کیا جاتا ہے افسوس کہ عملی دنیا میں اس کا کوئی تسکین بخش و تسلی زا ثبوت نہیں ملتا۔ اگر ہم گذشتہ سال کی ادبی و علمی تصانیف کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ انفرادی اور ادارتی دونوں حیثیتوں سے جو اچھی اور تعمیری کتابیں شائع کی گئی ہیں ان کی تعداد کچھ بہت زیادہ نہیں ہے پھر ابھی تک بہت سے ایسے موضوع ہیں جن کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی ہے۔

اردو میں اقتصادیات اور تاریخ پر اب تک کتنی کتابیں لکھی گئی ہیں؟ علوم کے سلسلہ میں تو ہمارا خزانہ اب تک تقریباً خالی ہی ہے۔ یہ سائنس کا عہد ہے لیکن اس پر علمی تصانیف کا تو ذکر ہی نہیں، عام مطالعہ کے لائق بھی نصف درجن سے زیادہ کتابیں نہیں ملیں گی اور شاید اسی کمی کو محسوس کرکے حکومت ہند نے دوسرے انعاموں کے ساتھ سائنس کی ایسی کتابوں پر بھی جسے ایک عامی مطالعہ کرسکے انعامات مقرر کئے ہیں۔ اس سلسلہ میں اردو کی دو تصانیف کو بھی اس سال انعام ملا ہے۔

اسی طرح بچوں کا صحت مند اور صحت بخش ادب بھی اچھی رفتار اور اچھے معیار پر شائع نہیں کیا جا رہا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ اس ادب کے لکھنے والوں کے لئے ایک خاص قسم کے تربیت یافتہ دماغ کی ضرورت ہے جو ملک و ملت کی تاریخ، زبان اور بچوں کی نفسیات سے واقف ہو۔ پھر اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ ایسی کتابیں تصویروں اور رنگین نقشوں کے ذریعہ بچوں کے لئے دلکش بنائی جائیں۔ اگر ہم نے آج کے بچوں میں اچھا ادبی ذوق پیدا کردیا تو یہی بچے اردو کے پڑھنے والوں اور لکھنے والوں کی محدود تعداد میں خوشگوار اضافہ کرسکیں گے۔

اس سال کی پاکستانی مطبوعات کی ایک ممتاز خصوصیت یہ بھی ہے کہ اردو میں انگریزی، عربی اور دوسری زبانوں کی اہم ادبی، تاریخی، سوانحی، اقتصادی اور سائنسی کتابوں کے ترجمے بھی شریک ہیں۔

طباعت کے سلسلہ میں یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ دونوں ملکوں کے اردو بولنے والوں نے اردو ٹائپ کو پسند کرنا شروع کردیا ہے اور اسی کا نتیجہ

ہے کہ ٹائپ میں چھپی ہوئی خوبصورت اور دیدہ زیب کتابیں بازار میں آ رہی ہیں. یہ سلسلہ اگر قائم رہا تو مستقبل قریب میں اپنی کتابوں کا معیار بہت زیادہ بڑھاسکیں گے. ٹائپ کے سلسلہ میں لغت نویسی میں جو دقتیں پیش آتی ہیں ان پر اسی اشاعت میں ایک مضمون شائع کیا جا رہا ہے جو غور و فکر اور تجربے کا نتیجہ ہے ہمارے ماہرین سے جو ٹائپ کی طباعت اور لغت نویسی کے سلسلہ میں ہر لفظ کے صحیح ہجے بتانے کی مشکلات سے واقف ہیں اور جو اس سلسلہ میں سونچتے اور کسی عملی نتیجہ پر پہنچتے رہے ہیں، درخواست ہے کہ اس طرف توجہ کریں اور اس موضوع پر اپنے خیالات سے مطلع فرمائیں.

ہمارے ملک میں ابتدائی درجوں کو چھوڑکر ذریعہ تعلیم کا مسئلہ بھی ابھی تک خاطر خواہ طے نہیں ہوا ہے اور سہ لسانی تجویز کے مطابق اردو والوں کے لئے اردو کے ذریعہ تعلیم دینے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں ہے کہ وہ نہ صرف اردو کے ثانوی مدارس خود کھولیں بلکہ جہاں علاقائی زبانیں اعلیٰ تعلیم کے لئے ذریعۂ تعلیم ہیں وہاں اپنے کالجوں کا بھی انتظام کریں. یہ صورت بڑی حد تک نا قابل عمل معلوم ہوتی ہے. اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم کو کم از کم تمام سرکاری کاموں کے لئے علاقائی زبان اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ہندی کی بھی اتنی ہی استعداد جس کے ذریعہ ہم ان زبانوں میں کام کرسکیں، پیدا کرنا ہے. ضرورت ہے کہ ہمارے یہاں کے اردو دوست ماہرین تعلیم بڑی سنجیدگی اور عاقبت بینی سے اس مسئلہ پر ہر زاویۂ نگاہ سے غور کریں کہ اردو کے مقام کو ہندوستان میں باقی رکھتے ہوئے ذریعۂ تعلیم کیا ہو؟ ہم کو جذبات سے ہٹ کر حقائق کی روشنی میں اس مسئلہ کو طے کرنا چاہئے کہ اردو اس طرح داخل نصاب رہے کہ ہر منزل پر طالب علم اس کو کم از کم اختیاری مضمون کی حیثیت سے پڑھ سکے.

دسمبر میں دانشگاہ تہران کے شعبۂ فنون کے صدر اور شعبۂ اشاعت و تمدن کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ذبیح‌اللہ صفا نے اپنی تشریف آوری سے ادارہ کی عزت افزائی فرمائی اور ادارہ کے مقصد اور کام کی نوعیت سے اپنی خوشنودی کا اظہار کرتے ہوئے وعدہ فرمایا تھا کہ وہ کوشش کریں گے کہ دانشگاہ تہران اور ادارے سے علمی رشتہ قائم ہوجائے. اس سلسلہ میں انھوں نے دانشگاہ تہران کی ترسٹھ کتابیں

ادارہ کو مرحمت فرمائی ہیں۔ ہم ان کا اور دانشگاہ تہران کا اس کے لئے شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اور امید کرتے ہیں کہ یہ تعلقات روز بہ روز زیادہ مستحکم اور مفید ہوتے جائیں گے۔

سنہ ۱۹۶۱ع نے جاتے جاتے ہم کو ایک اور چرکا دیا۔ ۳۱ دسمبر کو جب سال کے آخری دن کا آفتاب غروب ہو رہا تھا ہمارے آسمان ادب و اخلاق کا ایک اور درخشاں ستارہ بھی ہمیشہ کے لئے ڈوب گیا۔

ڈاکٹر سید محمد حفیظ نہ صرف یہ کہ ادبی و علمی دنیا کے ایک ممتاز رکن تھے بلکہ انسان کی حیثیت سے بھی ان کا درجہ بلند تھا۔ ابتداء زندگی ہی سے انھیں حصول علم کا شوق تھا۔ وہ اپنے علم سے دوسروں کو بھی سیراب کرنا چاہتے تھے اور اسی لئے انھوں نے درس و تدریس کو اپنا مقصد حیات بنالیا تھا۔ اگرچہ انھوں نے بی۔اے اور ال۔ٹی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہی یہ زندگی شروع کردی تھی۔ لیکن ان کی علمی تشنگی دور نہیں ہوئی وہ مختلف اسکولوں کی ماسٹری اور ہیڈ ماسٹری کرتے ہوئے سنہ ۱۹۱۸ع میں بمبئی آئے۔ انجمن اسلام ہائی اسکول کو بھی یہ فخر حاصل ہے کہ انھوں نے اس اسکول کی ہیڈ ماسٹری کے بھی فرائض انجام دئے۔ اس کے بعد وہ پونہ میں لکچرار ہوئے اور یہاں سے ترقی کرکے الہ‌آباد پہنچے اور وہاں سے یورپ گئے اور پیرس سے ڈی لٹ وغیرہ کی ڈگریاں حاصل کرکے الہ‌آباد یونیورسٹی میں اردو کی خدمت کے لئے واپس آئے۔ بمبئی اور دکن کے قیام اور صوفیاء سے عقیدت نے ان کو صوفیا کی دکنی تصانیف کا گرویدہ کردیا تھا۔ چنانچہ یورپ جانے سے پہلے انھوں نے حضرت برہان‌الدین جانم اور قاضی بحری پر انگریزی میں دو مقالے لکھے اور واپسی پر بحری کے کلیات کو ایڈٹ کرکے شائع کیا۔ وہ اردو ہی کے ایک اچھے انشا پرداز اور محقق نہ تھے بلکہ انگریزی تقریر و تحریر میں بھی ان کو کافی دستگاہ تھی۔ وہ لیڈر الہ‌آباد اور ہندو مدراس کے مستقل لکھنے والے ہی نہ تھے بلکہ ہندو میں اسلامی موضوعات اور زبانوں پر جتنی بھی کتابیں ریویو کے لئے آتی تھیں ان پر تبصرہ وہی کرتے تھے۔ پھر انھوں نے اردو اخبارات و رسائل کے مضامین سے بھی انگریزی خوانوں کو روشناس کیا، انگریزی میں بھی ان کی دو کتابیں گوتم بدھ اور کبیر پر ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی آغوش رحمت میں جگہ عنایت فرمائے۔ آمین

* مہر محمد خاں شہاب

غالب و ذوق کے سہرے

ایک تفصیلی تبصرہ

چار پانچ برس ہوتے ہیں کہ مجھے غالب پر جدید و قدیم لٹریچر کو بہ تفصیل دیکھنے کی ضرورت پیش آئی. چالیس کے قریب تحریریں نظر سے گزر گئیں. نتیجہ میں بہ عنوانہائے مختلف دو ڈھائی سو صفحوں کا کتابچہ وجود میں آگیا. یہ مسودہ ایک فاضل دوست کے مطالعہ میں آچکا تھا. انھوں نے پچھلے دنوں ایک خط میں دریافت فرمایا کہ اس کی اشاعت کی کیا صورت ہے. میرا خیال ہے کہ یہ رسالہ میری اور بہت سی تحریروں کی طرح شاید گوشۂ گمنامی ہی میں پڑا رہے گا. لیکن اس مطلول مضمون کا ایک حاشیہ غالب و ذوق کے سہروں کی بحث پر مشتمل ہے. یہ حاشیہ اصل مسودہ پر بعد میں اضافہ کر دیا گیا تھا. اس کے متعلق دل نے چاہا کہ چلو اور نہیں تو کم سے کم یہ تو پڑھنے پڑھانے والی برادری کے سامنے آہی جانا چاہئے. اس سے کوئی اور فائدہ ہو یا نہ ہو، اپنے پندار کی تو آسودگی ہو ہی جائے گی. اور اگر کسی عزیز دوست نے کسی حیثیت سے بھی اس پر نظر التفات فرمائی تو راقم یقیناً ان کا ممنون ہوگا.

دسمبر ۱۸۵۱ ع میں شہزادہ جواں بخت کی شادی ہوئی. مرزا غالب نے شہزادۂ موصوف کی والدۂ ماجدہ ملکہ زینت محل کے ارشاد پر ذیل کا سہرا لکھا:۔

۱　خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ شہــــزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا

* مولانا مہر محمد خاں صاحب شہاب مالیرکوٹلوی، بمبئی ۳

۲ کیا ہی اس چاند سے چہرے پہ بھلا لگتا ہے
ہے ترے حسنِ دل افروز کا زیور سہرا
۳ سر پر چڑھنا تجھے پھبتا ہے پر اے طرف کلاہ
مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے تیرا نمبر سہرا
۴ ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہوں گے موتی
ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا
۵ سات دریا کے فراہم کئے ہوں گے موتی
تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا
۶ رخ پہ دولہا کے جو گرمی سے پسینہ ٹپکا
ہے رگِ ابر گہر بار سراسر سہرا
۷ یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے
رک گیا آن کے دامن کے برابر سہرا
۸ جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز
چاہئے پھولوں کا بھی ایک مقرر سہرا
۹ جب کہ اپنے میں سمائیں نہ خوشی کے مارے
گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیوں کر سہرا
۱۰ رخِ روشن کی دمک گوہر غلطاں کی چمک
کیوں نہ دکھلائیں فروغِ مہ و اختر سہرا
۱۱ تار ریشم کا نہیں ہے یہ رگِ ابرِ بہار
لائے گا تابِ گرانبارئ گوہر سہرا
۱۲ ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بہتر سہرا

بقول صاحب «آب حیات» مولانا آزاد، بادشاہ ظفر نے سہرے کے مقطع کو نہ صرف اپنے استاد ذوق پر بلکہ اپنی ذات پر چوٹ سمجھا. چنانچہ آب حیات میں ہے کہ:۔

مقطع کو سن حضور کو خیال ہوا کہ اس میں ہم پر چشمک ہے.
گویا کہ اس کے یہ معنی ہوئے اس سہرے کے برابر کوئی سہرا کہنے

والا نہیں ۔ ہم (ظفر) نے جو شیخ ابراہیم ذوق کو استاد اور ملک‌الشعراء بنا دیا ہے ، یہ سخن فہمی سے بعید ہے بلکہ طرفداری ہے ۔ چنانچہ اسی دن استاد مرحوم جو حسبِ معمول حضور میں گئے تو بادشاہ نے وہ (غالب کا) سہرا دیا کہ استاد اسے دیکھئے ۔ انہوں نے پڑھا اور بموجب عادت کے عرض کی ، « پیر و مرشد درست » ۔ بادشاہ نے کہا کہ « تم بھی ایک سہرا کہہ دو » ۔ عرض کی « بہت خوب » پھر فرمایا « ابھی لکھ دو اور ذرا مقطع پر بھی نظر رکھنا » ۔ (آب حیات ص ۸۸ ـ ۴۸۷) مولانا آزاد کا بیان آپ کے سامنے ہے ۔ ذوق تو اظہار خفگی کرتے یا نہ کرتے مگر بادشاہ نے ذوق کو مرزا کے مقابل لا کھڑا کیا ۔ چنانچہ ذوق نے غالب کا سہرا سامنے رکھ کر سہرا لکھا جو حسب ذیل ہے :-

ذوق کا سہــــرا

۱ اے جواں بخت مبارک تجھے سر پر سہرا
آج ہے یمن و سعادت کا ترے سر سہرا

۲ آج وہ دن ہے کہ لائے در انجم سے فلک
کشتیٔ زر میں مہِ نو کی لگا کر سہرا

۳ یہ کہے صلِّ علیٰ وہ کہے سبحان‌اللہ
دیکھے مکھڑے پہ جو تیرے مہ و اختر سہــــرا

۴ تا بنی اور بنے میں رہے اخلاص بہم
گوندھئے سورۂ اخلاص کو پڑھ کر سہرا

۵ دھوم ہے گلشنِ آفاق میں اس سہرے کی
گائیں مرغانِ نواسنج نہ کیوں کر سہــــرا

۶ روئے فرخ پہ جو ہیں تیرے برستے انوار
تار بارش سے بنــــا ایک سراسر سہرا

۷ تابش حسن سے مانندِ شعاعِ خورشید
رخِ پر نور پہ ہے تیرے منور سہرا

۸ ایک کو ایک پہ تزئیں ہے دمِ آرائش
سر پہ دستار ہے دستار کے اوپر سہرا
۹ اک گہر بھی نہیں صدکانِ گہر میں چھوڑا
تیرا بنوایا ہے لے لے کے جو گوہر سہرا
۱۰ پھرتی خوشبو سے ہے اتراتی ہوئی بادِ بہـــار
اللہ اللہ رے پھولوں کا معطر سہـــرا
۱۱ سر پہ طرہ ہے مزین تو گلے میں بدھی
کنگنا ہاتھ میں زیبا ہے تو منھ پر سہرا
۱۲ رونمائی میں تجھے دے مہ و خورشید فلک
کھول دے رخ کو جو تو منھ سے اٹھاکر سہرا
۱۳ کثرتِ تار نظر سے ہے تمـاشائیوں کے
دمِ نظـارہ ترے روئے نکو پر سہـــرا
۱۴ دُرِ خوش آبِ مضامیں سے بنـــاکر لایا
واسطے تیرے ترا ذوقِ ثنـــاگر سہرا
۱۵ جس کو دعویٰ ہے سخن کا یہ سنادے اس کو
دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہـــرا

مرزا نے یہ ڈھنگ دیکھ‌کر معذرت پیش کی. اسے معذرت ہی سمجھا گیا لیکن ادا شناس جانتے ہیں کہ اس معذرت میں مرزا نے اپنی برتری کا اعلان کیا ہے. اس وقت گفتگو کا یہ پہلو ہمارے پیش نظر نہیں. دیکھنا یہ ہے کہ دونوں سہروں نے مختلف طبیعتوں پر کیا اثر کیـا. اس سے معلوم ہوگا کہ انسانی طبیعتوں کا یہی تضاد ہے جو گلشن عالم کی رنگا رنگی کا موجب اور عالمِ ایجاد و اختراع کا میدان رستاخیز بنا ہوا ہے.

اثناء مطالعہ میں عصر حاضر کے دو اہل علم و فضل و کمال کی رائیں ان سہروں کے متعلق سامنے آئیں. ان فاضلوں میں سے ایک مشہور محقق شیخ محمد اکرام صاحب ہیں. انھوں نے سہروں کی بحث میں فرمایا کہ «مرزا کا سہرا ذوق کے سہرے سے بہتر تھا.» اس پر میرے ایک فاضل عزیز و محترم نے نجی طور

پر مجھے لکھا کہ:۔

« یقیناً ذوق کا سہرا مرزا کے سہرے سے بہتر ہے، کیونکہ بعد میں اور اسے سامنے رکھ کر لکھا گیا ہے۔ »

یہ مانی ہوئی بات ہے کہ ہر چیز کے حسن و قبح کا فیصلہ اس چیز کو دیکھنے اور جانچنے والوں کے مذاق و نظر پر موقوف ہے، اور یہی حال ان سہروں کے حسن و قبح پر اظہار رائے کا ہے۔ دو فاضلوں کی رائے ہمارے سامنے ہے۔ تا ہم کیا حرج ہے اگر ہم بھی ان سہروں کے اشعار و مضامین پر ایک نگاہ ڈال لیں۔

واقعہ تو یہی ہے کہ غالب نے سہرا پہلے کہا، اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ بقاعدۂ الفضل للمتقدم۔ غالب ہی کا سہرا افضل ہے، اور یہی شیخ محمد اکرام کا خیال معلوم ہوتا ہے۔ ادھر ایک دوسرے مسلمہ اہل علم و فضل و نظر ہیں جنھوں نے غالباً « نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول » کے مقولے کے پیش نظر ذوق کے سہرے کو غالب کے سہرے سے بہتر ٹھہرایا ہے۔ اگر چہ اس خیال پر کہا جاسکتا ہے کہ اگر نقاش اول، جو غالب ہے، دوسرا سہرا کہتا تو وہ سہرا نقاش اول غالب کے سہرے کا نقش ثانی ہوتا۔ لیکن یہاں شاید ذوق کے سہرے کو غالب کے سہرے کے بعد کہا جانے کی وجہ سے پہلے سہرے کا نقش ثانی خیال کرلیا گیا ہو۔ ظاہر ہے کہ ذوق کا سہرا نقاش اول غالب کے سہرے کا نقش ثانی نہیں کہلا سکتا۔ یہ بالکل حق ہے کہ ذوق کا سہرا غالب کے سہرے کو سامنے رکھ کر لکھا گیا ہے۔ اور یہ قیاس بھی درست ہے کہ ابتدائی نمونے میں جو کمی رہ گئی ہو، ذہین نقال اپنی نقل کو ان کمیوں سے پاک و صاف کرلیا کرتا ہے۔

ان سب خیال آرائیوں سے قطع نظر جب دونوں سہرے ہمارے سامنے ہیں، تو کیا مناسب یہی نہ ہوگا کہ ایک ایک کرکے دونوں سہرے کے شعروں پر ایک نظر ڈالی جائے کہ خود ہمیں کیا رنگ دکھائی دیتا ہے۔

آپ نے دیکھا کہ غالب کے سہرے میں بارہ شعر ہیں اور ذوق کے سہرے میں پندرہ شعر۔ اگر ذوق کے سہرے کو بعد میں لکھا جانے کی وجہ سے غالب کے سہرے سے اچھا کہا جاسکتا ہے تو اس کے اشعار کی زیادتی بھی اس کے لئے ایک اور سبب فضیلت ہوسکتی ہے۔ لیکن اگر ندرت بیان برعایت حقیقت

پسندی کوئی چیز ہے تو سرسری نظر سے معلوم ہوگا کہ غالب کے بارہ شعر بارہ مضمون یا بارہ دلکش خیال ہیں، اور اس کے بالمقابل ذوق کے پندرہ شعری سہرے کی یہ حالت نہیں۔ مثلاً ذوق نے اپنے سہرے کے اشعار ۶، ۷، ۱۳ میں جو ذیل میں درج ہیں، بس الفاظ کے ادل بدل سے ایک ہی خیال دہرایا ہے۔ اور اس خیال میں بھی نہ حقیقت کا شائبہ ہے نہ پیرایۂ بیان میں کوئی خاص دلکشی اور بانکپن۔ ملاحظہ ہو :-

۶ روئے فرخ پہ جو ہیں تیرے برستے انوار
تارِ بارش سے بنا ایک سراسر سہرا

۷ تابشِ حسن سے مانندِ شعاعِ خورشید
رخِ پر نور پہ ہے تیرے منور سہرا

۱۳ کثرتِ تارِ نظر سے ہے تماشائیوں کے
دمِ نظارہ تیرے روئے نکو پر سہرا

یعنی تارِ بارش انوار کا سہرا، تابشِ شعاعِ خورشید کا سہرا، تارِ نظر کا سہرا خیال ایک ہے، لفظ تین طرح کے ہیں اور بات کچھ بھی نہیں۔

اور طرفہ یہ ہے کہ تماشائیوں کو بجز اصل سہرے کے جو واقعی جواں بخت کے چہرے پر بندھا ہوا تھا۔ ذوق کے بنائے ہوئے نورانی سہروں میں سے ایک بھی نظر نہیں آتا تھا۔ نہ ان شعروں میں کوئی ایسا اشارہ کیا گیا ہے جس سے ان حقائق نورانی کی طرف ذہن کے منتقل ہونے کی کوئی وجہ پیدا ہو۔ ہاں شعر نمبر ۱۳ کے مصرعۂ اول کو ملاحظہ کیجئے، اور اس میں لفظ «تماشائیوں» کو دیکھئے، پورا پڑھا جانے کی بجائے «تماشایوں» یا «تماشاؤں» پڑھا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ خود میرے ہی پڑھنے کی غلطی ہو ورنہ ذوق کی طرف ایسی لفظی غلطی منسوب کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ اب غالب کے سہرے کا مطلع لیجئے :

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ شہزادے جواں بخت کے سر پر سہرا

غالب جواں بخت کے نام کے لفظوں سے فائدہ اٹھاکر خود بخت یا بختاوری اور خوش نصیبی سے خطاب کرتے ہیں کہ اے بخت تو خوش ہو کہ آج ترے سر سہرا ہے۔ یعنی تو بڑا خوش بخت اور کامیاب ہے اس لئے کہ تجھ کو

شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا باندھنے کا مبارک موقع ملا ہے اس لئے اٹھ اور جواں بخت کے سر پر سہرا باندھ. دیکھ تو حرف بخت ہے تجھی کو خوش ہوکر جواں بخت کے سر پر سہرا باندھنا چاہئے کیونکہ بخت کی فائزالمرامی جواں بختی ہی میں نمایاں ہوا کرتی ہے. مطلع سے ظاہر ہے کہ گویا غالب نے اپنے سہرے کے لئے قصیدے کی تشبیب کا انداز اختیار کیا ہے. اور ذوق چھٹتے ہی جواں بخت سے مخاطب ہوجاتے ہیں جو آداب فن کی پابندی کے خلاف ہے. دیکھئے ذوق کا مطلع ہے:

اے جواں بخت مبارک تجھے سر پر سہرا
آج ہے یمن و سعادت کا ترے سر سہرا

ذوق شادی کے سہرے کو یمن و سعادت کا سہرا مان کر شہزادہ جواں بخت کو مبارکباد دیتے ہیں گویا آپ کی یہ شادی آپ کی سعادت مندی کا نتیجہ ہے، اور اس کی علامت یہ سہرا ہے. مطلع برا نہیں. صاف سیدھی بات ہے، نثر میں کہی جاتی تو یوں بھی کہی جاتی. اس میں اور تو جو کچھ ہے وہ سامنے ہے، لیکن شعریت کہاں ہے؟ اس کا پتہ نہیں چلتا. حالانکہ اچھے شعر کی نفسیاتی اور حسیاتی تاثیر یہ ہونی چاہئے، اور ہوتی ہے، کہ اس کے پڑھتے اور سنتے ہی انسان چونک پڑے، اور اس کے دل و دماغ کے ریشہ ریشہ اور ذرہ ذرہ میں اہتزاز پیدا ہوجائے.

غالب کا دوسرا شعر ہے:-

کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے
ہے ترے حسنِ دل افروز کا زیور سہرا

ذوق کا دوسرا شعر ہے:-

آج وہ دن ہے کہ لائے دُرِّ انجم سے فلک
کشتی زر میں مہِ نو کی لگا کر سہرا

غالب سہرا لکھ رہے ہیں اور سہرے کی موجودہ حقیقتِ واقعی کا اظہار کر رہے ہیں. اور جواں سال جواں بخت کے تر و تازہ جوان چہرہ مہرے کی قدرتی حسن و زیبائی کے اقرار و اظہار کے بعد کہتے ہیں کہ یہ سہرا جو تیرے سر پر بندھا ہے، تیرے اس حسنِ دل افروز کے لئے ایک زیور ہے.

کیونکہ کہا گیا ہے۔ ع یار زیبا بہ زیب زیبا تر۔ بیان واقعہ میں کوئی مبالغہ نہیں۔ اور شاعرانہ حسنِ بیان صاف ظاہر ہے۔

ذوق کی نظر میں جواں بخت کا موجودہ سہرا اپنے اندر کوئی دلکشی اور جاذبیت نہیں رکھتا۔ گویا کہ ابھی سہرا باندھے جانے یا سہروں کے ادل بدل اور انتخاب کا موقع باقی ہے اس لئے کہتے ہیں کہ یہ «دن» تو ایسا ہے کہ دن میں تارے آتے، اور آفتاب غائب ہوجاتا، اور فلک اپنی بلندیوں سے پہلی رات کے ہلال کی کشتی بنا کر جو کسی کو دکھائی دیتا اور اکثروں کو مطلق دکھائی نہیں دیتا، اس میں آسمان کے تارے توڑ کر، ایسی نازک سی ہلالی کشتی میں سجاکر سہرا لاتا۔ موجودہ پر قناعت نہیں کیونکہ اس میں جاذبیت نہیں، دلکشی نہیں، تجویز ایسی پیش کی گئی ہے کہ شادی ملتوی کردی جائے، بھری مجلس اٹھ جائے۔ براتی اپنے اپنے گھر چلے جائیں، پھر جب کبھی ذوق کی تجویز پر عمل ہوجائے اور جب شاعرانہ نازک خیالی کا مصداق ایسا سہرا آجائے تو پھر نئے سرے سے شادی کا اہتمام کیا جائے۔ سوچئے اس شعر میں کونسا حسن ہے، مبالغہ ضرور ہے۔ اور مبالغہ بھی محض مبالغہ جس میں کوئی بات ایسی نہیں کہ سن کر انسان متوجہ ہوجائے۔

ذوق کا تیسرا شعر:

یہ کہے صل علیٰ وہ کہے سبحان اللہ   دیکھے مکھڑے پہ جو تیرے مہ و اختر سہرا

اس شعر کے مصرع ثانی میں البتہ جواں بخت کے موجودہ سہرے کو پسند کرکے ماہ سے صل علیٰ اور اختر سے سبحان اللہ کہلانے کا خیال ظاہر کیا گیا ہے۔ یہ شعر بھی دوسرے شعر ہی کی مد میں آجاتا ہے کہ اگر مہ و اختر آئیں اور شہزادہ جواں بخت کی جشن عروسی کا نظارہ کریں اور صدر مجلس میں دولھا اور اس کے چہرے کو دیکھیں تو ان میں سے ایک صل علیٰ کہے اور دوسرا سبحان اللہ۔ یہ بھی ذوق کا محض حسن ظن ہے کہ آسمان سے چاند اور تارے زمین پر آجائیں اور شہزادہ جواں بخت کی مجلس عروسی کا نظارہ کریں تو وہ بے اختیار صل علیٰ اور سبحان اللہ کا ورد کرنے لگیں گے۔ ہمارے نزدیک مہ و انجم کی مجلس عروسی میں عدم موجودگی اس کارو بار وظیفہ خوانی سے عدم دلچسپی کے اظہار کے لئے کافی ہے۔

پھر اس سوال کا جواب کیا ہوگا کہ مہ و انجم ہی صل علیٰ کیوں کہیں. کیا صرف اسی لئے کہ تاروں کو موتیوں سے تشبیہ دی گئی ہے. انسان کیوں نہ ہیں. فرشتے کیوں نہ کہیں. حالانکہ حسن و دلکشی کا معجزہ یہ ہوتا کہ انسان داد دیتے. داد دینے کے لئے مہ و اختر کو کیوں چنا گیا. پھر کیا ان بے زبانوں کا اجتماع ممکن بھی ہے؟ پھر مـــہ و اختر جو دو اسم ہیں اور ان کو جمع کی صورت میں لاکر « ہیں » آنا چاہئے تھا نہ کہ « ہے ». صیغہ جمع کے لئے واحد لانا کچھ عجیب سی بات ہے.

ذوق کا چوتھا شعر ہے:

تا بنی اور بنے میں رہے اخلاص بہم   گوندھئے سورۂ اخلاص کو پڑھ کر سہرا

اس شعر میں ذوق نے دلی کی کسی پرانی رسم کا ذکر کیا ہے. کہ اگر سورۂ اخلاص پڑھ کر سہرا گوندھا جائے تو بنی اور بنے میں بنی رہتی ہے. یہاں معمولی درجہ کے لفظی تناسبات سے کام لیا گیا ہے کہ بنی (دلہن) اور بنے (دولھا) میں بنی (اتفاق) رہے. اس مقصد کے حصول کے لئے سورۂ اخلاص پڑھ کر سہرا گوندھنا چاہئے. اس مناسبت لفظی میں پیرایۂ بیان یا شاعرانہ تخیل کی کوئی ندرت نہیں. اتنا ضرور کیا ہے کہ ذوق نے قرآن حکیم کی ایک سو بارہویں سورت کو پڑھ کر سہرا گوندھنے کی تجویز پیش کی ہے. حالانکہ اس سورت میں مجرد توحید الٰہی کو ہر قسم کے ذاتی و صفاتی شرک سے بے لاگ اور لگی لپٹی رکھے بغیر بیان کیا گیا ہے. اور اسی سورت میں « لَمْ یَلِدْ » اور « وَلَمْ یُولَدْ » بتایا گیا ہے. اور دوسری جگہ اس کے « صاحبہ » (بیوی) اختیار کرنے سے انکار کیا گیا ہے. ازدواج اور ازواج کا مسئلہ مخلوق سے مختص ہے، اور خالق کی صفت تجرید ہے، توحید ہے، صمدیت ہے، بے مثالی ہے، سمجھ میں آنا آسان نہیں کہ مرد و عورت کے ازدواج کے وقت سورۂ اخلاص کی تلاوت کرنا کیسے موزوں اور مناسب ہوسکتا ہے. جب کہ یہ بھی مسلمات مین سے ہے کہ دعاؤں میں ذات باری کی ان صفات کا زبان پر اور ذہن میں لانا عین حکمت ہوتا ہے، جو انسانی مقصد برآری کے لئے کلید کا درجہ رکھا کرتی ہیں. جیسے اے کریم کرم فرما، اے رحیم رحم کر، یوں نہیں کہا جائے گا کہ او قہار رحم کر، او جبار بخش دے. وقس علیٰ ھذا.

ذوق کا پانچواں شعر ہے:

دھوم ہے گلشن آفاق میں اس سہرے کی
گائیں مرغانِ نوا سنج نہ کیونکر سہرا

کہا گیا ہے کہ چونکہ گلشن آفاق یعنی دنیا میں اس سہرے یعنی ذوق کے سہرے کی دھوم ہے تو پھر کیسے ممکن ہے کہ مرغانِ نوا سنج سہرا نہ گائیں. ظاہر ہے کہ باغ و راغ میں پرندوں کا چہچہانا، ان کا ہر روز کا وظیفہ اور صبح و شام کا معمول ہے. ان کے اسی چہچہانے کو ان کا «سہرا گانا» قرار دینا محض ایک بے کیف فرضی بات ہے. اگر مان لیا جائے کہ چڑیاں سہرا گا رہی ہیں. تو معلوم نہ ہوا کہ چڑیاں جو سہرا گا رہی ہیں وہ گایا جانے والا سہرا خود چڑیوں کا تصنیف کیا ہوا تھا یا ذوق کا مصنفہ سہرا تھا. جسے طوطے اور مینا تو دہراسکتے ہیں. لیکن باقی مرغانِ چمن سے یہ بھی نہیں ہوسکتا. آخری بات ہو نہیں سکتی کیونکہ ذوق کا سہرا تو ابھی ان کی جیب ہی میں تھا. تو پھر یہ سہرا کس نے مرغانِ چمن کو رٹوا دیا.

شعر کا مفہوم ایک شاعرانہ تعبیر کہلاسکتی ہے. مگر پیرایۂ بیان اس کی اجازت نہیں دیتا.

ذوق کا شعر نمبر آٹھ:

ایک کو ایک پہ تزئیں ہے دم آرائش سر پہ دستار ہے دستار کے اوپر سہرا

یہاں بھی لفظی بازی گری ہے. پہلے مصرع میں «پہ» اور دوسرے مصرع میں «پہ» یہ دونوں «پہ» مل کر اس شعر کا قافیہ بن کر «اوپر» بن گئے ہیں. تاہم اس شعر کا پہلا مصرع خاصا اچھا تھا لیکن اس شعر کے دوسرے مصرع کے لفظوں کی ترتیب نے. ع سر پہ دستار ہے، دستار کے اوپر سہرا. پہلے مصرع کی جزوی خوبی کو بے روپ کردیا. ذوق صرف دستار اور سہرے کی آرائش و تزئین میں الجھے ہوئے ہیں. ان کو جواں بخت یا نوشاہ کی دلکش شخصیت اور اس کے کالے ڈھلے اور سر و سینہ میں رعنائی و دلکشی دکھائی نہیں دیتی. پھر نظر ڈالئے کیا یہ شعر غالب کے سہرے کے دوسرے شعر کے مقابلہ میں رکھا جاسکتا ہے.

ذوق کا شعر نمبر ۹:

اک گہر بھی نہیں صد کان گہر میں چھوڑا
تیرا بنوایا ہے لے لے کے جو گوہر سہرا

دونوں مصرعوں میں جو بات کہی گئی ہے وہ محض غلط، محض مبالغہ، اور بغیر کسی شاعرانہ نازک خیالی اور بانکپن کے ہے. اس میں « کان گہر » یا صد کان گہر کی ترکیب اور دوسرے مصرع میں « لے لے کے » جیسے ٹکڑوں کی بھرتی نے شعر میں لفظاً و معناً جو نقص پیدا کردیا، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں اور دوسرے مصرع میں یہ کہنا کہ یہ سہرا گہر لے لے کے بنوایا ہے، سہرا بنوانے والے کی مجبوری و بیچارگی کی طرف اشارہ کرتا ہے. یہاں یہ بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا وہ سہرا جو جواں بخت کے چہرے پر آویزاں تھا، وہ حسب تصریح ذوق جواں بخت کا ایک ایک گوہر لے کے بنوایا ہوا تھا، یا ان کے والد ماجد ظفر کا بنوایا ہوا تھا. اگر یہ بات ہے تو اس آخری مصرع کے انتخاب الفاظ سے ظفر کی پنشن خوارگی اور بیچارگی ظاہر کرنا مد نظر معلوم ہوتا ہے. ایک بات اور، جہاں تک ہماری محدود معلومات ہیں سہرا پھولوں کا ہوتا ہے یا موتیوں کا، پھول ہوں یا موتی ان کا « کان گہر » سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا پھر معلوم نہیں دریائی موتیوں کے لئے « صد کان گہر » میں کیوں جھاڑو پھیر دی گئی، کہ ہیرے کی پوری ایکسو کانوں میں ٹوٹا پھوٹا، داغی، رگ دار، اچھا برا ایک بھی ہیرا نام کا یا ہیرا نما سنگ ریزہ باقی نہیں چھوڑا. اور جو بھی کنکر پتھر ملا اسی کو اندھا دھند پروتے چلے گئے. پھر شعر میں کوئی اشارہ نہیں جس سے خیال پیدا ہو کہ ان ہیروں کو پسند کرنے میں جوہریوں کی جوہر شناسانہ نگاہ سے کام لیا گیا ہو یا اور فنکاروں کی نظرِ انتخاب کا سایہ بھی ان پر پڑا ہو. اس کے مقابلے میں غالب کے سہرے کے پانچویں شعر کو رکھئے اور خود فیصلہ کیجئے.

ذوق کے سہرے کا دسواں شعر یہ ہے:

پھرتی خوشبو سے ہے اتراتی ہوئی باد بہار اللہ اللہ رے پھولوں کا معطر سہرا

پورا شعر خاصہ ہے مصرعہ ثانی سیدھا سادا، قدرتی اظہار خیال ہے. لیکن باد بہار کے چلنے کو اترانا بتانا تعریف نہیں اس کی منقصت ہے. اور دوسرے مصرعہ میں اللہ کا استعمال اظہار حیرت کے لئے ضرور ہے مگر تعریف کا پہلو لئے ہوئے ہے. اس لئے بے جوڑ سی بات ہوگئی. اگر باد بہار کی عطر بیزی اور سر خوشی کو

اتراتے پھرنے سے تعبیر کیا جائے گا تو یہ بھی درست نہ ہوگا. اس لئے کہ «اترانا» ایک صفت سفلگی ہے اور باد بہار کی سرخوشی اور اس کے جھونکے قدرتی اور بے اختیارانہ ہوتے ہیں، ان میں اترانے کا دخل نام کو بھی نہیں ہوتا، اس لئے بادِ بہار کے جھونکوں کو اتراتے پھرنا کہنا خصوصاً دوسرے مصرع کی موجودگی میں متوازن پیرایۂ بیان نہیں کہا جائے گا. اگر بادِ بہاری اتراتی پھرتی ہے تو اس کی معجز نمائی غت ربود ہوکر الٹا اس کا چھچھورا پن نمایاں ہوجائےگا، کہ فرض منصبی ادا کرنے پر اترانے کی بھیانک غلطی کر رہی ہے. حالانکہ بادِ بہار کے جھونکوں میں مظاہر قدرت کی رعنائی تو ہوتی ہے، چھچھورا پن ابداً نہیں ہوتا. اگر کوئی ایسا خیال کرے تو یہ خود اس کی ذہنیت کا اوچھا اظہار ہوگا.

اس شعر کو پڑھ کر ایک اور سوال سامنے آگیا. جواں بخت کی شادی دسمبر میں ہوئی تھی. پھول تو بے موسم بھی مل سکتے ہیں، اور ماحول کو اپنی خوشبو سے معطر کرسکتے ہیں. لیکن بادِ بہار ہر موسم کی ہوا کو نہیں کہا جا سکتا. جیسے خانۂ کعبہ کا عمرہ مع تمام مناسک کے سال کے کسی دن اور کسی بھی موسم میں ہوسکتا ہے، مگر «حج» ذی‌الحجہ کی مقررہ تاریخ ہی میں مناسک حج ادا کرنے کو کہتے ہیں. اور یہ موقع سال میں صرف ایک ہی بار آتا ہے. یوں بھی اگر گلشن میں بادِ بہاری کا عمل دخل ہو بھی تو یہ موسم بہار کا اثر ہے، کہ تمام ماحول میں خوشبو رچی اور بسی ہوئی ہے، اور معطر سہرا اس کا مظہر ہے. نہ کہ سوا گز کے سہرے کی معجز نمائی.[١]

ذوق کا گیارہواں شعر ہے:

١۔ غالب نے تو جوان بخت کے سہرے کی لمبائی گز بھر ہی بتائی ہے مگر میں نے بڑی احتیاط سے سہرے کی لمبائی سوا گز کی بتائی ہے. کیونکہ بعد میں کہے جانے والے سہرے کا مبالغہ پیش نظر ہے. ورنہ جہاں تک میں جانتا ہوں شمالی ہند میں خوفناک حد تک لمبے سہرے نہیں ہوتے. جیسے کہ ماشاءاللہ ہمارے بمبئی میں غبارہ نما سہرے ہوتے ہیں کہ سر سے پیروں تک پھولوں کا ایک غلاف دولہا پر چڑھا دیا جاتا ہے جو تنفس میں بھی رکاوٹ بن جاتا ہے. عموماً اسی لئے چلنے میں دولہا کو سہارا دیا جاتا ہے اور اس کے چہرے کے سامنے چلنے میں پنکھے جھلے جاتے ہیں. اگر احتیاط سے کام نہ لیا جائے تو تنفس کے رک جانے سے دولہا پر نیم بیہوشی کی سی حالت بھی طاری ہوسکتی ہے اور بعض وقت ہو بھی جاتی ہے. شہاب

سر پہ طرّہ ہے مزین تو گلے میں بدھی
کنگنا ہاتھ میں زیبا ہے تو منہ پر سہرا

کیا حسن ترکیب ہے۔ « سر پر طرّہ » « منھ پر سہرا » « گلے میں بدھی » « ہاتھ میں کنگنا » ان چاروں ٹکڑوں میں « زیبا » اور « مزین » کے لفظوں کو ملاکر چاروں ٹکڑوں کو جوڑکر شعر تیار ہوگیا۔ اس شعر میں فارسی کے مشہور ضرب المثل شعر سے کسی قدر زیادہ شعریت ضرور ہے، جس میں کہا گیا ہے :۔

دندانِ تو جملہ در دہانند　　　چشمانِ تو زیرِ ابروانند

ذوق کے سہرے کا بارہواں شعر یہ ہے :

رونمائی میں تجھے دے مہ و خورشید فلک
کھول دے رخ کو جو تو منہ سے اٹھاکر سہرا

شاعرانہ خیال اتنا سا تھا کہ اگر جواں بخت اپنے رخ سے سہرا ہٹادے تو فلک رونمائی کے طور پر مہ و خورشید کا نذرانہ پیش کرے۔ مگر شاعرانہ مبالغہ ہے اور اس خیال پر شاعر کی خوردہ گیری نہیں ہوسکتی۔ لیکن دوسرے مصرعہ کو دیکھئے۔ کہ اس میں سہرا « منہ » سے اٹھواکر « رخ » کھلوایا گیا ہے، اگر استاد شاہ منہ کو کھلواکر سہرے کو رخ سے اٹھواتے تو کون منہ کھول سکتا تھا۔ لیکن عجیب بات ہے کہ گویا صرف منہ ہی سہرے کی وجہ سے ڈھکا ہوا تھا۔ جبھی تو کہا گیا ہے کہ سہرا منہ سے اٹھادو۔ اگر یہی بات ہے تو رخ کو کھول دینا بھرتی ہے۔ پھر کیا مہ و خورشید اکٹھے ہوسکتے ہیں کہ رونمائی کے طور پر دئے جاسکیں۔ ماہ ہے تو مہر غائب۔ مہر ہے تو ماہ کا پتہ نہیں۔ قرض دوام کی ادائیگی میں تو قسطیں ہوتی ہیں۔ لیکن دولہا دلہن کی رونمائی میں ادھار کا معاملہ، وہ بھی فلک کی طرف سے۔ اونچی دکان پھیکا پکوان کا مصداق معلوم ہوتا ہے۔

ذوق کا شعر نمبر ۱۴ جو مقطع بھی ہے :

درِ خوش آبِ مضامین سے بناکر لایا
واسطے تیرے ترا ذوقِ ثناگر سہرا

« ذوقِ ثناگر » کی « صنعت گری »، « درِ خوش آبِ مضامین » کے ایسی ترکیبوں

اور مذکورہ بالا اشعار کے مطالعہ سے ظاہر و باہر ہے۔ مزید گفتگو کی مطاق ضرورت نہیں۔

ذوق کا شعر نمبر ۱۵، جو مقطع کے بعد کہا گیا ہے:

جس کو دعویٰ ہے سخن کا یہ سنادے اس کو
دیکھ! اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہــــرا

ظاہر ہے کہ ذوق کا سہرا غالب کے سہرے کو سامنے رکھ کر لکھا گیا تھا، اور ہمیں مولانا محمد حسین آزاد مرحوم کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوچکا ہے کہ ذوق کے مربی بہادر شاہ ظفر نے خود فرمائش کرکے اپنے مربوب ذوق سے یہ سہرا لکھوایا تھا۔ اس لئے مقطع میں ذوق کا ظفر سے کہنا «یہ سنادے اس کو» کسی طرح موزوں اور مناسب طریق خطاب نہیں۔ بلکہ عامیانہ بلکہ گنوارو لہجہ ہے۔ غالب کا جواب کہا گیا ہے، ظفر کی فرمائش پر کہا گیا ہے۔ اس شعر میں ان دونوں سے گویا یوں خطاب ہے کہ «ارے او ظفر! تو اس غالب کو سنادے کہ «سن نہیں»، «دیکھ»، ہم جو سخنور ہیں یوں سہرا کہا کرتے ہیں۔»لطیفہ یہ ہے کہ قلعہ کے مشاعروں میں ذوق ظفر کا کلام سنایا کرتے تھے، اب ذوق ظفر سے کہتے ہیں کہ تو میرا جوابی سہرا غالب کو سنادے کہ «دیکھ» سہرا ایسا ہوتا ہے۔ یہ طریق گفتگو اپنے مربی اور معاصروں سے مشرقی درباری آداب کا مظہر نہیں۔ ذوق کے سہرے کا یہ حال غالب کے سہرے کے بعد اور اس کا سہــــرا دیکھ کر کہنے پر ہے۔ اس کے مقابلہ میں غالب کا مقطع خطاب عام اور پیرایۂ بیان غیر جانبدارانہ اور بقول غالب محض ایک سخن گسترانہ بات ہے۔

اب آئیے اسی طرح غالب کے سہرے کا بھی شعر بہ شعر مطالعہ کرتے چلیں۔
«غـالب کے پہلے دو شعروں پر اوپر گفتگو ہوچکی ہے۔ اب تیسرا شعر ملاحظہ کیجئے۔

سر پر چڑھنا تجھے پھبتا ہے پرائے طرف کلاہ
مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا نمبر سہرا

پہلے مصرع میں سر پہ چڑھنا جس انداز سے آیا ہے اس سے «طرف کلاہ» کی دلکشی ظاہر ہے۔ اسی کو تسلیم کرکے کہا گیا ہے۔ اے طرف کلاہ سر پہ

چڑھنا تجھے پھبتا ہے۔ لیکن یہاں طرف کلاہ اور سہرے میں مقابلہ ہے، کہ دیکھیں دونوں میں سے کون زیادہ دلکش اور جاذب نظر ہے، طرفِ کلاہ یا سہرا۔ غالب کو ڈر ہے کہ آج دلکشی کی بازی سہرے کے سر رہے گی، ورنہ طرف کلاہ کا محبوب و مقبول ہونا تو ایک مسلمـــہ حقیقت ہے۔ طرف کلاہ کی سج دھج روز کی چیز ہے، اور سہرے کا حسن صرف عارضی، رونقِ یک روزہ۔ غالب کہتے ہیں کہ اے طرف کلاہ مجھے ڈر ہے کہ سہرے کی یہ عارضی دلربائی تیری مستقل خوبی اور دلکشی سے نمبر یعنی بازی نہ لے جائے۔ یہاں یہ بھی ملحوظ رہے کہ سر چڑھنا کے دو لفظوں سے دو فائدہ اٹھائے گئے ہیں، ایک واقعہ ہے ایک حسن تعبیر۔

غالب کا شعر نمبر ۴ :

ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہوں گے موتی
ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا

ذوق اپنے شعر نہم کی تصنیف کے لئے اپنے منظوم سہرے کے لئے «صد کانِ گہر» سے ہیرے لاتے ہیں. حالانکہ سہرا ہماری معلومات ناقص کی حد تک «صدفی جواہر» یعنی موتیوں سے بنا کرتا ہے، نہ کہ پہاڑ یا زمین کی کانوں سے نکلنے والے سنگ پاروں یا الماس ریزوں سے۔ غالب اپنے اسی چوتھے شعر میں بیان کرتے ہیں کہ سہرا جو کشتی میں لگا کر لایا گیا ہے، شاید اس سہرے میں ناؤ بھر کر ہی موتی پروئے گئے ہوں گے، اگر ایسا نہ ہوتا تو کشتی میں لگا کر نہ لاتے. یہاں شاعر نے «ناؤ» اور «کشتی» کے دو لفظوں سے تجاہل عارفانہ کے طور پر فائدہ اٹھایا ہے. کیونکہ ناؤ اور کشتی ہم معنی لفظ بھی ہیں اور ناؤ کے معنی صرف کشتی ہی کے ہیں، اور کشتی ذو معنی ہے۔ ایک معنی اس کے ناؤ ہی کے ہیں اور دوسرے معنی تھال کے ہیں. شاعر آخری معنی سے دانستہ تجاہل کرتا ہے، اور ناؤ اور کشتی کے دو لفظ بھولے پن سے ایک لطیفہ کے طور پر لاکر آگے بڑھ جاتا ہے۔ جیسا کے میں نے عرض کیا یہ شعر بس ایک لطیفـہ سے زیادہ کچھ نہیں۔

غالب کا شعر نمبر پانچ :

سات دریا سے فراہم کئے ہوں گے موتی تب بنـا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا

اس شعر میں غالب نے « سات دریا » سے موتیوں کے فراہم کرنے کا امکان ظاہر کیا ہے ، کیونکہ جس انداز کا منتخب موتیوں کا اعلا درجہ کا سہرا بنا ہے ، ویسا سہرا ایک دریا کے موتیوں سے بننا ممکن نہیں ہوسکتا. یہاں « دریا » سمندر کے معنی میں آیا ہے. اور فارسی اور گجراتی میں سمندر کو دریا ہی کہتے ہیں. ہم اپنی ہندوستانی زبان اردو میں دریا ندی کے معنی میں استعمال کرتے ہیں. ظاہر ہے کہ موتی ندی سے نہیں فارسی اور گجراتی کے دریا اور ہماری بولی کے سمندر سے نکلتے ہیں. « سات دریا » بمعنی سات سمندروں سے موتیوں کا فراہم کرنا مبالغہ ہے مگر امکانی بھی، اور یہ بات ایسے طریقے سے کہی گئی ہے جو شاعر کی حیرت کی مظہر تو ہے کسی قسم کے تیقن کی مظہر نہیں. اس لئے حقیقت جو بھی ہو ، فہم انسانی کے قریب ہے. غالب نے اپنے اسی شعر میں بتایا ہے کہ جس انداز کا یہ لا جواب سہرا ہے اس انداز کا سہرا بنانے کے لئے سات سمندروں سے قسما قسم کے موتی لائے گئے ہوں گے ، اور پھر ان بے شمار موتیوں میں سے بہترین موتی انتخاب کئے گئے ہوں گے ، تب کہیں جاکر اس انداز کا لا جواب اور بے مثال سہرا بنا ہوگا. دوسرے مصرعہ میں « اس انداز کا گز بھر سہرا » کہہ کر ظاہر کیا گیا ہے کہ یونہی اٹھا اٹھا کر اندھا دھند موتی دھاگوں میں دیساوری مال کی طرح نہیں پروئے گئے بلکہ اس سہرے کے بنانے میں فنکار جوہریوں نے اپنی نظر انتخاب اور فنکارانہ مہارت کا پورا ثبوت دیا تب جاکر یہ سہرا بنا ہے. سات سمندروں کے طول و عرض کو دیکھو ، گویا دنیا بھر کے موتی جمع کردئے گئے ہوں گے ، اور پھر اسی گز بھر سہرے کی صناعانہ ندرت و حسن کو سامنے لاؤ ، بے اختیار تمہاری زبان سے یہی نکلے گا کہ کاریگروں نے سہرے کی تاروں میں موتی نہیں دنیا بھر کے تمام سمندروں کے جواہر کے دل پرو دئے ہوں گے.

اس شعر کا طرزِ بیان اور یہ مفہوم پیش نظر رکھتے ہوئے پہلے مصرعہ کا بظاہر مبالغہ قطعی مبالغہ دکھائی نہیں دیتا. غالب کے اس پیرایۂ بیان سے صرف یہ حقیقت ظاہر کرنا تھی کہ جوان بخت کا سہرا اعلیٰ درجہ کے نادر اور انتخاب اور بے مثال موتیوں سے بنایا گیا ہے. اس حقیقت کی جھلک ذوق کے سہرے کے شعر نمبر نو میں ڈھونڈے سے بھی نظر نہیں آتی.

یوں بھی دیکھئے لیجئے دنیا میں « سات دریا » یا « سات سمندر » ایک حقیقت

واقعی ہے۔ غالب نے سات دریا کا نام لے کر ساری دنیا کے دریاؤں کو اپنے دام خیال میں لے لیا ہے۔ اس کے مقابلے میں ذوق کا «صد کانِ گہر» کہنا دنیا کے تمام معادن جواہر کو محیط نہیں ہے۔ ورنہ اگر غالب کے سات اور ذوق کے سو کوحسابی قاعدہ سے جانچا جائے تو سو کا عدد سات سات کرکے ۱۴ پر تقسیم ہوجائے گا اور پھر بھی دو باقی بچ رہیں گے۔ اور یوں ذوق نے غالب کے مقابلے میں عددی زیادتی ضرور دکھا دی۔ غالب کے سات کے مقابلہ میں پورا ایک سو لیکن معنی کے لحاظ سے غالب کا مبالغہ شاعرانہ حسن سے بھر پور اور ذوق کا مبالغہ محض «تیلی رے تیلی تیرے سر پر کولھو» کی مثال کا مصداق ٹھہرے گا۔

غالب کا شعر نمبر ٦:

رخ پہ دولھا کے جو گرمی سے پسینہ ٹپکا
ہے رگِ ابر گہر بار سراسر سہرا

بظاہر غالب کے اس شعر پر وہی اعتراض ہوسکتا ہے جو ہم اوپر ذوق کے سہرے کے دسویں شعر پر درج کر آئے ہیں کہ دسمبر کے مہینے میں بادِ بہار کیسے چلنے لگی۔ یہاں بھی کہا جاسکتا ہے کہ دسمبر کے مہینے میں اتنی گرمی کہاں سے آگئی کہ دولھا کے چہرے سے پسینہ ٹپکنے لگا۔ غالب کے اس شعر کے دفاع میں کہا جائے گا کہ نوجوان تندرست آدمی کی حالت بوڑھوں سے جدا ہوا کرتی ہے۔ ہم نے دلی کے بعض خاندانی حکیموں کو دسمبر جنوری میں باریک ململ کے انگرکھے پہنے ٹھنڈا پانی پیتے دیکھا ہے۔ دوسرے دیوان خاص یا دیوان عام کے وسیع مسقف ایوانوں میں بھی اگر سردی کی وجہ سے پردے چھوڑ دئیے گئے ہوں اور براتیوں کا وہ مجمع ہو کہ تل رکھنے کو جگہ نہ رہی ہو تو اتنے آدمیوں کے تنفس سے فضا کا کیا عالم رہا ہوگا۔ ایسی حالت میں غالب صرف دولھا کو دیکھتے ہیں کہ اس کا چہرہ سہرے سے ڈھکا ہوا ہے، شرکائے مجلسِ عروسی کے تنفس کی گرمی اور حبس کا احساس کرکے فوراً اس شعر کا خوبصورت شاعرانہ مضمون پیدا کرلیتے ہیں۔ یہ شاعرانہ لطافت خیال اور شاعرانہ حسن تعبیر کا اچھا نمونہ ہے۔ دولھا کے چہرے سے بوجہ گرمی کے پسینہ کے قطروں کے گرنے کو رگ ابر گہر بار سے ملا دینا حسین تشبیہ ہے۔ یہ حسن نظر کی دلکش فریب خوردگی ہے۔ اگر جواں بخت کے چہرے پر موتیوں کا ایک

سہرا ہے تو دوسری طرف اس کے محجوب و مستور چہرے پر سے جو پسینہ کے قطرے موتیوں کی طرح لگاتار ڈھلک رہے ہیں، غالب نے ان کو بھی ایک اور خوبصورت سہرا تصور کرلیا. سامنے کی بات ہے کہ جواں بخت ابھی جوان تھے اور حسین نوجوانوں کا پسینہ گلاب کے قطروں سے کم عطر بیز اور تابدار موتیوں سے کم آبدار نہیں ہوا کرتا.

غالب کے سہرے کا ساتواں شعر یہ ہے:

یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے
رک گیا آن کے دامن کے برابر سہرا

خوب شعر ہے. سہرا بھی لا جواب ہے. جواں بخت بھی جوان جامہ زیب ہے اور اس کا لباس بھی بیش بہا ہے. سہرا اور قبا دونوں اپنی اپنی جگہ موزوں و مناسب اور بہت ہی عمدہ ہیں. غالب کی فنکارانہ حسن شناس نظر دونوں چیزوں پر ہے. وہ دیکھ رہے ہیں کہ سہرے کی درازی حسینوں کی زلف دراز کی مد مقابل نہیں بلکہ اسی حد تک ہے کہ قبا کے دامن کی زیبائش اس سے نہ چھپی ہے نہ دبی ہے. دونوں میں حسینانہ رقابت تو تھی مگر قبا اور سہرے کی اس رقابت باہمی نے دولھا کی آرائش و زیبائش اور جامہ زیبی کو دوبالا کردیا ہے. اس پیرایۂ بیان میں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ قبا تو ہمیشہ کا لباس ہے گویا میزبان ہے اور سہرا صرف آج کے خاص دن کا خاص زیور اور یہاں کا مہمان ہے. آج کے مہمان نے، گوکہ آج کا دن اسی کا دن ہے، اگرچہ اکرام ضیف ہر تہذیب میں شریفانہ مسلک ہے لیکن میزبان کا احترام بھی ضروری ہے، اس لئے روز مرہ کے لباس، قبا کا ادب بھی ملحوظ رکھا ہے. یوں بھی «قدیمانِ خود را بیفزائے قدر» تہذیب و شرافت کی کتاب آئین کا ایک جلی عنوان ہے.

غالب کا آٹھواں شعر ہے:

جی میں اِترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز
چاہئے پھولوں کا بھی ایک مقرر سہرا

ساتویں شعر میں قبا اور سہرے کی چشمک کی طرف اشارہ تھا. یہاں در شہوار اور موزوں و لا جواب موتیوں کے اترا جانے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے. کہ مقابلۂ حسن و یکتائی میں ہمارا مد مقابل کوئی نہیں اس لئے غالب نے ان کا جواب

تجویز کردیا کہ موتیوں کی یکتائی کا جواب یہ ہے کہ پھولوں کا سہرا بھی ہوجائے. تاکہ مقابلہ ہو تو برابر کا۔ اور کسی کو کسی پر بڑائی جتانے کا موقع ہی نہ ملے۔ کوئی زیور اپنی پوجا نہ کرائے۔ بلکہ ایک مظہر شباب و رعنائی کی زیبائش کا سامان بن جائے۔ غرض موتیوں کے سہرے کے ساتھ ساتھ پھولوں کا سہرا اس لئے تجویز کیا گیا ہے کہ کہیں موتی یکتائی کا دعویٰ نہ کر بیٹھیں۔ ورنہ موتی اپنی جگہ سندر ہیں، اور پھول اپنی جگہ راحتِ روح اور راحتِ چشم۔ موقع کی اہمیت کے لحاظ سے مناسب یہی ہے کہ دونوں اپنی اپنی بہار اور پھبن دکھائیں اور دولہا کی زیبائش و جمال کو بڑھائیں۔ تاکہ جوان بخت کا انسانی حسن، ان دو دو سہروں کی چمک دمک اور تازگی و خوشبو سے اور جاذب نظر و قلوب ہوجائے۔

دیکھو اسی شعر میں غالب نے بھی «اِترانے» کا لفظ استعمال کیا ہے، اور اسی کے بالمقابل ذوق نے بھی اپنے سہرے کے دسویں شعر میں «اِترانے» کا لفظ باندھا ہے۔ غور کرو کہ کس استاد نے یہ لفظ موزوں و مناسب طور پر برتا ہے۔ اور کس نے نمونہ کی موجودگی میں بعد میں برت کر بھی لفظ کی معنویت کو کم کردیا ہے۔

غالب کا نواں شعر ہے:

جب کہ اپنے میں سمائیں نہ خوشی کے مارے
گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیوں کر سہرا

اس کار گاہ حیات میں ہر چیز جو پیدا ہوتی ہے، اس پر دور شباب آتا ہے، اور خود بینی و خود نمائی کی کیفیت بھی طاری ہوا کرتی ہے۔ اس عالم میں وہ پُر شباب چیز اپنے آپ میں لفظاً و معناً پھولے نہیں سمایا کرتی۔ اکثر اس کی زبان حال سے یہ نکل ہی جایا کرتا ہے کہ انا الموجود ولا غیری (عالم وجود میں میرے سوا کوئی اور ہے ہی نہیں)۔ غالب دیکھ رہے ہیں کہ تازہ پھول جوانی دیوانی کے اسی دور سے گذر رہے ہیں اسی لئے حیرت زدہ ہوکر بول اٹھتے ہیں کہ ان دمبدم پھولنے۔ پھیلنے والے پھولوں کو ایک رشتہ میں کیسے گوندھا، باندھا، یا پرویا جائے، کہ یہ جو جوش شباب یا شادی کے موقع کی مسرت کی بنا پر قابو سے باہر ہوئے جا رہے ہیں، غالب کہتے ہیں کہ ایسے بے قابو پھولوں کو قابو میں کیسے لایا جائے۔ کیونکہ ڈر ہے کہ قابو میں لانے کی کسی کوشش سے کہیں

ان کی تازگی اور نازگی کو گزند نہ پہنچ جائے۔ اور ان کی نرم و نازک پنکھڑیاں اپنی اصل سے ٹوٹ کر بکھر نہ جائیں۔

غالب کا شعر نمبر دس:

رخِ روشن کی دمک، گوہر غلطاں کی چمک
کیوں نہ دکھلائے فروغِ مہ و اختر سہرا

اس شعر میں « رخِ روشن کی دمک » اور « گوہر غلطاں کی چمک » کہہ کر دو الگ الگ اور اپنی اپنی جگہ دو مستقل کیفیتیں دکھائی گئی ہیں۔ جو ایک حسین اور پرلطافت سچائی ہے۔ دولہا کا چہرہ ماہ سے مشابہ ہے۔ اور یہ ہماری زبان میں روز مرہ کی بول چال ہے کہ انسانی چہرے کو چاند ہی سے مشابہ کہا کرتے ہیں۔ اور سہرے کی موتی بھری جھولتی اور جھومتی لڑیوں کے موتیوں کی چمک کو « گوہر غلطاں کی چمک » کہنا اظہار واقعہ اور قابل دید نظارہ کی طرف اشارہ ہے۔ خوبصورت چہرے کے جلوے اور اس پر موتیوں کی لڑیوں کی جنبش اور ان کے موتیوں کی غلطیدگی سے پیدا ہونے والی روشنی کو دکھانا یہ منظر کشی کی نہایت عمدہ شاعرانہ لفظی تصویر ہے۔ ذوق بھی مہ و انجم کو لانے لگے تھے۔ مگر یہ معنویت کہاں لا سکے۔

غالب کے سہرے کا گیارہواں شعر ملاحظہ ہو:

تار ریشم کا نہیں ہے یہ رگِ ابر بہار
لائے گا تابِ گرانباریٔ گوہر سہرا

غالب کو جواں بخت کے سہرے کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ سہرے کے موتی جن باریک تاروں میں پروئے گئے ہیں۔ وہ اپنی لطافت و نزاکت میں ریشم کے تار نہیں بلکہ رگہائے ابر بہار معلوم ہوتی ہیں، ابر بہار جو آبی موتی برساتا ہے۔ تو وہ آسمانی پانی موتیوں کی لڑیاں ہی نظر آیا کرتا ہے۔ پانی کے قطرے جو موتی ہی ہوتے ہیں زمین تک پہنچتے پہنچتے بھاری ہونے کے سبب لڑیوں سے الگ ہو ہو کر بکھرتے نظر آیا کرتے ہیں۔ سہرے کے موتی بھی جو اپنی جسمانی بڑائی اور قدر و قیمت کے لحاظ سے بہت گرانبار ہیں ان کو دیکھ کر غالب کو خیال آتا ہے کہ بھلا رگہائے ابر بہار کے سے نازک ریشمی تار گرانبار اور وزنی موتیوں کے کیسے متحمل ہوسکیں گے۔

غالب کے سہرے کا مقطع:

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں کہدے کوئی اس سہرے سے بہتر سہرا

غالب کے سہرے کا یہ آخری شعر یا مقطع ہے۔ غالب نے جیسا کہ اپنے معذرت نامے میں تصریح کی ہے مقطع کا بظاہر ادعا محض ایک سخن گسترانہ بات ہے اور شاعری میں ایسی باتیں نہ عیب ہیں اور نہ کسی دوسرے کے لئے سببِ ننگ۔ مگر اسے تحدی قرار دیا گیا۔ اور جواباً ذوق سے سہرا کہلوایا گیا۔ جس میں مقطع کے بعد غالب کی تحدی کے جواب میں ذوق نے بڑے طنطنہ سے اعلان کر دیا کہ

جس کو دعوی' ہے سخن کا یہ سنادے اس کو
دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

اس وقت اگرچہ دورِ حاضر کے دو فاضلوں ہی کی رائیں اس موضوع پر سامنے آئی ہیں۔ لیکن یہ بحث بہت پرانی ہے اور علمی مجلسوں میں ہمیشہ زیر بحث رہی ہے ہم نے بھی کسی قدر تفصیل سے پرانی بحث کو اپنے حسب استطاعت نیا لباس پہنا دیا ہے۔ ہمارے نزدیک غالب کے سہرے میں لطافت و نزاکت اور ادبی رکھ رکھاؤ ہے اور ذوق کا سہرا ایک جھنجھلاہٹ اور غصہ کا اظہار ہے۔ ناظرین پرتمکین کے سامنے دونوں سہرے اور ہماری معروضات ہیں۔ ہم نے اظہار خیال میں تکلف سے کام نہیں لیا۔ ہماری رائے اوپر درج ہے۔ میدان تخیل بہت وسیع ہے۔ جتنے انسان، اتنی رائیں:

دلی کا لال قلعہ باقی ہے۔ اس کے بانیوں کے آخری جانشین ظفر کے جواں سال فرزند موسوم بہ جواں بخت کی شادی کی تقریب میں جس کی ولیعہدی کے خواب دیکھے جارہے تھے۔ اسی لال قلعہ نے، جہاں شاہجہاں کی تختِ طاؤس پر جلوہ فرمائی کا جلوہ دیکھا تھا، اس آخری شاہی شادی کے یہ ٹھاٹھ بھی دیکھے تھے، جن کی جھلک ان دونوں سہروں کے لفظ لفظ سے ظاہر ہے۔ لیکن سنہ ۱۸۵۱ ع کی یہ نمودِ بے بود سنہ ۱۸۵۷ ع میں خواب و خیال بن گئی۔ اس خاندان کے کچھ لوگ تہ تیغ ہوئے۔ کچھ رو پوش اور کچھ در بدر مارے مارے پھرنے پر مجبور ہوگئے۔ بادشاہ ظفر، ان کی ملکہ زینت محل اور دونوں سہروں کے ممدوح

ان کے فرزند جواں بخت مع اپنی دلہن کے شاہی قیدی بنا کر رنگوں میں اپنی مدت حیات پوری کرنے کے لئے بھیج دئے گئے۔ اللہ اللہ جس قافلے کے لئے ہوئے ہونے پر بھی یہ عروج تھا کہ دلی کے آخری دور کے مملکتِ شعر و سخن کے دو باکمالوں نے اپنے اپنے سہروں میں یہ جاہ و جلال دکھایا تھا، رنگون میں عبرت و عسرت اور زبوں حالی سے اپنے دن گذار رہے تھے۔ ذوق تو شاہی خاندان کے آخری زوال یعنی سنہ ۱۸۵۷ ع سے پہلے ہی اس دنیا سے سفر کر چکے تھے، مگر غالب بقیدِ حیات تھے۔ غالب جن کو اپنی مالی پریشانیوں کا بالخصوص آخری عمر میں مسلسل رونا رہا۔ ان کی حالت شاہی خاندان کے اسیروں کی اس حالت سے بدرجہا بہتر تھی جو جلاوطن ہونے والے مخلوع و مسجون شاہی خاندان کے افراد کی تھی۔ چنانچہ ملاحظہ ہو ۵ اپریل (چہارشنبہ) ۱۹۶۱ ع کے ٹائمز آف انڈیا، بمبئی نے سو برس پہلے کی اپنی اسی دن اور اسی تاریخ کی حسب ذیل خبر نقل کی ہے:

«مولمین (Moulmein) کے مقام پر خاندان دہلی کے سرکاری قیدیوں نے درخواست کی ہے کہ ان کے وظیفہ میں اضافہ کیا جائے۔ یعنی سابق شاہ کو تیس روپیہ ماہوار اور ان کے تمام بیٹوں کو جو دس دس روپیہ ماہوار دئے جاتے ہیں ان میں کسی قدر اضافہ کیا جائے کیوں کہ موجودہ وظیفہ میں وہ اس عیش و عشرت سے نہیں رہ سکتے جس طرح کہ وہ رہنا چاہتے ہیں۔ لارڈ کیننگ نے ان کے موجودہ وظیفہ پر اضافہ کرنے سے صاف انکار کردیا»۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون)

دنیا کا یہی دستور ہے۔ ایک کو چڑھاتی ہے، دوسرے کو گراتی ہے۔ حتیٰ چڑھنے والا یہ خیال کرنے لگتا ہے کہ اسے ابدیت حاصل ہوگئی ہے۔ مگر جب اس کو بھی زمانہ اپنی عادت کے مطابق گرا دیتا ہے تو کوئی ایسے گرنے والے کو سہارا دینے والا نظر نہیں آتا۔ سچ ہے لمن الملک الیوم للہ الواحد القہار۔ ہمیشہ رہے نام اللہ کا، اسی کی بادشاہی سچی ہے۔

ع　پردہ داری می کند بر قصرِ قیصر عنکبوت
بوم نوبت می زند بر گنبدِ افراسیاب

* ڈاکٹر صفدر آہ

امیر خسرو بحیثیت ہندی شاعر

(۲)

خالق باری

امیر خسرو کی سب سے مقبول ہندی نظم خالق باری ہے. جسے پچھلے ساڑھے چھ سو برس میں ہزاروں خطاطوں نے زیورِ کتابت سے سجایا اور پچھلے سو برس میں جس کے درجنوں ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں.

بادی‌النظر میں یہ کتاب ایک مکتبی نظم معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقتاً تاریخ زبان میں اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے. یہ ہندی کا پہلا لغت ہے جو اپنے مترادف عربی و فارسی الفاظ کے ساتھ بصورتِ منظوم ہمارے پاس آج بھی موجود ہے.

خسرو کی ولادت سے تیس پینتیس سال پہلے ۶۱۷ھ میں ابو نصر فراہی نے عربی الفاظ کی تعلیم کے لئے افغانستان کے شہر فراہ میں مختلف الوزن قطعات کا ایک منظوم نصاب «نصاب‌الصبیان» کے نام سے تیار کیا تھا جو مکتبوں میں بہت مقبول ہوا. قرین قیاس یہی ہے کہ خسرو نے اپنے زمانۂ مکتب میں «نصاب الصبیان» پڑھا ہوگا. اور اس نصاب کے انداز و اسلوب کے جو نقوش خسرو کے ذہن میں رہ گئے شاید انہیں کا نتیجہ «خالق باری» کی تصنیف ہے.

خالق باری کو ہندی ہی کی طرح فارسی کا بھی پہلا لغت کہا جا سکتا ہے فارسی کا باضابطہ پہلا لغت «فرہنگ نامۂ قوّاس» خسرو کی عمر کے ربع آخر میں علاءالدین خلجی (۶۹۵ھ سے ۷۱۵ھ تک) کے دربار کے ایک شاعر فخرالدین مبارک شاہ قوّاس» غزنوی نے تصنیف کیا.

ہمارے پاس یہ ثابت کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں کہ «فرہنگ نامۂ قوّاس» خالق باری سے مقدم ہے. قیاس یہی کہتا ہے کہ اقدام خسرو ہی نے کیا ہوگا. قوّاس عمر میں بھی خسرو سے چھوٹا معلوم ہوتا ہے. اس کا نام علاءالدین خلجی

* ڈاکٹر صفدر آہ، والکیشور، بمبئی

کے دربار سے روشنی میں آتا ہے. لیکن خسرو اس سے قبل بھی دربار اور عوام دونوں میں مقبول تھے.

میں تو سمجھتا ہوں کہ خالق باری خسرو نے اوایل عمر میں تصنیف کی ہے. مکتبی تعلیم میں پڑھی ہوئی کتاب «نصاب‌الصبیان» کے انداز کا اثر خالق باری میں واضح طور پر نظر آتا ہے :-

نصاب‌الصبیان

سِوار دست برنجن چوپائے را خلخال
وِشاح عِقد حِمایل رِعاث و تاج آفسر

خالق باری

دست برنجن کنگن کہئے پایل ہے خلخال
پائے برنجن چوڑا کہئے خوبی حسن و جمال

نصب‌الصبیان

عُقار قَہوہ و رَاح و مُدام قَرقَف مے
کَمِی دلاور و فارِس سوار و صید شکار

خالق باری

بادہ شراب و رَاوق و صہبا مے ست مد
گر جرعہ زاں خوری تو کنی کار نیک بد

یہ تاثر ظاہر ہے اوائل عمر ہی میں زیادہ گہرا رہا ہوگا. لہذا امکان اس بات کا ہے کہ «خالق باری» کی نظم خسرو نے اپنی اوایل عمر ہی میں کہی. اس صورت میں «فرہنگ نامۂ قوّاس» جو ۶۹۵ھ کے بعد اور ۷۱۵ھ کے قبل لکھا گیا خالق باری سے مقدم کسی طرح نہیں ہوسکتا.

خالق باری چونکہ زبانِ ہندوی کی ترویج و تشکیل کے لئے لکھی گئی ہے لہذا اسے ہندی لغت ہی کہنا زیادہ مناسب ہے. بحیثیت زبان فارسی کو خالق باری سے کوئی فائدہ نہیں پہونچا ہے. لیکن اس کتاب نے ہندوی (اردو) کی ترویج میں ایک زبردست خدمت انجام دی ہے. فارسی الفاظ کا بھی جو ذخیرہ خالق باری میں ہے وہ ہندی الفاظ ہی کی طرح ہمارا ہے اور ہم آج تک اوسے خود اہل ایران سے بہتر طریقے پر استعمال کر رہے ہیں.

خسرو کا لسانی پس منظر خسرو اس عہد کے شاعر ہیں جب ہندوستان میں ایک نئی زبان پیدا ہو رہی تھی. اس زبان کے مستقبل پر خسرو کو پورا اعتماد تھا اور وہ اس نو عمر ادب کی نہایت خلوص سے خدمت کر رہے تھے. ان کی شاعری میں ایک طرف اگر تفکر و ترنم ہے تو دوسری طرف اس میں تعمیر زبان ہند کی ایک زبردست تحریک بھی چل رہی ہے. خسرو کی ہر موقع پر یہی کوشش رہی ہے کہ فارسی اور ہندی الفاظ شیر و شکر کی طرح گھل مل جائیں تا کہ مستقبل کی ہندوستانی زبان کے لئے ارتقاء کا راستہ تیار ہوسکے.

خسرو کے ہندی کلام میں یہ افادی کوشش اکثر جگہہ اصل شاعری سے زیادہ نمایاں ہے. ان کی پہیلیاں، دوسخنے، مکرنیاں وغیرہ لطف شاعری کے ساتھ تعلیم لغت کے سبق ہیں. کہیں کہیں اپنے فارسی کلام میں بھی وہ اپنی مادری زبان ہندی کے الفاظ اور محاورے بڑی خوبصورتی سے نظم کرتے ہیں، جن کا مقصد قطعاً یہی ہے کہ ان دونوں زبانوں کو قریب سے قریب تر لایا جائے. دیکھئے «دُر دُر موئے» کا نسوانی ہندی محاورہ ایک فارسی رباعی میں کس خوبصورتی سے نظم کیا ہے :-

رفتم به تماشائے کنارِ جوئے ✿ دیدم به لبِ آب زنِ ہندوئے
گفتم صنما بہائے زلفت چه بود ✿ فریاد بر آورد که «دُر دُر» موئے

ہندی ہی کیطرح فارسی میں بھی الفاظ کی صوری و معنوی جانچ پرتال خسرو کا دلچسپ مشغلہ تھا. انھوں نے بیسیوں حیرتناک لفظی اور معنوی صنعتیں ایجاد کی ہیں. اگر یہ دیکھنا ہو کہ خسرو لفظوں سے کس طرح شطرنج کھیلتے تھے تو ان کی تصانیف دیباچۂ غرۃ الکمال اور اعجاز خسروی پڑھئے. ہماری تاریخ ادب میں شاید اتنا زبردست قادرِ لغت کوئی نہیں ہوا ہے. خسرو عربی، فارسی، ترکی، سنسکرت اور ہندی کے عالم تھے اور پانچوں زبانوں کے لغت پر انہیں قدرت کامل حاصل تھی.

خالق باری کے متعلق روایات خالق باری کے لئے کہا جاتا ہے کہ یہ ایک ضخیم کتاب تھی جو اب مفقود ہوچکی ہے. موجودہ خالق باری اسی کا مکتبی اقتباس ہے. اس روایت کی تائید کے لئے جس مواد کی ضرورت ہے وہ میرے علم میں نہیں، لیکن اس روایت کو کئی مستند اہل قلم نے نقل کیا ہے.

اس ضمن میں ایک دلیل ضرور کان لگتی ہے کہ خالق باری مختلف الوزن قطعات کے اسباق میں بٹی ہوئی ہے۔ ان میں سے کوئی سبق دس پندرہ شعر کا ہے اور کسی سبق میں صرف ایک شعر نظر آتا ہے۔ خود مصنف اگر ان اسباق کی تقسیم کرتا تو ان کے اشعار کی تعداد میں کوئی مناسبت ضرور ہوتی۔ یہ بات قطعاً معقول ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اسباق کی یہ تقسیم مصنف کی نہیں۔ یا پھر مصنف کی کی ہوئی تقسیم میں وقت اور مکتب نے کافی قطع و برید کی ہے۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ خسرو نے یہ کتاب کسی بھٹیارن کے لڑکے کو تعلیم دینے کے لئے لکھی ہے۔ اگر اس روایت کو قابل اعتنا سمجھا جائے تو ضخیم خالق باری کی روایت مشکوک ہوجاتی ہے۔ بچے کو تعلیم دینے والے نصاب کا مختصر ہونا ضروری ہے۔

ایک اور روایت یہ ہے کہ خالق باری ان مہاجر ترکوں اور ایرانیوں کو ہندی سکھانے کے لئے لکھی گئی جو چنگیزی فتنوں کی وجہ سے اپنا وطن چھوڑ کر ہندوستان آگئے تھے۔ اس قیاسی روایت کی تائید کے لئے ضخیم خالق باری کا وجود پایۂ ثبوت کو پہونچنا ضروری ہے۔ جس کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔

عام خیال خالق باری کے لئے یہی ہے کہ یہ ایک نصاب ہے جو ہندوستانی بچوں کی تعلیم کے لئے تصنیف ہوا۔ خالق باری کا سب سے پرانا نسخہ بھی جو خسرو کی وفات کے گیارہ سال بعد سنہ ۷۳۶ھ میں مخطوط ہوا اور جس کی نقل نسخۂ ندوی اور نسخۂ اردو ریسرچ انسٹیٹیوٹ بمبئی ہے، اسی خیال کی تائید کرتا ہے۔ اس نسخے کے کاتب نے اختتام کتاب پر چند اشعار تتمے کے کہہ کر لکھ دئے ہیں جن میں وہ کہتا ہے:

امید است از فضلِ حق کریم بخوانند و گردند طفلاں علیم

✡ ✡ ✡

کہ صبیاں برانند از دامِ جہل شود فیضِ الفاظِ اشکال حل

ان اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ خسرو کے انتقال سے گیارہ سال بعد بھی یہ کتاب بچوں کو پڑھائی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ کاتب نے کہا ہے:

بہ تاریخ نیکو سر انجام یافت نصاب ظریفی نکو نام یافت

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خالق باری کا نام نصاب ظریفی بھی تھا۔ ظاہر ہے نصاب بچوں کے لئے لکھے جاتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان سے تعلیم کے شوقین بالغین بھی فائدہ اٹھالیں۔

قیاس غالب یہی ہے کہ خالق باری بچوں کی کتاب ہے اور بچوں کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔ اس میں مصنف نے ہر موقع پر نفسیات اطفال کا خیال رکھا ہے جیسے:

۱ اس کتاب میں ظرافت سب سے نمایاں ہے اور بچے ہنسی کے گرویدہ ہوتے ہیں۔ خالق باری کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ ہنسی ہنسی میں سیکڑوں لفظ بچوں کے حافظے میں پہنچا دیتی ہے۔

۲ یہ کتاب نظم میں ہے اور بچے نظم کو نثر سے جلدی یاد کرتے ہیں۔

۳ یہ کتاب مثنوی کی طرح ایک بحر میں نہیں لکھی گئی اس کا ہر سبق ایک نئی رواں بحر میں ملتا ہے۔ یہ تنوع بچوں کے ذہن کو بوجھل نہیں ہونے دیتا۔

خالق باری کے انداز پر تصنیفات

خالق باری کا اثر ابتدائی عہد میں علمی حلقوں پر کیا ہوا یہ ہمیں معلوم نہیں۔ لیکن تعلیمی حلقوں میں اس کتاب نے ایک ہلچل پیدا کردی۔

ہندوستان میں ہندوی زبان کی تعلیم کا یہ پہلا اقدام تھا۔ جو اس وقت کی سرکاری زبان فارسی کو بھی ساتھ لئے ہوئے تھا۔ جو بولی بچہ گھر میں بولتا تھا۔ اس کے لفظ مکتب میں پہلی مرتبہ اسے پڑھنے کو ملے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کتاب کی مقبولیت حد سے بڑھ گئی اور تھوڑے عرصے میں اس کے نسخے دلی سے نکل کر ہندوستان کے دوسرے شہروں میں پہونچ گئے۔ یہاں تک کہ اسی انداز کی تصنیفات کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔ ان کتابوں کی ایک طویل فہرست پروفیسر شیرانی مرحوم نے مرتب کی ہے جس میں سے چند مشہور کتابیں حسب ذیل ہیں۔

۱ اللہ خدائی، سنہ ۱۰۶۰ ھ مصنف تجلی، دہلی یا نواح دہلی میں لکھی گئی۔ کئی بار چھپی۔

۲ صمد باری، بارہویں صدی ہجری کا ربع اول، مصنف عبدالواسع، کئی بار چھپی اس میں الفاظ مختلف عنوانوں کے تحت جمع ہیں۔ جیسے غلہ، ادویات

ترکاریاں وغیرہ۔

۳ نصاب مصطفیٰ، سنہ ۱۱۲۶ ھ، نصابوں کے روایت کے خلاف اس میں تقریباً آٹھ سو شعر ہیں یہ کتاب چھپ چکی ہے۔

۴ قصیدہ لغت ہندی، ۹۵۰ھ یہ ایک چھوٹا سا قصیدہ ہے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ اسے ایک ایرانی حکیم یوسف ہراتی نے نظم کیا۔ جس نے بڑی کوشش سے ہندی سیکھی تھی۔ اس کے علاوہ

اللہ باری ۱۲۰۷ھ از احسن، قادر باری ۱۲۱۰ھ از فیاض اور رازق باری، ایزد باری، احمد باری، فیض جاری وغیرہ وغیرہ لکھی گئیں۔

پنجابی میں بھی اس طرح کی تصنیفیں برابر ہوتی رہیں جیسے :۔

۱ رازق باری ۱۰۷۱ھ از اسماعیل

۲ ایزد باری ۱۱۰۵ھ از کھترمل پسر سامل داس

۳ صنعت باری ۱۲۲۰ھ گنیش داس قانون گو اور

واسع باری، اللہ باری، ناصر باری، اعظم باری، صادق باری، اور درجنوں دوسری کتابیں

کہتے ہیں گجراتی اور تلنگی تک خالق باری کا اثر پہونچا ہے۔

اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ امیر خسرو کی کوئی کتاب نہ خالق باری سے زیادہ چھپی اور نہ اس سے زیادہ مقبول ہوئی۔ نیز ترویج زبان کا جو کام اس کتاب نے کیا ہے اس کی مثال مشکل ہی سے کوئی دوسری کتاب ہوسکے گی۔

محمود شیرانی مرحوم اور خالق باری | مرحوم پروفیسر شیرانی نے بڑی کوشش اور کاوش سے ایک کتاب خالق باری پر لکھی ہے۔ جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مشہور و معروف نظم خالق باری امیر خسرو کی تصنیف نہیں ہے۔ میں شیرانی صاحب کی قابلیت اور جزورسی کا بدل مداح ہوں لیکن ان کی اس مخصوص تصنیف میں محققانہ نکتہ سنجی سے زیادہ اپنے مفروضہ نظریے کے لئے توجیہ تراشی آگئی ہے۔ خوش قسمتی سے یہ توجیہات مزاج عہد سے اتنا موافق تھیں کہ انہیں عوام کے علاوہ خواص کے ذہن نے بھی آسانی سے قبول کرلیا۔

شیرانی صاحب کے سارے نظریے کی بنیاد ۱۱۸۷ھ کا تحریر کیا ہوا خالق باری کا ایک نسخہ ہے۔ جس کے لئے کہا گیا ہے کہ اس کی کتابت سورت میں

ہوئی ہے۔ اس نسخے کے کاتب سید یاسین ولد سید طاہر عرف خوب صاحب ہیں۔ اس نسخے کو ایک ایسے نسخے کی نقل بتایا گیا ہے جسے کسی بابا اسحاق حلوائی کی فرمائش پر ضیاءالدین خسرو نے ۱۰۳۱ھ میں بطریق ریختہ عربی فارسی الفاظ کو ہندی گوالیاری میں ترجمہ کرکے نظم کیا۔ مفروضہ مصنف نے اس کتاب کا نام حفظ اللسان رکھا ہے اور اس کا مادۂ تاریخ تصنیف نثر میں «نصیف آخر» نکالا ہے۔

یہ سورتی نسخہ اس کتاب کی نقل بتایا جاتا ہے جو ۱۰۳۱ھ میں بابا اسحاق حلوائی کی فرمائش پر تصنیف ہوئی۔ میں کسی پیشے کی توہین نہیں کرتا لیکن اس پرانے جاگیردار سماج میں جو کتاب ایک حلوائی کی فرمائش پر لکھی جائے اس کے ساقط الحیثیت ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔ اگر مفروضہ مصنف ضیاءالدین خسرو کا کوئی وجود مان لیا جائے تو بظاہر وہ ایک حلوائی دوست مکتب کے ملّا ہونگے۔ ان کی شخصیت ان کی کتاب کے مادۂ تاریخ «نصیف آخر» سے واضح ہوجاتی ہے۔ بیچارے ملّا صاحب تاریخ کے لئے چند مصرعے بھی موزون نہ کرسکے۔ پھر «نصیف آخر» مادۂ تاریخ کیا ہوا۔

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ملّا ضیاءالدین کے پاس امیر خسرو کی خالق باری ہو اور انہوں نے اپنی قند و شیرینی کے لئے بابا اسحاق قنّاد کو فریب دے کر اپنی تصنیف بتایا ہو نیز اس کتاب کا مصنف بننے کے لئے اپنا تخلص خسرو رکھ لیا ہو۔ بابا اسحاق کا تعلق قند و شیرینی کے علاوہ اگر قند علم و فضل سے بھی ہوتا تو اس زمانے کے رواج کے مطابق مصنف کتاب ملّا ضیاءالدین ان کی اس خصوصیت کی طرف اشارہ ضرور کرتے۔ مگر معلوم یہ ہوتا ہے کہ اس کتاب کو بابا اسحاق قنّاد کی فرمائش قرار دینے والے مصنف کو اپنے ممدوح کے لئے بابا اور قنّاد کے علاوہ کوئی اور صفت نہ مل سکی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اسحاق محض حلوائی ہے۔

عہد اسلام کے بعض پیشہ ور علماء اور شعراء کا خیال ہندو طبقاتی کی تقسیم سے متاثر خود سر مغل جاگیردار سماج پر منطبق کرنا درست نہیں۔

نظریۂ شیرانی حیرت ہے کہ ایسے مجہول الحیثیت نسخے کو اپنے نظریے کی بنیاد بناکر شیرانی صاحب نے خالق باری کو ۱۰۳۱ھ کی تصنیف قرار دیا ہے اور اس کے

مصنف کا نام ضیاءالدین خسرو مان کر ارشاد فرمایا ہے کہ تجانس اسمی کی وجہ سے یہ کتاب امیر خسرو کے نام سے مشہور ہوگئی ہے۔

«خالق باری کے مصنف امیر خسرو ہیں»۔ اس نظریے کو ساڑھے چھ سو سال سے برابر مانا جارہا ہے۔ پھر خالق باری کا نسخۂ ندوی متعلقہ سنہ ۷۳۶ ھ شیرانی صاحب کے علم میں ہے اور اسے وہ مستند مانتے ہیں۔ اس کے بعد بھی خالق باری کو سنہ ۱۰۳۱ ھ کی تصنیف بنانے کی کوشش میری سمجھ میں نہ آسکی۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ خالق باری شیرانی صاحب کے لئے بار ذوق ہے اور ان کی کوشش یہ ہے کہ بہ زور علمیت ایسی کتاب کا رشتہ حضرت امیر خسرو سے باقی نہ رہنے دیں۔

خالق باری کی روایت تواتر| خالق باری کی روایت تواتر کا سلسلہ اس وقت ہمارے علم میں سنہ ۷۳۶ ھ کے نسخۂ خالق باری سے شروع ہوتا ہے جو امیر خسرو کی وفات کے گیارہ سال بعد مخطوط ہوا اور جس کی خبر ہمیں نسخۂ ندوی اور نسخۂ اردو ریسرچ انسٹیٹیوٹ بمبئی بھی دیتے ہیں۔ اس کے بعد یہ روایت دو چار ناقابل ذکر قیاسی اور ظنی واقعات سے گذرتی ہوئی «اللہ خدائی» کے سال تصنیف سنہ ۱۰۶۰ ھ تک پہونچتی ہے، اللہ خدائی، خالق باری کے سلسلۂ نسل کی قدیم ترین کتاب ہے۔

اللہ خدائی کا مصنف تجلی سنہ ۱۰۶۰ ھ میں اپنی کتاب تصنیف کرتے ہوئے اپنے نقش اول کے مصنف امیر خسرو کی روح سے اس طرح امداد کا طالب ہے:

شاید از لطف و رحمتِ باری　　روحِ خسرو نمایدم یاری

مندرجۂ بالا شعر میں صرف خسرو نظم ہوا ہے۔ لیکن اس سے شیرانی صاحب کے ضیاالدین خسرو کو مراد نہ لیا جائے۔ تجلی امیر خسرو کے ساتھ ان کے مرشد خواجہ نظام الدین اولیا سے بھی امداد کی درخواست کرتا ہے:

بہر مرغِ نہادم دام　　مددے خواستم ز روحِ نظام

ظاہر ہے اس شعر کے بعد خسرو سے امیر خسرو کے علاوہ کوئی دوسرا مراد نہیں ہوسکتا۔ اس بحث سے یہ بھی ثابت ہوجاتا ہے کہ سنہ ۱۰۶۰ ھ میں اسی شعبے کا ایک مصنف خالق باری کو امیر خسرو ہی کی تصنیف سمجھتا ہے۔

اس موقع پر ایک بڑا اہم نکتہ قابل غور ہے۔ مکتب کی مقبول ترین کتاب خالق باری بقول شیرانی صاحب سنہ ۱۰۳۱ ھ میں ضیا الدین خسرو تصنیف کرتے

ہیں. ظاہر ہے سنہ ۱۰۶۰ھ تک پچیس تیس سال میں یہ کتاب اپنے صحیح خد و خال کے ساتھ آندھی کی طرح پھیلی ہوگی. جس سے متاثر ہوکر تجلی نے اللہ خدائی لکھنے کا فیصلہ کیا. کتنی مضحک بات ہے کہ تیس برس کے اندر مقتدی اپنے مبتدی کے نام و نشان کو بھول کر امیر خسرو کی روح کے پاس امداد مانگنے پہونچ گیا. کاش شیرانی مرحوم اس پہلو پر بھی غور فرما لیتے.

خالق باری کی روایت تواتر پھر قیاسات کے مبہم راستوں سے گذرتی ہوئی اردو کے پہلے محقق خان آرزو متوفی سنہ ۱۱۶۹ھ تک پہونچتی ہے اور غرائب اللغات میں خان موصوف خالق باری کو امیر خسرو کی تصنیف مان کر اس سے سندیں پیش کرتے ہیں. ان اسناد کو خود شیرانی صاحب نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے.

خان آرزو ہندی لفظ «آنون» کے لئے کہتے ہیں کہ «در ہندی ابر بلند شدہ را گویند». پھر اس لفظ کے غلط معنی رائج ہوجانے کا سبب بتاتے ہیں کہ «حضرت امیر خسرو علیہ الرحمہ در رسالۂ خود «انون» «میغ» گفتہ». شیرانی صاحب بتاتے ہیں کہ خان آرزو کا اشارہ خالق باری کے اس شعر کی طرف ہے:

خنجر و شمشیر و صمصام است تیغ ہندوی کھانڈا کہاوے «ان من» میغ

مطبوعہ خالق باری کے نسخوں میں «آنون» کی جگہ «ان من» ملتا ہے. لیکن شیرانی صاحب مانتے ہیں کہ قدیم قلمی نسخوں میں آنون، اونوں، یا انّوں تحریر ہے. اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خان آرزو کے وقت میں جو نسخے رائج تھے ان میں اب جا بجا تحریف ہوگئی ہے.

غرائب اللغات میں ہندی لفظ «چُھرا» کے لئے خان آرزو تحریر فرماتے ہیں کہ «کارد بزرگ بہ تازی ساطور خوانند ...... در رسالۂ منظومۂ امیر خسرو چھرا بمعنی استرہ است. و مشہور در قصبات ہندوستان، نیز ہمیں است». شیرانی صاحب فرماتے ہیں کہ خان موصوف کا اشارہ خالق باری کے اس شعر کی طرف ہے:

جاروب سوہنی کہ سبد است ٹوکرا مقراض کترنی کہ بود استرہ چھرا

غرائب اللغات میں «ماڑھی» کے معنی خان آرزو یہ بتاتے ہیں کہ «عمارتے کہ بر قبر آتش پرستاں و یہوداں سازند .... لیکن بمعنی بام ہم است چنانچہ از رسالۂ امیر خسرو علیہ الرحمہ معلوم میشود.» شیرانی صاحب فرماتے ہیں کہ خان

موصوف کا مقصود خالق باری کا یہ شعر ہے :

قصر کوشک حصن در تازی حصار حجرہ کوٹھا بام ماڑی در دُوار

یہاں ایک بات قابل لحاظ یہ ہے کہ خان آرزو نے خالق باری سے جتنے اسناد پیش کئے ہیں وہ سب ہندی الفاظ ہیں. اس کے معنی یہ ہوئے کہ علمائے متقدمین خالق باری کو ایک ہندی لغت سمجھتے تھے۔

بہرحال خان آرزو بھی خالق باری کو صرف امیر خسرو کی تصنیف ہی نہیں قابل سند تصنیف سمجھتے تھے. خان موصوف کے بعد سے آج تک تاریخ ادب پوری طرح روشنی میں ہے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ تمام محققوں نے بالاتفاق خالق باری کو امیر خسرو سے منسوب کیا ہے.

مولوی عبدالحق کے سنہ ۱۱۸۷ ھ کے لکھے ہوئے ایک مشکوک نسخے کی بنا پر جو بابا اسحاق حلوائی کے سنہ ۱۰۳۱ ھ کے ایک مجہول الحیثیت نسخے کا پتہ دیتا ہے ہم ساڑھے چھے سو سال کے اتنے زبردست تاریخی تواتر کو کسی طرح رد نہیں کرسکتے.

خالق باری کا نسخۂ ندوی متعلہ سنہ ۷۳۶ ھ جس کی تائید اردو ریسرچ انسٹیٹیوٹ بمبئی کے نسخے سے ہوتی ہے سنہ ۱۰۳۱ ھ میں خالق باری کے تصنیف ہونے کے نظرئے کو عقلاً محال بنا دیتا ہے. جو کتاب سنہ ۷۳۶ ھ میں موجود تھی وہ سنہ ۱۰۳۱ ھ میں کیوں کر تصنیف ہوسکتی ہے. خود شیرانی صاحب بھی نسخۂ ندوی کے استناد کے قایل ہیں.

نسخۂ ندوی نسخۂ ندوی محترمی جناب پروفیسر نجیب اشرف صاحب ندوی کی ملکیت ہے اور اس بحث کی سب سے اہم کتاب ہے. افسوس ہے کہ ندوی صاحب کی نقل مکان کے سلسلے میں موصوف کی کتابیں بے ترتیب ہوگئی ہیں اور سخت کوشش کے باوجود اس وقت یہ نسخہ نہیں مل رہا ہے. مجبوراً میں اس نسخے کے متعلق صرف وہی معلومات پیش کروں گا جو خود شیرانی صاحب نے اپنی کتاب میں ارقام فرمائی ہے.

نسخۂ ندوی کے خاتمے پر حسب ذیل عبارت تحریر ہے :

« تمت ، تمام شد نسخۂ نصاب ظریفی مشہور بہ کتاب خالق باری بتاریخ ہشتم شہر ربیع الثانی. کاتب الحروف من بندۂ حقیر نوروز بن موبدان شاپور جی معروف

به شائستگان».

اس سے آگے کی عبارت پر سیاہی پھری ہوئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب سرقہ کرکے بیچی گئی ہے. سیاہی پھری ہوئی عبارت میں کوئی نشان دہی ایسی ضرور ہوگی جس سے سارق پکڑا جاسکتا تھا. بغیر سیاہی پھری ہوئی مندرجہ بالا عبارت سے حسب ذیل باتیں واضح ہوتی ہیں:

۱ اس کتاب کو خالق باری کے علاوہ نصاب ظریفی بھی کہا جاتا تھا.

۲ اس نسخے کی کتابت آٹھویں ربیع الثانی کو تمام ہوئی (بغیر سیاہی پھری عبارت میں سن مرقوم نہیں)

۳ اس کتاب کا کاتب ایک پارسی نوروز بن موبدان شاپورجی ہے.

اوپر لکھی ہوئی عبارت کاتب نسخہ نوروز بن موبدان شاپورجی کی تھی. لیکن یہ نسخہ جس نسخے کی نقل ہے وہ خالق باری کا سب سے پرانا نسخہ ہے. جس کی کتابت امیر خسرو کی وفات کے گیارہ سال بعد سنہ ۷۳۶ھ میں ہوئی ہے.

زیر غور نسخۂ ندوی کس سن کا ہے یہ تو پتہ نہیں چلا لیکن خود شیرانی صاحب بھی اسے کافی پرانا نسخہ مانتے ہیں. ان کا خیال ہے کہ اس کی کتابت سورت یا کھمبات میں ہوئی ہے. اگر نسخۂ ندوی اس وقت مل جاتا تو اس کے کاغذ اور انداز تحریر سے میں خود اندازہ لگانے کی کوشش کرتا کہ اس کا زمانہ کتابت کیا ہے.

نسخۂ ندوی میں سال کتابت کا پتہ نہ چلنے سے اس بحث پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا. یہ نسخہ جس قدیم نسخے کی نقل ہے اس میں ساری تفصیلات موجود ہیں. سنہ ۷۳۶ھ کے نسخے کے کاتب نے خاتمہ کتابت پر اپنا ایک منظوم تتمہ درج کیا ہے جس سے ساری ضروری باتیں واضح ہوجاتی ہیں. کاتب کا منظوم تتمہ یہ ہے:

چو بگرفت این نسخه طرز نوی — ز تصنیف آن خسرو پهلوی
ز اتمام عاشوره یک هفته شد — که این گوهر بے بہا سفته شد
امید است از فضل حقِ کریم — بخوانند و گردند طفلان علیم
به تاریخ نیکو سر انجام یافت — نصاب ظریفی نکو نام یافت
ز هفت صد فزون سی و شش سال بود — که طبع از خرد دست یاری نمود

که صبیاں برآئند از دام جہل   شود فیض الفاظِ اشکال حل

کاتب کی شاعری کو نظر انداز کرکے ہمیں صرف اس تتمے کے مطالب پر غور کرنا ہے. اس کتاب کو کاتب اپنی تصنیف نہیں بتاتا وہ کتاب کے مصنف کو «آن خسرو پہلوی» کہتا ہے جو بصیغۂ غائب اس کی ذات سے الگ ایک اور شخصیت ہے.

خسرو پہلوی نسخۂ ندوی کے پارسی کاتب نوروز کی خامہ فرسائی معلوم ہوتی ہے. اردو ریسرچ انسٹیٹیوٹ بمبئی میں ۱۵ رجب سنہ ۱۲۶۱ ھ کا لکھا ہوا ایک اور خالق باری کا نسخہ موجود ہے جس کے کاتب قاضی قاسم علی ہیں اور جو کسی ناگر برہمن کے لڑکے کی تعلیم کے لئے مخطوط ہوا. اس نسخے میں بھی نسخۂ ندوی میں نقل کئے ہوئے تتمے کے اشعار من و عن موجود ہیں. لیکن «خسرو پہلوی» کی جگہ اس میں «خسرو دہلوی» مندرج ہے. سنہ ۱۲۳۶ ھ کے نسخے کی دو نقلیں اور ان میں تطابق اس نسخے کومستند سے مستند تر بنا دیتا ہے.

شیرانی صاحب کی دو دلیلیں | بابا اسحاق حلوائی کا نسخۂ خالق باری مجہول‌الحیثیت ثابت ہوجانے کے بعد شیرانی صاحب کی بحث کی بنیاد حسب ذیل دو دلیلوں پر رہ جاتی ہے.

۱ ـ خالق باری میں «دام» اور «دمڑا» سکّوں کے نام نظم ہوئے ہیں. لیکن ان سکوں کا رواج عہد اکبر سے ہوا جو عہد خسرو سے کئی سو سال موخر ہے. لہذا خالق باری عہد مغلیہ میں تصنیف ہوئی.

۲ ـ اپنی تصنیفات میں امیر خسرو نے چند لفظ کسی اور معنی میں نظم کئے ہیں. اور وہی لفظ خالق باری میں کسی دوسرے معنی میں نظم ہوئے ہیں. لہذا امیر خسرو اور مصنف خالق باری دو مختلف ہستیاں ہیں.

پہلے دلیل اول پر غور کیا جاتا ہے. خالق باری کے حسب ذیل شعر میں «دام» اور «دمڑا» نظم ہوئے ہیں:

دانگ فلوس جو آہے پیکا جیتل دمڑا جان   دام واخچه کیسه کھیسه جان میکش تان

شیرانی صاحب فرماتے ہیں که دام اور دمڑا (دمڑی) سکوں کا رواج عہد اکبر سے شروع ہوا.

یه درست ہے که دام اور دمڑا (دمڑی) عہد اکبر میں رائج تھے. لیکن ان

کی ابتدا عہد اکبر سے ہوئی اس کا کوئی ثبوت شیرانی صاحب نے پیش نہیں کیا۔ سلطنت مغلیہ میں ایسے بہت سے سکے رائج تھے جن کا رواج قبل عہد مغلیہ میں بھی رہا ہے جیسے :

تنکہ ۔ سلطانوں کے عہد کا مشہور چاندی اور سونے کا سکہ یہ سکہ عہد مغلیہ میں بھی رائج تھا جس کا ذکر اکبر نامے اور تزک جہانگیری وغیرہ میں برابر آیا ہے۔

دینار ۔ علاءالدین خلجی کا سونے کا سکہ جو عہد مغلیہ میں بھی رائج رہا۔ مغل تاریخوں میں دینار کا ذکر برابر ملے گا۔

جیتل ۔ یہ سکہ سلطانوں کے عہد میں بھی رائج تھا اور اس کا رواج مغلوں کے عہد میں بھی رہا۔ ابوالفضل اور مغلوں کے دوسرے مورخوں نے اس سکے کا ذکر برابر کیا ہے۔۔

گانی ۔ جیتل کے برابر کا ایک سکہ تھا اور عہد خلجی میں اک گانی، دوگانی ہشت گانی، دوازدہ گانی کے حساب سے چلتا تھا۔ یہ سکہ عہد مغلیہ میں بھی رائج رہا اور اس کا ذکر تزک جہانگیری میں موجود ہے۔

عہد اکبر کی تاریخ اتنی تفصیل میں موجود ہے کہ جزوی باتوں کی تشریحات بھی ہمیں پوری طرح مل جاتی ہیں۔ میری نظر سے آج تک کسی مورخ کا یہ بیان نہیں گزرا کہ دام اور دمڑا (دمڑی) اکبر کے زمانے سے رائج ہوئے۔ بلکہ دمڑا نام کا کوئی سکہ اکبر کے زمانے میں رائج نہ تھا۔ البتہ دمڑی ضرور چلتی تھی۔ جو دام کا آٹھواں حصہ سمجھی جاتی تھی۔ دمڑی کا رواج شمالی ہند میں پچاس سال پہلے تک رہا لیکن اس وقت دمڑی نام کا کوئی سکہ نہیں تھا۔ دمڑی کی قیمت آٹھ کوڑیاں ہوتی تھیں۔

ہندوستان کے ماہر سکہ جات جناب پرمیشری لال گپتا اپنے ایک انگریزی مقالے «خلجی سلاطین دہلی کے سکے» مطبوعۂ ۱۹۵۷ ع میں «دام» کے لئے تحریر فرماتے ہیں کہ ایک پرانی کتاب «درویہ پریکھا» سے پتہ چلتا ہے کہ خلجیوں کے عہد میں «دام» موجود تھا۔ اب تو ہمیں معلوم ہوچکا ہے کہ «دام» لفظ «درام» یا دام (غالباً اپ بھرنش) سے نکلا ہے۔ یہ دونوں لفظ مسلم حملے سے قبل قریب قریب دام ہی کے مفہوم کے ساتھ شمالی ہند میں موجود تھے۔

مولانا سلیمان ندوی مرحوم اپنی کتاب نقوش سلیمانی میں تحریر فرماتے ہیں کہ « دام » در اصل یونانی لفظ « درخم » ہے جو یونانی تاجروں اور حملہ آوروں کے ساتھ عرب، ایران اور ہندوستان آیا ہے۔ عربی میں یہ لفظ « درہم » بنا۔ فارسی « ہ » ساقط ہوکر « درم » رہ گیا اور ہندوستانی میں « ر » ساقط کرکے « د » کی آواز بڑھائی گئی اور « دام » ہوگیا۔ یہی لفظ انگریزی میں « ڈرام » ہوا۔

ظاہر ہے یونانی حملے کے بعد یہ لفظ شمالی ہندوستان میں رائج ہوا ہوگا جس کی تائید گپتا جی بھی اپنے فاضلانہ مقالے میں کرتے ہیں۔ بلکہ گپتا جی کے خیال کے مطابق اس لفظ کا تلفظ द्राम्म انگریزی کے « ڈرام » سے ابتدا ہی سے مماثل تھا۔

اس مختصر بحث سے یہ بات بالکل صاف ہوجاتی ہے کہ سکہ « دام » ہندوستان میں مسلمانوں کے آنے سے قبل بھی رائج تھا اور مغلوں کے زمانے میں بھی رائج رہا۔ « دمڑا » قبل عہد مغل « دمڑا » ہوگا۔ جو عہد مغل میں « دمڑی » ہوگیا۔

امیر خسرو اور مصنف خالق باری دو الگ « شخصیتیں ہیں » اپنی اس دوسری دلیل کے ضمن میں شیرانی صاحب خالق باری کے چند شعر پیش کرتے ہیں:۔

(۱)

فارسی سیمرغ و عنقا ہست تدرو کبک ہنس
ہم چو یرقانست کانور ہے زریر و نسل ہنس

شیرانی صاحب کا ارشاد ہے کہ مصنف خالق باری نے تدرو اور کبک کو ایک پرندہ مانا ہے۔ مگر امیر خسرو قران السعدین میں ان دونوں طائروں کو دو الگ پرندے مانتے ہیں:

آنکہ پریدے زپر خود تدرو ٭ ماندہ چو پر گم شدگاں زیر سرو
لالہ چو از کوہ بہ رفت از شکوہ ٭ کبک بہ برّید دل از تیغ کوہ

خالق باری کا مصنف لائق ہو یا نالائق لیکن تدرو اور کبک کو ایک پرندہ نہیں سمجھ سکتا۔ علم اور لغت کو ایک طرف رکھئیے۔ اتنی باتیں تو مشاہدے اور سماعت سے بچوں کو بھی آجاتی ہیں۔ اصل میں شیرانی صاحب کو تسامح ہوا ہے۔ ع

فارسی سیمرغ عنقا ہست تدرو کبک ہنس

اس مصرعے میں ترتیب الفاظ لفظ اور ترجمے کے انداز پر نہیں ہے۔ یہاں چند طائروں کے نام لفظی معلومات بڑھانے کے لئے یکجا کئے گئے۔ یہ ٹکنیک خالق

باری میں کہیں جگہ نظر آتی ہے، ظاہر ہے سیمرغ، عنقا، تدرو، کبک اور ہنس اس میں سے کسی طائر کو ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں ہوسکتا.

خالق باری کی اس ٹکنیک کو نہ سمجھنے کی وجہ سے بعض ارباب لغت بھی غلطیوں کا شکار ہوئے ہیں. جس کا ذکر آگے آئے گا.

(۲)

تور ستور گاؤ ہے بلد　　خواہی لادو خواہی الد

شیرانی صاحب کہتے ہیں یہاں «لادو» بمعنی «لدّو» یعنی بار بردار ہے. لیکن امیر خسرو «دول رانی خضر خان» میں بار بردار کے لئے جو ہندی لفظ لائے ہیں وہ «لادی» ہے:

سوم لادی گرفتہ بر سر ایں بار　　کہ در ہندیست لادی بار بردار

شیرانی صاحب کی یہ دلیل درست نہیں ہے. «خالق باری» کے شعر کے دوسرے مصرعے «خواہی لادو خواہی الد» کے معنی یہ ہیں کہ چاہو لادو چاہو نہ لادو. یہ غلط ہے کہ یہاں «لادو» لدو کے معنی میں آیا ہے لدو کو ہندی میں लाद्दू کہیں گے اور اس جگہ لفظ लादो آیا ہے. خسرو کی فارسی میں «لادی» بالکل دوسرا لفظ ہے جس کے معنی بوجھ اٹھانے والے مزدور کے ہوتے ہیں. «لادی» کا اطلاق جانوروں پر نہیں ہوتا.

(۳)

دیگ ہانڈی کفچہ ڈوئی بے خطا　　تابہ و کزگاں کڑھائی و توا

شیرانی صاحب کہتے ہیں کہ لفظ کزگاں لغت میں نہیں ملتا. البتہ قازقان، قزغان اور گزگان کے معنی فرہنگوں میں تانبے کی بڑی دیگ کے مندرج ہیں. شیرانی صاحب خالق باری کے «کزگاں» کو «قازقان» وغیرہ مان کر کہتے ہیں کہ اس کا ترجمہ کڑھائی غلط ہے. ان کا خیال ہے کہ مصنف خالق باری کے برعکس اس لفظ کے معنی خود امیر خسرو دیگ سمجھتے تھے. ثبوت میں خسرو کا یہ شعر درج کیا ہے.

ولے با ایں ہمہ زیں خوان خالی شستہ بہ دستم
کہ حلوائے رضا پختہ نہ باشد اندریں گزغاں

خسرو نے کزگاں کو گزغاں کہا ہے. لیکن یہاں بھی یہ لفظ کڑھاؤ کے

معنی میں آیا ہے۔ حلوہ دیگ میں نہیں پکتا۔ کڑھاؤ میں پکتا ہے۔ ترکی میں قزغاں کے معنی یقیناً دیگ ہیں۔ لیکن ہندوستان آ کر اس لفظ کی ہئیت بھی بدلی اور اس کے معنی بھی بدلے۔ یہاں تک کہ غیر مستند اور غیر تعلیم یافتہ باورچی آج اس لفظ کو کڑگا کہتے ہیں جس کے معنی صرف کڑھاؤ ہیں۔

بہرحال شیرانی صاحب امیر خسرو کو مصنف خالق باری سے الگ ہستی ثابت کرنے میں قطعاً کامیاب نہ ہوسکے۔

شیرانی صاحب کے بنیادی دلائل رد ہوچکے۔ اب خالق باری کے لئے صرف ان کی کچھ قیاس آرائیاں باقی ہیں جن پر روشنی ڈالی جائے گی۔

شیرانی صاحب کی ذہنی روش | اپنے مضمون میں شیرانی صاحب بار بار اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ خالق باری ایسی گھٹیا ہندی تصنیف کو حضرت امیر خسرو سے منسوب کرنا امیر کی توہین ہے۔

شیرانی صاحب کا ایک عجیب خیال | شیرانی صاحب کا خیال ہے کہ اگر خالق باری امیر خسرو کی تصنیف ہوتی تو پچھلی صدیوں میں اس کی نہ جانے کتنی شرحیں لکھی جاتیں اور لغتوں میں اس کے حوالے ہوتے۔

خالق باری کی شرحوں کا تصور کرنے سے پہلے شیرانی صاحب نے اس حقیقت پر نظر نہیں ڈالی کہ خسرو کے فارسی کلام اور ان کی ایجاد کی ہوئی ہزاروں صنائع و بدائع کی آج تک کوئی شرح نہیں لکھی گئی۔ خسرو کی بیش بہا تصانیف نثر کم یاب سے نایاب ہوتی جارہی ہیں مگر اردو میں ان کا کوئی اقتباس بھی نہیں ہے۔ خسرو کی ہندی شاعری تو ایک طرف ان کی فارسی شاعری پر بھی ابھی تک کوئی فاضلانہ مضمون اردو میں نہیں لکھا گیا۔ بے چاری مکتب کی کتاب خالق باری کی شرحیں کون کرتا۔

خسرو کے زمانے میں تدوین کا کام تو شروع ہوگیا تھا لیکن تحقیق کا کام نکتۂ ابتداء کا انتظار کر رہا تھا۔ خالق باری اردو کتاب ہے اور اردو میں تحقیق کی ابتدا خان آرزو متوفی ۱۱۶۹ھ سے ہوتی ہے۔ موصوف نے غرائب اللغات میں خالق باری سے برابر اسناد پیش کئے ہیں۔

خان موصوف کے بعد سے ادبی تاریخ کا مطلع بالکل صاف ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ خالق باری آہستہ آہستہ مکتبوں سے نکل کر ادبی صحبتوں میں

بھی پہونچنے لگی تھی. اساتذہ نے اس سے سندیں لیں. اس کے شعر ضرب المثل بنے. مولوی نذیر احمد نے اس کے نسخے میں تبدیلیاں کیں وغیرہ وغیرہ.

مقبولیت کے اعتبار سے جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے خالق باری اردو کی مقبول ترین کتابوں میں سے ایک ہے. نہ معلوم شیرانی صاحب اس چھوٹی سی کتاب سے اور کیا توقع رکھتے ہیں.

فرہنگ مویدالفضلاء اور خالق باری | شیرانی صاحب کا یہ خیال بھی بے بنیاد ہے کہ خالق باری فرہنگ مویدالفضلاء سے متاثر ہے. خالق باری ۷۲۵ھ سنہ وفات امیر خسرو سے پہلے تصنیف ہوئی اور فرہنگ مویدالفضلاء ۹۲۵ھ میں لکھا گیا. ان دونوں کتابوں میں جہاں بھی یکسانیت ہے اس کا سبب یہی ہو سکتا ہے کہ مویدالفضلاء کے مصنف شیخ محمد لاڈ دہلوی نے امیر خسرو دہلوی سے استفادہ کیا. اس کے برعکس خیال خلاف عقل ہے.

شیرانی صاحب کا خیال ہے کہ تدرو کے غلط معنی کبک «خالق باری» میں بیان ہوئے ہیں. ع

«فارسی سیمرغ و عنقا ہست تدرو کبک ہنس»

فرہنگ مویدالفضلاء نے بھی تدرو کے یہی غلط معنی بتائے ہیں. لہذا خالق باری کا ماخذ مویدالفضلاء ہے.

تدرو اور کبک کی بحث مختصراً اوپر ہوچکی ہے. صاحب مویدالفضلاء نے تدرو کے معنی درّاج بتائے ہیں. لیکن ایک دوسرے فرہنگ اداتالفضلاء کے حوالے سے اس کے معنی کبک بھی نقل کئے ہیں. معلوم یہ ہوتا ہے کہ اداتالفضلاء کے مصنف قاضی بدرالدین محمد دہلوی کو بھی شیرانی صاحب کی طرح خالق باری کے مندرجۂ بالا مصرعے سے غلط فہمی ہوئی اور امیر خسرو کی سند کی بنا پر تدرو کے معنی کبک لکھ دئے. اس غلط فہمی کی وضاحت پچھلے صفحات میں ہوچکی ہے.

۸۲۲ھ میں جب آداتالفضلاء تصنیف ہوا تو خسرو کے انتقال کو صرف ۹۸ سال ہوئے تھے. ان کی شاعرانہ، عالمانہ اور قلندرانہ شخصیت کے اثرات بھرپور دہلی میں موجود ہونگے جن سے مصنف آداتالفضلاء بھی متاثر ہوگا. بات سمجھنے میں غلطی مصنف لغت کی ہوئی لیکن بے چارہ خسرو کی وجہ سے دم نہ مارسکا. اس

زمانے میں شعور لغت بے حد محدود تھا. بمشکل دو ایک ناقص قسم کے لغت لکھے گئے تھے. نتیجہ یہ ہوا کہ آدات‌الفضلاء میں تدرو کبک بن گیا.

غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عہد ادات‌الفضلاء تک تدرو کو کبک سمجھنے کی طفلانہ غلط فہمی پیدا ہونے کا امکان خالق باری کے مذکورۂ بالا مصرعے کے علاوہ کسی دوسری علمی تصنیف سے نہیں ہوسکتا. لغتوں کا سلسلہ خالق باری کے بعد شروع ہوا. آدات‌الفضلاء کی غلط فہمی کا ماخذ قطعاً خالق باری ہے.

شیرانی صاحب نے اس خیال کو ثابت کرنے کی پوری کوشش کی ہے کہ خالق باری بالخصوص مویدالفضلاء سے اور بالعموم اس عہد کے دوسرے لغتوں سے ماخوذ ہے کیونکہ جو اغلاط ان لغات میں ہیں وہی خالق باری میں بھی موجود ہیں. اس ضمن میں موصوف خالق باری کے حسب ذیل اشعار پیش کرتے ہیں.

(۱)

نیا خال ہندی ماموں جان ٭ اور عمو کہئے چچا بکھان

نیا کے معنی بعض ارباب لغت نے صرف نانا یا دادا لکھ کر چھوڑ دئے ہیں. لیکن بیشتر مستند لغتوں نے اس لفظ کے معنی نانا اور دادا کے علاوہ ماموں اور بڑا بھائی بھی لکھے ہیں. یہ معنی مویدالفضلاء ، برہان قاطع اور غیاث‌اللغات میں بحوالۂ برہان، رشیدی ، لطائف ، کشف ، مدار اور زفان موجود ہیں. شیرانی صاحب سوائے نانا اور دادا کے نیا کے تمام دوسرے معنی غیر مستند بتاتے ہیں. ارباب لغت کے اتنے بڑے اجماع سے شیرانی صاحب کا بے دلیل اختلاف قابل غور ہے.

شیرانی صاحب کا خیال ہے کہ خالق باری میں نیا کے معنی ماموں جان مویدالفضلاء سے ماخوذ ہیں. حالانکہ خالق باری میں «نیا خال» کہا گیا ہے جس کے معنی کسی بھی صورت میں سوائے ماموں جان کے کچھ اور نہیں ہوسکتے. خالق باری کا مویدالفضلاء سے استفادہ کرنے کا خیال عقلاً محال ہے.

(۲)

شب چراغ یاقوت رتن ہے ہیرا ہے الماس
اور زمرد پنّا کہے کسوت جان لباس

شیرانی صاحب فرماتے ہیں کہ شب چراغ گاؤ دریائی کا گوہر ہے لہذا جواہر دریائی ہے اور یاقوت جواہر کانی ہے۔ سب چراغ کو یاقوت رتن کا مرادف سمجھنا غلطی ہے۔

شب چراغ کے معنی معین کرنا بہت مشکل ہے۔ توہم پرست ارباب لغت نے اسے کسی مفروضہ گاؤ دریائی کا ٹارچ لمپ اور نہ جانے کیا کیا لکھا ہے۔ جس پر اعتبار کرنا دشوار ہے۔ ادب میں گوہر شب چراغ اور لعل شب چراغ وغیرہ برابر استعمال ہوا ہے۔ مصنف خالق باری نے شاید لعل شب چراغ کی رعایت سے یاقوت کو شب چراغ کا مترادف قرار دیا ہے۔

شیرانی صاحب کا یہ خیال کہ قبل عہد مغل کے ارباب فرہنگ نے شب چراغ کے معنی سمجھنے میں جو غلطی کی ہے خالق باری میں بھی اسی کا عکس نظر آتا ہے نا قابل قبول ہے کیونکہ خالق باری سارے فرہنگوں سے مقدم ہے۔

(۳)

ہندوی پلپل بود فلفل دراز ٭ مرچ فلفل گرد را گویند باز

شیرانی صاحب کے اندازے کے مطابق چونکہ پاپل کے یہی معنی موید الفضلا میں درج ہیں لہذا خالق باری کے معنی موید الفضلا سے ماخوذ ہیں۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہونا چاہئے۔ موخر سے مقدم اخذ نہیں ہوسکتا۔

(۴)

چراغ است دیا فتیل است باتی ٭ بود جد دادا نبیرہ ست ناتی

نبیرہ کے معنی شیرانی صاحب فرزند زادہ قرار دیتے ہیں اور ساتھ ہی موید الفضلاء کے معنی بھی پیش کرتے ہیں جہاں تحریر ہے کہ « اس ملک میں نبیرہ لڑکی کے لڑکے کو کہتے ہیں۔ » پھر ارشاد ہوتا ہے کہ خالق باری میں یہ غلط معنی موید الفضلاء سے آئے ہیں حالانکہ اوپر کے اشعار میں بتایا جا چکا ہے کہ مقدم موخر کے ماخوذ نہیں ہوسکتا۔

جہاں تک نبیرہ کے معنی کا تعلق ہے ارباب لغت نے اس کے معنی نواسا اور پوتا دونوں لکھے ہیں۔ جن میں نواسا عام طور پر رائج ہے۔ فردوسی کہتا ہے۔ ع

ہمانش نبیرہ ہمانش نیا

اردو میں تو نبیرہ کے معنی نواسا ہی ہونگے۔ جیسا کہ موید الفضلاء نے لکھا

ہے کہ اس ملک میں نبیرہ لڑکی کے لڑکے کو کہتے ہیں.

مولوی نذیر احمد صاحب نے بے تخلص شاعر ہونے کے باوجود خالق باری پر اصلاحیں فرمائی ہیں اور نبیرہ کے معنی نواسا بدل کر پوتا لکھ دئے ہیں. میری نظر میں موصوف کا یہ اقدام قابل غور ہے. واضح رہے کہ مولوی صاحب خالق باری کو امیر خسرو کی تصنیف سمجھتے تھے اور اسے خسرو کا کلام مان کر اس پر اصلاحیں دی ہیں. کسی مستند نسخے سے اگر کتاب کی تصحیح کی گئی ہوتی تو اور بات تھی.

خالق باری کے اغلاط | خالق باری تقریباً ساڑھے چھ سو سال سے مکتب کے معلموں اور طالب علموں کے زیر مشق ہے. جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اس چھوٹی سی کتاب میں بیسیوں ناقابل اصلاح غلطیاں سرایت کرگئی ہیں. لفظی اور اور معنوی صحت تو ایک طرف بعض اشعار کو بہ اعتبار وزن موزوں پڑھنا مشکل ہوجاتا ہے. مجھے بشمول نسخۂ شیرانی آج تک خالق باری کا کوئی صحیح نسخہ نہیں مل سکا ہے. لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ غلطیاں ماحولِ مکتب کی ہیں. ان سے مصنف خالق باری کا کوئی تعلق نہیں.

شیرانی صاحب نے خالق باری کی جن غلطیوں کو اچھالا ہے میں ان کی گنتی میں کچھ اور اضافہ کرسکتا ہوں. لیکن اس کے باوجود بھی اس کتاب کو امیر خسرو ہی کی تصنیف کہونگا. مجھے ان مصیبتوں کا اندازہ ہے جو مکتبوں میں کتابوں پر نازل ہوتی ہیں. علی الخصوص جب مختلف شعبہائے زندگی کے مانوس اور نامانوس الفاظ کو دو سو شعر میں کھپانے کی کوشش کی گئی ہے.

شیرانی صاحب کے بیشتر اعتراضات ایسے ہیں جو ایک معمولی سی ترمیم سے از خود درست ہوجاتے ہیں. جیسے :

(۱)

سیرا گھانا کور کانا بھید راز ٭ گرسنہ بھوکا پیاسا تشنہ باز

شیرانی صاحب کا اعتراض ہے کہ کور کا ترجمہ کانا درست نہیں. «کانا» کی جگہ اندھا کردیجئے. وزن میں کوئی فرق نہیں آئے گا.

(۲)

ہرن آہو جانئے آہو بچہ کہئے غزال ٭ بوزنہ بندر خرس ریچھ آمدہ گیدڑ شغال

ہَرن بسکون را پر شیرانی صاحب کو اعتراض ہے۔ اول تو یہ ہندی لفظ ہے اور عہد خسرو میں نہ جانے کیونکر بولا جاتا تھا۔ میری تجویز تو نہیں لیکن فاضل محقق کے لئے ہرن کو ہنا کہا جا سکتا ہے۔ ع

ہنا آہو جانئے آہو بچہ کہئے غزال

(۳)

سمندر رہے آگ میں جیو کیڑا ٭ چو بُعد است دور و چو نزدیک نیڑا

اعتراض ہے کہ بُعد کا ترجمہ «دور» میں «دوری» ہے۔ دور کے بعد کا واؤ یے سے بدل دیجیے۔ ع

چو بُعد است دوری چو نزدیک نیڑا

(۴)

زر بود سونا سیم جیتل نقرہ روپا ٭ جامہ کپّڑ ٹاٹ ٹپڑ ڈبّا کوپا

اعتراض ہے کہ سونا کا «نا» تقطیع سے گرتا ہے۔ مصرع یوں پڑھئے غلطی نکل جائے گی۔ ع

زر بُد سونا سیم جیتل نقرہ روپا

«بد» میں تاّمل ہو تو اس کی جگہ «ہے» پڑھئے وغیرہ وغیرہ۔

شیرانی صاحب کے غلط اعتراضات | شیرانی صاحب نے خالق باری پر جو اعتراضات کئے ہیں ان میں سے بعض درست بھی ہیں۔ لیکن امیر خسرو کے کلام میں تحریف و تصحیف کے تصرفات کو میں پہلے ہی تسلیم کرچکا ہوں جس کے بعد ان اعتراضات کا تعلق امیر خسرو سے نہیں رہتا۔

یہ کہنا قطعاً غلط ہے کہ خالق باری میں چونکہ اغلاط ہیں لہذا یہ امیر خسرو کی تصنیف نہیں ہوسکتی۔ تحریف و تصحیف کے تصرفات کسی تصنیف کا رشتہ اس کے مصنف سے نہیں توڑ سکتے۔ کبیر، تلسی، سور، انیس، میر، فردوسی رومی سب ہی کے کلام میں تحریفات کا دخل ہے۔ کہیں کم اور کہیں زیادہ لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں کہ ان عظیم شعراء کی تصنیفات ان کی نہیں رہیں۔ کبیر کے یہاں تحریفات بحدّ انتہا ہیں۔ لیکن ان کا کلام آج بھی ہندی ادب کا بہترین تحفہ ہے۔

شیرانی صاحب کے اعتراضات پر ایک سرسری نظر ڈالی جاتی ہے جیسے:

(۱)

دست برنجن کنگن کہئے پایل ہے خلخال ٭ پائے برنجن چوڑا کہئے خوبی حسن و جمال

اعتراض ہے کہ چوڑیاں صرف ہاتھ کی ہوتی ہیں پاؤں کی نہیں ہوتی۔ یہ درست نہیں۔ ہاتھ کی طرح پاؤں کی چوڑیاں بھی ہوتی ہیں جن کی ساخت پاؤں کے تمام زیوروں سے مختلف ہے۔

(۲)

کرم شب تاب است کیڑا چمکنا ٭ نبر گویند آتشک اورا بہ دان

اعتراض ہے کہ چمکنا بہ سکون میم غلط ہے۔ میم پر حرکت اور کاف ساکن ہونا چاہئے۔ میم متحرک اور کاف ساکن مصدر میں آئے گا۔ لیکن کرم شب تاب کے معنی دینے کے لئے میم کو ساکن اور کاف کو متحرک ہونا چاہئے۔ جس کے معنی ہوں گے چمکن والا یعنی جگنو۔ اس طرح کے اسم ہندی میں کم ہیں مگر ہیں جیسے: دھونکنی، کترنی، پٹخنی، مرکھنا، کٹ کھنا وغیرہ۔

(۳)

گندم گیہوں نخور چنا شالی ہے دھان ٭ جرت جونری عدس موری برگ ہے پان

جرت کے غلط لفظ پر اعتراض ہے۔ لغت میں لفظ یقیناً ذُرّت یا ذُرت آیا ہے۔ اسے تصحیف کی غلطی یا ساڑھے چھے سو برس کے ہندی لہجے کا پھیر کہنا چاہئے۔ مصنف پر اعتراض کیونکر؟

(۴)

چرخہ رہٹہ غلّہ را یا گیلہ دان ٭ رانڈ بیوہ زال را بوڑھی بخوان

پاگیلہ شیرانی صاحب کو لغت میں نہیں ملا۔ یہی حالت میری بھی ہوئی۔ لیکن خسرو کے زمانے کا ایک ہندی لفظ آج اگر مفقود ہوگیا تو محلّ اعتراض کیونکر پیدا ہوگا۔

(۵)

شبگیر و لیل و شب تو بداں رات رین نس ٭ فانیذ و قند شکّر و گڑ جاں زہر بس

اعتراض ہے «شبگیر کو رات کہنا غلط ہے» شبگیر (وقتِ سحر) بھی رات کا اسی طرح حصہ ہے جیسے اشراق و عصر دن کا حصہ ہیں۔ اگر عصر کو دن کہا جاسکتا ہے تو شبگیر کو رات بھی کہا جاسکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

خاتمہ | اس بحث کو ختم کرتے ہوئے میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ شیرانی مرحوم ایک فاضل اجل اور بالغ نظر محقق تھے. خالق باری کے معاملے میں مجھے ان کے نظریے سے اتفاق نہیں لیکن شیرانی صاحب کی ژرف نگاہی سے انکار نا ممکن ہے. خالق باری پر ان کی تصنیف ایک عالمانہ کتاب ہے جس کا علمی دنیا میں ہمیشہ احترام کیا جائیگا.

جواہر خسروی میں مولانا امین چریا کوٹی نے خالق باری کی فصاحت و بلاغت کے جو قصیدے پڑھے ہیں وہ محض مولانا کی خوش اعتمادی ہے.

خالق باری کی خوبی صرف یہ ہے کہ یہ اپنے انداز کی پہلی کتاب ہے. اس وقت تک ہندی یا فارسی کا کوئی لغت تصنیف نہیں ہوا تھا ان حالات میں بے حد مختصر سہی لیکن ایک منظوم لغت تصنیف کر کے فن فرہنگ نویسی کی رہنمائی کرنا خسرو جیسے عالم اور شاعر کا کام تھا.

نقش اول میں کمی رہجانا یقینی بات ہے اور میں خالق باری کے لئے اس کلیے سے آزاد ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا. لیکن یہ بھی یقینی ہے کہ آج اس کتاب میں جو اغلاط نظر آرہے ہیں مصنف کی ذات ان سے بالا تر ہے.

خسرو کے ہندی کلام سے متعلق تصنیفات | میرے خیال میں خسرو کی ہندی شاعری پر کوئی تحریر یا تصنیف عالمانہ سطح کی نہیں ہے. اس کا سبب کچھ تو اہل قلم حضرات کی اس طرف بے توجہی ہے اور کچھ وجہ یہ بھی ہے کہ اب خسرو کا ہندی کلام تبرک سے بھی کم باقی رہ گیا ہے. پھر اس مختصر تبرک ذخیرے میں نوے فیصدی چیستانیں اور پہیلیاں ہیں. خیر تنقید و تبصرہ کرنے کی بہت کم گنجائش ہے. بہر حال میرے علم میں خسرو کی ہندی شاعری پر جابجا جو کچھ لکھا گیا ہے اس کی ایک اجمالی فہرست درج ذیل کرتا ہوں:

۱ ـ پرانے تذکروں اور تاریخوں میں جہاں خسرو کی ہندی شاعری کا ذکر ہوا ہے ان کے نام یہ ہیں:

منتخب التواریخ (بدایونی) ـ نقل مجلس (رجب علی)

۲ ـ آب حیات (آزاد) میں خسرو کے ہندی کلام کا ذکر پہلی مرتبہ ایک دلکش انداز سے ہوا ہے. لیکن بات کہنے میں محققانہ احتیاط کی جابجا کمی نظر آتی ہے. پھر بھی اگر آزاد کا قلم نہوتا تو خسرو کی ہندی شاعری کے بعض

گوشے شاید کبھی روشنی میں نہ آسکتے۔

۳۔ ڈاکٹر اسپرنگ نے ۱۸۵۴ع میں اودھ کے شاہی کتب خانے کے مخطوطوں کو پیش نظر رکھکر خسرو کی ہندی شاعری پر ایک مقالہ انگریزی میں لکھا جو اب بالکل مفقود ہوچکا ہے۔

۴۔ حیات خسروی (محمد سعید احمد مارہروی) غالباً اس صدی کی ابتدا میں پہلا ایڈیشن نکلا پھر دوسرا ایڈیشن ۱۹۰۹ع میں نولکشور پریس نے شائع کیا، کتاب بہت ضخیم نہیں لیکن اس میں خسرو کی ہندی کے متعلق بڑی مفید اور دلچسپ معلومات موجود ہے۔

۵۔ حیات خسرو (مولوی شبلی) پر از معلومات کتاب ہے۔ خسرو کی ہندی شاعری پر بھی اجمالی گفتگو کی ہے۔ کتاب کا معیار یقیناً شبلی کی سطح سے پست ہے۔ علی الخصوص وہ حصہ جہاں مولانا نے خسرو کی موسیقی کا ذکر کیا ہے۔

۶۔ سترھویں نامہ (شہزادۂ قدسی نظامی بھوپالی) یہ خسرو کے عرس سے متعلق ایک مختصر کتاب ہے جس میں چند صفحہ ان کی ہندی شاعری کو بھی دئے گئے ہیں۔ ادبیت سے زیادہ کتاب میں عقیدت ہے۔ ۱۳۳۱ھ میں میرٹھ سے شائع ہوئی۔

۷۔ جواہر خسروی (رشید احمد سالم اور مولانا امین چریا کوٹی) خسرو پر آج تک جتنی کتابیں نکلی ہیں ان میں سب سے زیادہ اہتمام اور مصارف سے یہی کتاب شائع کی گئی ہے۔ لیکن اس میں بیس فیصدی سے بھی کم خسرو ہیں۔ اور آسی فیصدی سے زیادہ مولانا امین چریا کوٹی کی خارج از موضوع غیر متوازن خامہ فرسائی ہے ۱۹۱۸ع میں یہ کتاب علی گڈھ سے شائع ہوئی۔ اس میں امیر خسرو کے حسب ذیل مطبوعہ و غیر مطبوعہ منظوم رسالے شامل ہیں:

۱۔ نصاب بدیعی فارسی
۲۔ نظم گھڑیال، فارسی مشکوک
۳۔ رباعیات پیشہ وران، فارسی (غیر مطبوعہ) مشکوک
۴۔ خالق باری (ہندی) (مطبوعہ)
۵۔ چیستانیں (ہندی) (مطبوعہ)
۶۔ " (فارسی)

۸ ـ ڈاکٹر وحید مرزا کا انگریزی مضمون «امیر خسرو کی ہندی شاعری» ۱۹۳۳ ع میں ادارۂ معارف اسلامیہ کے جلسۂ لاہور کی رویداد کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ مضمون میں کوئی خاص گہرائی نہیں. لیکن خسرو کی ہندی شاعری سے متعلق منتشر معلومات کا ایک خاصہ قصہ یکجا کردیا گیا ہے۔

۹ ـ امیر خسرو (ڈاکٹر وحید مرزا) یہ اردو میں خسرو پر سب سے جامع اور بڑی کتاب ہے جسے ہندوستانی اکیڈمی الہ‌آباد نے ۱۹۴۹ ع میں شائع کیا. اس میں خسرو کے ہندی کلام پر بھی بحث کی گئی ہے. جس میں کم و بیش وہ سب نکات آگئے ہیں جو مصنف کے انگریزی مضمون میں تھے. یہ کتاب کئی اعتبار سے خسرو پر حرف آخر کی حیثیت رکھتی ہے۔

۱۰ ـ امیر خسرو (ادارۂ تعلیم و ترقی مکتبۂ جامعہ دھلی) یہ ایک چھوٹا سا رسالہ بچوں کے لئے نکالا گیا. جس میں امیر خسرو کا ہندی کلام بھی ہے۔

۱۱ـ خسرو کی ہندی کویتا (برج رتن داس) ہندی میں یہ ایک چھوٹی سی کتاب ہے جسے کاشی ناگری پرچارنی سبھا نے ۱۹۵۳ ع میں شائع کیا. اس میں ایک ناقابل ذکر چھوٹے سے مقدمے کے ساتھ خسرو کا ہندی کلام شائع کیا گیا ہے۔

نوٹ :- پروفیسر شیرانی مرحوم نے ۱۹۲۸ ع میں «پنجاب میں اردو» لکھتے وقت ہی اس شک کا کہ وہ خالق باری کو امیر خسرو کی تصنیف نہیں سمجھتے اظہار کیا تھا اور نسخہ حفظ‌اللسان کی دریافت کے بعد نہ صرف ان کا شک یقین سے بدل گیا تھا بلکہ یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ یہ مسئلہ آخری طور پر طے ہوگیا ہے. لیکن ہمارے یہاں اب بھی ایسے بعض بزرگ موجود ہیں جو اسے امیر خسرو کی تصنیف سمجھتے ہیں. انھیں میں جناب ڈاکٹر صفدر آہ بھی ہیں. اگر کوئی صاحب اس سلسلہ میں علمی حیثیت سے لکھنا چاہیں تو نوائے ادب کے صفحات ان کے لئے حاضر ہیں. (ایڈیٹر)

*

* سید شہاب الدین دسنوی

اردو ٹائپ میں تلفظ کا مسئلہ : ایک نئی تجویز

اردو طباعت میں ٹائپ کا مسئلہ ابھی تک ایسی منزل پر ہے جہاں بسا اوقات وہ لوگ بھی جو اس طریقے کے موئد اور اس کی ترویج و اشاعت کے خواہشمند ہیں، اس کی افادئت پر شبہہ کرنے لگتے ہیں۔ ان کا ایسا کرنا غلط بھی نہیں ہے کیونکہ ٹائپ کو ترقی دینے کے لئے جتنی توجہ دینی چاہئے تھی اتنی دی نہیں گئی۔ ایسا کوئی ادارہ نہیں جہاں لوگ اردو طباعت کے مسئلوں پر غور کرسکیں جہاں ایسے ماہرین جمع ہوسکیں جو ٹائپ بنانے، ڈھالنے اور ڈیزائن کرنے کے طریقے جانتے ہوں، جو کمپوزنگ (دستی یا میکانکی) کے اصول سے واقف ہوں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جہاں لوگوں کو تجربے کرنے کی سہولتیں میسر ہوں۔ ٹائپ کے مسائل صرف آرام کرسی پر بیٹھ کر سوچنے اور غور کرنے سے حل نہیں کئے جاسکتے ہیں۔ مختلف پوائنٹ کے (خفی و جلی) حروف اور مختلف صورتوں (Faces) کے ابھی ایسے ٹائپ تیار کرنے ہیں جنھیں ہم ایک ساتھ اور بیک وقت آسانی سے استعمال کرسکیں۔ جوڑوں کو کم کرنے کی بھی کوشش جاری رہنی چاہئے۔ ٹائپ کو خوبصورت اور پائدار بھی بنانا ہے۔ اعراب و اعلام اس ڈھنگ سے بنائے جائیں کہ طباعت میں دقتیں پیدا نہ ہوں اور تلفظ بھی صحیح ادا ہوسکے۔ یہ سب باتیں ایسی ہیں جو نہ کانفرنسوں یا جلسوں میں طئے کی جاسکتی ہیں اور جو نہ انفرادی حیثیت سے حل ہوسکتی ہیں۔

اعراب اور علامتوں کا تعلق براہ راست الفاظ کے تلفظ سے ہوتا ہے۔ یہ بلا شبہہ اردو کی بنیادی خوبی ہے کہ اس کی تحریر اعراب اور علامتوں کے بغیر آسانی سے پڑھی جاتی ہے۔ ہم اسے بنیادی خوبی اس لئے کہتے ہیں کہ اعراب کا لگانا لازمی ہوجائے تو اردو کا لکھنا اور چھاپنا اتنا دشوار ہوجائے گا کہ لوگ شائد اس رسم خط کو چھوڑ دینا ہی بہتر سمجھنے لگیں گے۔ لیکن اس خوبی کا یہ

* پرنسپل ایم۔ ایچ۔ صابو صدیق پالی ٹکنک، بمبئی ۸

مطلب بھی نہیں کہ اعراب اور علامتوں کے مسئلے پر دھیان ہی نہ دیا جائے۔ دن به دن اردو رسالوں اور کتابوں کے لئے ٹائپ کا رواج بڑھتا جارہا ہے اس لئے یہ مسئلہ بھی اہم ہوتا جارہا ہے کیونکہ جہاں کہیں چند الفاظ پر بھی اعراب یا علامتیں لگانے کی ضرورت پیش آتی ہے وہاں «ہر سطر کے بعد، یا جہاں ضرورت ہو ایک زائد سطر چھوڑنی پڑتی ہے۔ اس طرح بین السطور زائد یا بے قاعدہ ہوجاتا ہے اور صفحہ میں مضمون کی سمائی اور بھی کم رہ جاتی ہے»۔[1] اس کے علاوہ ایک اور دقت پیدا ہوتی ہے اور وہ یہ کہ: «طریق طباعت، کتابت والی چھپائی سے زیادہ سست رفتار ہوتا ہے»[2]

یہ دونوں بڑے اہم اعتراضات ہیں جنھیں دور نہ کیا گیا تو یقیناً ٹائپ کی ترویج میں دشواریاں حائل ہوجائیں گی۔ لیکن اس کے بارے میں کچھ اور لکھنے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان اعتراضات کی تھوڑی سی وضاحت کردی جائے۔

«نوائے ادب» کے اس شمارے کا صفحہ ۱۲ طباعت کے لحاظ سے ٹھوس مواد کا (solid matter) کا صفحہ ہے جس پر ۲۷ سطریں درج ہیں۔ سطروں کے درمیان تین پوائنٹ جگہ (بین السطور) چھوڑی گئی ہے۔ اس صفحہ پر کوئی ایسا لفظ نظر نہیں آئے گا جس میں حروف کے درمیان میں اعراب یا علامت کا استعمال ہوا ہو۔ اب ایک ایسے مضمون کی عبارت نیچے درج کی جاتی ہے جس میں املا اور تلفظ کی ضرورتوں کے لحاظ سے بعض لفظوں پر اعراب کا لگانا ناگزیر ہوگیا ہے اور جن کے بغیر مضمون کا مقصد بیان کرنا دشوار ہوجائے گا:

«بیسیوں الفاظ ہیں جو عام طور سے غلط بولے جاتے ہیں، لفظ مَحَبَّتْ کا تلفظ بعض لوگ مُحَبَّتْ بھی کرتے ہیں۔ اسی طرح «مروت» میں میم مضموم ہے لیکن اس کا تلفظ عام طور سے بہ فتح ادا کیا جاتا ہے، حالانکہ یہ بھی غلط ہے۔ اس کی ہجا کی رو سے اس میں «ر» کو مضموم ہونا چاہئے کیونکہ اصل ہجا مُرُوْءَت (تلفظ بر وزن حکومت) ہے۔ چونکہ عربی میں کہیں ہمزہ کو واؤ سے بدل دینا جائز قرار دیا گیا ہے، لہٰذا مُرُوَّت تو جائز ہے مگر مُرَوَّت درست نہیں»۔

---

۱ ـ اردو نامہ، کراچی، جولائی ۱۹۶۱ ۲ ـ ایضاً

اس عبارت میں پانچ لفظ ایسے آئے ہیں جن پر اعراب لگائے گئے ہیں کیونکہ نفس مضمون کی خاطر یہ ضروری تھا مگر نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی سطروں کے لئے تین پوائنٹ کے بجائے بین السطور پانچ پوائنٹ جگہ چھوڑنی پڑی جس کا اثر اس صفحہ کے حسن طباعت پر برا پڑا. سطروں کے مابین یکساں جگہ نہ چھوڑنے سے پورے صفحہ کی طباعت بگڑ گئی اور اگر کہیں یکسانیت کی خاطر پورے صفحہ پر بین السطور پانچ پوائنٹ کی جگہ چھوڑی جاتی تو بہت سی جگہ ضائع ہوجاتی.

بہ ظاہر لیتھو کی طباعت کے طریقہ میں یہ کمزوری نظر نہیں آتی ہے. کیونکہ کاتب لفظوں پر اعراب اور علامتیں اس طرح لگا سکتے ہیں کہ وہ سب زائد جگہ لئے بغیر کھپ سکیں لیکن عملی طور پر اس میں بھی دقتیں پیش آتی ہیں. مثلاً عِلم لکھنا ہو تو جزم اس طرح لگایا جاتا ہے کہ اندازہ نہیں ہوتا ہے کہ جزم « ل » پر ہے یا « م » پر. کتابت میں اعرب یا علامتوں کا قطعی طور پر ان کے معیّن مقام ہی پر رکھنا بے حد دشوار ہوتا ہے. ایسی ناقابل اعتبار صورت حال کے پیش نظر لغت نویسوں نے دوسرے طریقے سے کام لیا یعنی انھوں نے اعراب کو الفاظ میں ادا کرنے کی کوشش کی لیکن یہ التزام زیادہ تر انھی حروف کی آوازوں تک محدود رہا جن کے بارے میں شبہ ہوسکتا ہے مثلاً:

مدّعا — بضمّ میم و تشدید دال مفتوح (قاموس الاغلاط)

مَشاطه — بالفتح و تشدید شین .... عوام (بضمّ میم و بہ تخفیف تشدید مشاطه کہتے ہیں) (ایضاً)

مَعنون — (بوزن سُبرَہن ، مذبذب) عنوان (بالکسر و بالضم) کے معنی میں (ایضاً)

ارغنون — بالفتح اور فتح سوم (جامع اللغات)

اصل — بالفتح (نوراللغات)

تہمت — بالضم و فتح دوم (بہار عجم)

خلوت — بالفتح (ایضاً)

مضامین اور مقالوں میں بھی تلفظ بتانے کے لئے اکثر یہی طریقہ استعمال کیا جاتا رہا ہے. چنانچہ نمونے کے طور پر جو عبارت اوپر درج کی گئی اس میں بھی یہی التزام رکھا گیا پھر بھی اعراب و اعلام کی ضرورت باقی رہی ورنہ

صحیح طریقہ یہ ہوگا کہ ہر حرف کی حرکت کا لحاظ رکھتے ہوئے تلفظ لفظوں کے ذریعہ بتایا جائے اور اگر ایسا کیا جائے تو صورت یہ ہوجائے گی :

محبّت	میم بالفتح ، حا بالفتح ، با مشدد و بالفتح اور تا بہ سکون .
اصطبل	بکسر الف و سکون صاد و فتح طا و سکون با و لام (نور اللغات)
اسطرلاب	بضم اول و ثالث و لام بالف کشیدہ بہائے ابجد زدہ (برہان قاطع)
اصلیت	فت ا ، سکن ص ، کس ل ، فت ی بشد (نمونہ لغات اردو ، شائع کردہ اردو ترقی بورڈ ، کراچی)

یہ صورتیں کافی قبیح ہیں جو نہ پہلے مقبول ہوسکیں اور نہ جنکی آئندہ ہونے کی امید ہے .

ٹائپ میں اعراب لگانے کی جس دقت کا ذکر پہلے کیا جاچکا ہے اس کے پیش نظر ایک طریقہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حروف پر کشیدہ لگا کر اعراب لگائے جائیں. اس طرح ہم اپنی عبارت یوں چھاپ سکتے ہیں : لفظ "مَـحَـبَّـتْ" کا تلفظ بعض لوگ "مُـحَـبَّـتْ" بھی کرتے ہیں.....» « یا رَبِّ الْـعٰـلَـمِـیْـنَ » اس طریقے سے بین السطور جگہ نہ تو زائد ہوتی ہے نہ بے قاعدہ لیکن کمپوزنگ کی دشواری کے علاوہ دوسرا عیب پیدا ہوجاتا ہے یعنی لفظوں کا بے ڈھنگا پن .

اردو تحریر میں ہجا کے علاوہ جہاں تک تلفظ کا تعلق ہے ایک اور اہم سوال پیدا ہوتا ہے . کیا ہمارے مروّجہ اعراب و اعلام ، حروف کی ان تمام حرکتوں کو ادا کرنے کی قدرت رکھتے ہیں جو بولنے میں مستعمل ہیں؟ ہندی ، انگریزی اور دوسری زبانوں کے کتنے ہی الفاظ اردو میں داخل ہوتے جا رہے ہیں ، کتنے ہی غیر مانوس نام استعمال میں آرہے ہیں ، ان سب کا صحیح تلفظ ادا کرنا دشوار ہوتا جارہا ہے . یہ درست ہے کہ ماضی میں اسی قسم کی دشواریوں کو حل کرنے کی خاطر اردو اعلام میں کچھ اضافہ کیا بھی گیا ہے مثلاً واؤ معروف یا واؤ معدولہ یا یائے معروف وغیرہ کے لئے کچھ نئی علامتیں مقرر کی گئیں لیکن اب تک ان کے نام بھی نہ طے ہوسکے ہیں. ہم ان کو حروف پر (۶) یا (۸) وغیرہ نشان لگا کر پہچانتے ہیں. یہ نشانیاں انجمن ترقی اردو اور دوسرے اداروں کی مطبوعات کے ذریعہ

ایک حد تک مقبول بھی ہوچکی ہیں. لیکن یہ بھی ہماری ضرورتوں کو پورا نہیں کر پاتی ہیں مثلاً :

«بہتر، مہر، مہتر» کو صرف کسرہ سے ادا کیا جائے تو «بِجلی»، «بستر» کو کیسے لکھا جائے؟

انگریزی لفظ Bed room یا Red Indian کیسے لکھا جائے؟

«کیا» (کرنا سے) اور «کیا؟» (سوالیہ) میں کیسے فرق کیا جائے؟

«پردہ» بالفتح لکھا جائے تو «پہلا» کیسے لکھا جائے؟

«عہدہ» اور «عمدہ» میں کیسے فرق کیا جائے؟

ان حالات کے پیش نظر یہ اعتراض درست ہوجاتا ہے کہ اردو لغت چھاپنی ہو یا لغت سے متعلق کوئی مضمون لکھنا ہو یا کسی اور سبب سے ایک لفظ کے ہر حرف کی حرکت بتانی مقصود ہو تو ٹائپ کا طریقۂ طباعت دشواری پیدا کرے گا اور لفظوں کے ذریعہ تلفظ بتانے کی صورت مقبول نہیں ہوگی اور یوں بھی مروّجہ علامتیں ناکافی ثابت ہوں گی[1]۔

صورت حال پر غور کرکے راقم السطور نے ایک حل پیش کرنے کی جرأت کی ہے. اس کی تفصیل نیچے درج ہے لیکن اس سے پہلے ایک کلیہ بیان کردینا مناسب ہوگا. کسی زبان میں اعراب، علامتیں یا حرف علت اسی مناسبت سے پائے جاتے ہیں جس سے اس مخصوص زبان کی مخصوص آوازوں کو ادا کرنے میں مدد ملتی ہے. یہ ممکن نہیں کہ دنیا کی کوئی ایک زبان کسی دوسری زبان کے سب لفظوں کو صحیح مخارج اور آوازوں کے سارے اتار چڑھاؤ کے انداز کو ادا کرنے میں کامیاب ہو[2]۔. جیسے جیسے زبان میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور اس کا دامن دوسری زبانوں کے الفاظ کے لئے پھیلتا جاتا ہے ویسے ویسے اس میں نئی علامتوں کی ضرورت بڑھتی جاتی ہے. اردو کے لئے وقتاً فوقتاً اس طرف کچھ توجہ کی گئی ہے، نئی علامتیں تجویز کی گئیں، نئے اصول مرتب ہوئے مگر سوائے چند اصولوں کے، باقی میں نہ تو کوئی باقاعدگی آسکی اور نہ پابندی کے ساتھ ان

---

۱ ـ ملاحظہ ہو اردو نامہ، کراچی جولائی ۱۹۶۱

۲ ـ دیوناگری کا یہ دعوی کہ وہ مکمل طور پر صوتی رسم الخط ہے، بے بنیاد ہے. اور تو اور دیوناگری رسم الخط سنسکرت تک کے لفظوں کی ساری آوازوں کو صحیح طور پر ادا کرنے سے قاصر ہے.

پر عمل کیا گیا۔

غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اردو میں تلفظ کی چودہ آوازیں ہیں۔[۱] جن کے لئے تین حروف علت (ا، و، ے) چار اعراب (زبر، زیر، پیش اور مد) جزم اور اس کے علاوہ تین نئی علامتیں (‛، ^، ٓ) استعمال کی جاتی ہیں۔ اور ان سے جو دقتیں ٹائپ کی طباعت میں پیدا ہوتی ہیں ان کی تفصیل اوپر بیان کی جاچکی ہے۔ راقم کی تجویز ہے کہ چودہ آوازوں کے لئے بین‌الاقوامی صوتی انجمن[۲] کی تجویز کردہ نشانیاں (symbols) لے کر اپنے رسم خط میں شامل کرلیا جائے۔ اور ان کی مدد سے اردو کے لفظوں میں حروف کے حرکات ادا کئے جائیں۔ یہ نشانیاں (جن میں بعض ترمیم شدہ ہیں)، اردو کی مترادف آوازیں، اور ان کی مثالیں تجویز کے مطابق حسب ذیل ہیں:

سلسلہ	آواز (اردو)	مجوزہ نشانی	مثال
۱	آ	a	آم
۲	اَ	ə	اجمل
۳	اِ (نصف)	i	اِنصاف
۴	اِ (اوسط)	e	مہتر
۵	ای (کشیدہ)	ė	ایمان (یائے معروف)
۶	اے (کشیدہ)	ā	ایک، دیر، سیب (یائے مجہول)
۷	اے (کشیدہ)	ä	سیر، پیر (یائے لین)
۸	اے (اوسط)	â	پہلا، محفل
۹	اُ (خفیف)	u	اُجلا
۱۰	او (کشیدہ)	ū	اون، نور (واؤ معروف)
۱۱	اُ (اوسط)	û	دوپٹہ، عہدہ
۱۲	او (کشیدہ)	o	روز، زور (واؤ مجہول)
۱۳	او (کشیدہ)	ô	عورت (واؤ لین)
۱۴	آئے	æ	اِفشاء

---

۱ - ملاحظہ ہو جان شیکسپئر کی ہندوستانی انگلش ڈکشنری کے تمہیدی صفحات

۲ - IPA یعنی International Phonetic Association

ان میں سلسلہ نمبر ۱ ، ۲ ، ۳ ، ۴ ، ۹ اور ۱۲ وہی نشانیاں ہیں جو IPA نے انہی مقصد کے لئے استعمال کی ہیں . باقی نشانیاں .عام طور سے انگریزی ڈکشنری میں استعمال ہوتی ہیں .

مذکورہ نشانیوں کے ساتھ یہ اصول بھی سامنے رکھے جائیں :

(الف) لفظ کا ہر حرف الگ الگ لکھا جائے

(ب) ہر رکن تہجی (syllable) کو علاحدہ کرنے کے لئے (،) استعمال کیا جائے

(ج) مرکب الفاظ کو علاحدہ کرنے کے لئے (ـ) استعمال کیا جائے

(د) آدھی آواز کے آگے (:) لگایا جائے

(ہ) ہمزہ کی جگہ الف استعمال کیا جائے

مجوزہ نشانیوں کی مدد سے اور مذکورہ اصولوں کے تحت الفاظ یوں لکھے جا سکتے ہیں :

قلیل	ق e ، ل é ل	قلیہ	ق ə ل ، ے a
قلم	ق ə ، ل ə م	قلمانا	ق ə ل ، م a ، ن a
عَلم	ع ə ، ل ɔ م	عِلم	ع i ل م
کِتاب	ک i ، ت a ب	کتنا	ک i ت ، ن a
کیا	ک i ، ے a	کیا	ک e ، ے a
بیڈروم	ب e ڈ ـ ر ū م	ریڈ انڈین	ر e ڈ ـ ا i ن ، ڈ i ، ا ə ن
میخانہ	م ä ، خ a ، ن a	تئیں	ت ə : ا i ں
محقق	م u ، ح ə ق ، ق i ق	پیار	پ e : ے a ر
عہدہ	ع û ہ ، د a	اوٹلا	ا o ٹ ، ل a
محفل	م â ح ، ف i ل	تیاگ	ت ə : ے a گ
اولاد	ا ô ، ل a د	سواگت	س o : ا a ، گ ə ت
اسطرلاب	ا u س ، ط u ر ، ل a ب	برف	ب ə رف
دائم المریض	د a ، ا e ، م u ل ، م ə ، ر é ض		
المسجد الاخضر	ا ə ل ، م ə س ، ج i ، د u ل ـ ا ə خ ، ض ə ر		

جیلر ج ā ، ل ə ر تبصرہ ت ə ب ، ص ə ، ر a

مذکورہ بالا طریقۂ کار کے اثرات بالخصوص اردو ٹائپ کی طباعت پر اس طرح ہوں گے :

(۱) یہ نشانیاں انگریزی میں (accented letters) کے طور پر مستعمل ہیں اس لئے ان کا حاصل کرنا بہت آسان ہے ، نئے حروف یا نئے ڈیزائن یا میٹرس (matrix) بنانے کا سوال نہیں پیدا ہوگا .

(۲) ان نشانیوں کو اردو ٹائپ کی کمپوزنگ میں ہم آہنگ کرنا آسان ہوگا . اگر اردو ٹائپ ۱۸ پوائنٹ کا ہے تو ۱۰ پوائنٹ کے انگریزی (accented letters) ۱۸ پوائنٹ کی باڈی پر ڈھالے جاسکتے ہیں تاکہ (justification) کی دقت باقی نہ رہے .

(۳) لغت چھاپنے میں یا تلفظ ادا کرنے کی خاطر اعراب و اعلام کی بہ نسبت یہ طریقہ زیادہ موثر ہوگا .

(۴) طباعت میں بین السطور کی زائد جگہ ، یا بے قاعدگی کا سوال پیدا نہ ہوگا .

(۵) رفتار زمانہ کے ساتھ رومن رسم الخط بھی عام ہوتا جارہا ہے جس سے معمولی پڑھا لکھا انسان بھی آشنا ہوتا جاتا ہے اس لئے یہ نشانیاں غیر مانوس نہیں ہوں گی .

(۶) نصف آوازوں کی ادائیگی کے لئے یہ طریقہ بہت مناسب ہوگا .

(۷) اس سے ہر رکن تہجی الگ کیا جاتا ہے جس سے تلفظ معلوم کرنے میں آسانی ہوتی ہے .

(۸) اردو کو رومن رسم الخط میں لکھنے کے لئے بھی یہی نشانیاں استعمال کی جاسکتی ہیں . صرف مخصوص آوازوں کے لئے حروف صحیح میں ترمیم کرنی پڑے گی .

اس طریقۂ کار سے لغت کو ٹائپ میں چھاپنے میں کتنی سہولت ہوگی اور لغت استعمال کرنے والوں کو جو آسانی ہوگی وہ اگلے صفحہ پر دئیے ہوئے نمونے سے ظاہر ہوگی . نمونے کا یہ صفحہ نور اللغات سے لیا گیا ہے . الفاظ کی سطریں لغت کا لفظ اور مجوزہ نشانیوں میں ادا کیا ہوا اس کا تلفظ ۱۸ پوائنٹ میں اور معنی ۱۲ پوائنٹ میں کمپوز کیا گیا ہے .

براق [ب ə، ر a ق]
۱۔ بہشت کا گھوڑا (مجازاً) گھوڑا، ۲۔ (اردو؛ وہ تعزیہ جسکا دھڑ گھوڑے کی شکل کا اور چہرا انسان کا سا بناتے ہیں)

براق [ب u ر، ر a ق] ع. صفت
۱۔ چمکیلا۔ ۲۔ چالاک، ہوشیار، مشاق، تیز ذہن۔
۳۔ نہایت سفید ۴۔ تیزرو

براقی [ب، u ر a ق é] م.
چمک دمک

برا [ب ə، ر a] جانا (عم)
ٹال جانا

برامکہ [ب ɔ، ر a م، ک ə] ع. جمع برمک کی
برمک بلخ کے آتشکدہ میں آگ جلانے پر ملازم تھا۔ بعدہ مسلمان ہوکر بغداد آیا اور اس کا بیٹا خالد، خلیفہ منصور بن سفاح کا وزیر ہوگیا اور اس کے بعد خالد کا بیٹا اور پوتے وزیر ہوتے رہے: ان لوگوں کو برامکہ کہتے ہیں لیکن اس سبب سے کہ یحیی بن خالد اور اس کے دونوں بیٹے فضل و جعفر فیاضی و سخاوت میں شہرۂ آفاق ہیں اکثر اس لفظ سے امرائے ذیشان اور سخاوت‌پیشہ مراد ہوتے ہیں۔

برانچ [ب ر a ن چ] انگ ـ م.
شاخ، شعبہ، ــ اسکول؛ (م) وہ مدرسہ جو کسی دوسرے مدرسہ کا ماتحت ہو؛ ــ پوسٹ آفس؛ وہ ڈاک خانہ جو بڑے ڈاک خانہ کی شاخ ہو، ــ پوسٹ ماسٹر: وہ ڈاک کے محکمے کا افسر جس کے چارج میں برانچ آفس ہو (انگریزی branch)

برانڈہ [ب ر a ن، ڈ a] ھ. م. عم
برآمدہ (انگریزی verandah)

برانڈی [ب ر a ن، ڈ é] انگ. م.
۱۔ ایک خاص قسم کی تیز شراب (انگریزی brandy)
۲۔ (اردو): اوپر پہننے کا موٹاکوٹ۔

براوا دینا [ب، u ر a، و a] عو.
حیلہ بہانا کرنا، ٹالم ٹول کرنا، دم جھانسا دینا۔

براہمہ [ب ə، ر a، ہ م: ə] ع.
برہمن کی جمع (دیکھو برہمن)

براہین [ب u، ر a ہ، é ن] م. برہان کی جمع
دلیلیں

براہی [ب ə، ر a، ہ é] ھ. م
چھوٹی قسم کا گنا، ایکھ۔

اس نمونے کے مطابق ٹائپ میں لغت چھاپی جائے تو ضرورت کے مطابق جگہ جگہ بلاک کی تصویروں کے ذریعہ معنی کی وضاحت بھی کی جاسکے گی جو اس وقت لیتھو کے ذریعہ دشوار ہے۔

آخر میں یہ بات بھی صاف ہوجائے کہ راقم کی تجویز کا مقصد یہ نہیں کہ اعراب و اعلام سرے سے ختم ہی کردئے جائیں اور اردو رسم تحریر میں اس کا استعمال ہی نہ ہو۔ جب تک لیتھو کی چھپائی کا رواج ہے کاتب یقیناً مروجہ طریقے ہی کو اختیار کریں گے اور اسی میں سہولت بھی ہے۔ جو چیز ٹائپ میں چھپے گی اس میں بھی عام طور سے اِس، اُس، اِنہیں اُنہیں، دِل، دَل، بُراق، تَرّقی وغیرہ جیسے الفاظ میں آسانی کے ساتھ ضروری اعراب لگائے جاسکتے ہیں

اور چونکہ ان میں اعراب لفظ کے شروع یا آخر یا کسی ٹکڑے کے شروع یا آخر میں آتے ہیں کمپوزنگ کی دقت نہیں ہوگی. البتہ جہاں لغت یا پورے لفظ کا تلفظ بیان کرنا ہو (بالخصوص لغت نویسی میں) وہاں راقم کی تجویز مفید ثابت ہوگی اور اس کے ساتھ ٹائپ کی طباعت پر جو اعتراض اور جن پیچیدگیوں کا ذکر «اردو نامہ»، کراچی کے حوالے سے مضمون کی ابتدائی حصہ میں کیا گیا وہ پیدا نہیں ہوں گی.

ماسٹر رام چندر

اور

اردو نثر کے ارتقاء میں ان کا حصہ

مولفہ

ڈاکٹر سیدہ جعفر

قیمت : ٣ روپے ٥٠ نئے پیسے

ابو الکلام آزاد اورئنٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

حیدر آباد (آندھرا پردیش)

تبصرے

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں)

ISLAM AND THE WORLD.
By Abul Hasan Ali Nadvi,
Translated by Mohamed Asif Qidwai, p.p. 196

قیمت: چار روپے، ملنے کا پتہ: القادر، ناشران کتب اسلامی
٤١، امپریس روڈ، لاہور، پاکستان

مولانا ابو الحسن علی ندوی، موجودہ عہد کے ان اسلامی مشاہیر میں ہیں جن کی مخلصانہ کوششیں ہندوستان کے تعلیمی گوشہ سے نکل کر، اسلامی دنیا کے علمی، تحقیقی، تبلیغی اور اصلاحی میدانوں تک موثر حیثیت سے پھیل چکی ہیں. ان کے مقالے اور تصانیف خاص غور و فکر کی نظر سے پڑھی جاتی ہیں. ان کی انہی فکر زا کتابوں میں ان کی زیر تبصرہ کتاب بھی ہے، یہ کتاب مسلمانوں کی مذہبی زبان عربی کی وسعت کے لحاظ سے ابتداً اسی زبان میں ١٩٥٠ ع میں لکھی گئی تھی پھر اس کی افادیت کی تعمیم کے پیش نظر ١٩٥٤ ع میں اس کا اردو ترجمہ شائع کیا گیا، لیکن اس خیال سے اس کتاب تک رسائی کا دائرہ بہت زیادہ وسیع ہو، ہمارے ملک کے مخلص مصنف جناب محمد آصف قدوائی، ایم. اے. پی. ایچ. ڈی. نے اس کا ترجمہ انگریزی میں کیا ہے. کسی زبان میں تصنیف سے ترجمہ کا کام زیادہ مشکل ہے، اس لئے کہ اس میں ایک زبان کی جگہ دو زبانوں پر کامل عبور کی ضرورت ہے. ڈاکٹر قدوائی کا ترجمہ اور مقالات سیرۃ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ دونوں زبانوں پر قدرت رکھتے ہیں. ضرورت ہے کہ اس انگریزی ترجمہ کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی جائے تاکہ یہ معلوم ہو کہ اسلام نے اپنے عروج و قوت کے زمانے میں دنیا کے لئے کیا نعمتیں اور برکتیں مہیا کیں اور اس کے زوال نے خود دنیا کو کتنی لعنتوں اور ہلاکتوں سے قریب تر کردیا ہے. اس کے ناشر پاکستان کے ناشران کتب اسلامی، القادر لاہور ہیں. کتابت کی طباعت صاف اور کاغذ اچھا ہے. (ن)

ماسٹر رام چندر اور اردو نثر کے ارتقاء میں ان کا حصہ

مولفہ: ڈاکٹر سیدہ جعفر

صفحات: ۲۱۴ قیمت: ۳ روپئے ۵۰ نئے پیسے

ملنے کا پتہ: ابوالکلام آزاد اورئنٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ خیرت آباد حیدر آباد ۴

یوں تو موجودہ اردو نثر کی ابتداء انیسویں صدی کے کچھ پیچھلے سے ہی شروع ہوگئی تھی اور سنہ ۱۸۵۷ ع تک اس نے خاصی ترقی کرلی تھی، لیکن اگر یہ سوال کیا جائے کہ وہ سب سے پہلی کون سی قابل احترام ہستی تھی جس نے علوم جدیدہ، ریاضی، صحافت، مضمون نگاری کو اپنی ذات میں جمع کرلیا تھا، جو جذبۂ اصلاح و ترقی سے اتنا سرشار تھا کہ بڑی سے بڑی مخالفت بھی اس کو روک نہیں سکتی تھی تو اس کا جواب ایک اور صرف ایک نام ہوگا اور وہ ماسٹر رام چندر کا۔

افسوس کہ ایسی لائق احترام اور قابل مطالعہ ہستی پر اردو میں کوئی خاص کام نہیں ہوا تھا۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے پہلی مرتبہ غائر مطالعہ و تحقیق کے بعد نہ صرف ان کے حالات لکھے، ان کے کارناموں کو ناقدانہ نظر سے پیش کیا، اردو نثر میں ان کا مقام و اہمیت بتائی، ان کے حالات و تصانیف کے سلسلہ میں جو غلط فہمیاں تھیں دور کیں بلکہ ہر موضوع پر ان کے مضامین کا انتخاب دے کر ان کے متنوع کارناموں سے واقف ہونے کا بھی موقع دیا۔ اردو کی تاریخ ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ کتاب یقیناً قابل مطالعہ ہے۔

اردو املا

مولفہ: غلام رسول

صفحات: ۶۵ قیمت: ۵۰ نئے پیسے

ملنے کا پتہ: ادارۂ ادبیات اردو، حیدر آباد (اے۔ پی)

اس رسالے کے ابتدا میں مولف لکھتے ہیں ہماری زبان کا خط بلا اعرابوں کا ہوتا ہے اور اعراب ہی اردو خط کے اہم جز ہیں» یہ بات سمجھ میں نہیں آتی ہے بہر حال یہ حقیقت ہے کہ اردو املا پر کئی بار بحثیں ہوئیں۔ رپورٹیں پیش

ہوئیں لیکن یائے معروف یا لین یا واؤ معروف یا لین کی علامتوں کے سوا کسی اور اصول کو اب تک اردو والوں نے بالا لتزام قبول نہیں کیا. سوال اس کا نہیں ہے کہ نئی علامتوں کے نام کیا ہوں، ان کی شکلیں کیا ہوں؟ سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ جو علامتیں یا اعراب متعین کئے جائیں ان کے بارے میں یقین ہو کہ وہ تحریر میں یا طباعت میں کھپ سکینگے اور دوسرے یہ کہ ان کو معیاری بناکر عام طور سے مروج کیا جاسکیگا جب تک یہ دونوں باتیں طے نہ ہوں اچھی سی اچھی تجویز صرف تجویز ہی بن کر رہیگی

غلام رسول صاحب نے اردو میں اعراب اور علامتوں سے بحث کرتے ہوئے ۴۲ اصول مرتب کئے ہیں جن کی مدد سے ان کے خیال کے مطابق تلفظ کی صحت کا مسئلہ حل ہوسکیگا. اس سلسلے میں انہوں نے بعض آوازوں کے لئے نئی علامتیں بھی تجویز کی ہیں جن کے بغیر بالخصوص غیر زبانوں کے لفظوں کو اردو میں ادا کرنے میں دشواریاں پیدا ہوتی ہیں. انھوں نے لفظوں کے نمونے جمع کرنے میں محنت کی ہے، پھر بھی یہ ممکن ہے کہ ان کا خیال اور ان کی تجویزیں بہت سے لوگوں کے لئے قابل قبول نہ ہوں مثلاً:

(١) صفحہ ٢٧ انگریزی لفظ Cat اور Man کو کیاٹ اور میان لکھنا

(٢) لفظ Hen اور Pen کو (صفحہ ٢٧ پر) ہین اور پین لکھنا اور اسی علامت کے ساتھ یائےلین کو صفحہ ١٠ پر ادا کرتے ہوئے بیر اور پھیلاؤ لکھنا

(٣) ان کی تجویز کہ مرکب لفظوں کو زنجیر v کے ساتھ لکھا جائے، مثلاً ان v مول، آج v کل، مادر v زبان وغیرہ بلا ضرورت طریق تحریر کو پیچدہ بناتی ہے.

رسالے کے شروع میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، معتمد ادارہ ادبیات اردو کا پیش لفظ ہے.　　　　(ش)

غالب　　　　مصنفہ:　خورشید الاسلام

ضخامت:　٢٨۴ صفحے　　　　قیمت: چھے روپے

پبلیشرز:　انجمن ترقی اردو، ہند، علی گڑھ (یو، پی)

اس کتاب میں لائق مصنف نے اپنے وسیع مطالعہ اور تحقیق و تفتیش کی

قوت سے ان اثرات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے جن کو غالب نے اپنے تعمیری دور میں فارسی و اردو کے ممتاز شعرا شوکت، اسیر، بیدل، غنی کاشمیری، ناصر علی، صائب اور ناسخ کے مطالعہ کے بعد قبول کیا تھا۔ خود غالب نے اپنے متعدد اشعار میں ان میں سے بعض اساتذہ کی استادی کا اعتراف کیا ہے۔ اس موضوع پر پہلے بھی کچھ محدود کوششیں کی گئی تھیں لیکن اس قدر تفصیل کے ساتھ اب تک کسی نے «نوجوان» غالب کی شاعری کے اس پہلو پر روشنی نہیں ڈالی تھی، یہ مفصل کوشش ہے۔ کتاب موضوع اور اپنی ترتیب و تجزیہ کے اعتبار سے دل چسپ ہے۔ کتاب چار ابواب اور دو ضمیموں پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں غالب کے گھریلو اور تہذیبی ماحول کا مختصر مگر جامع جائزہ لیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں شوکت، اسیر، بیدل، غنی، علی اور ناسخ کی خصوصیات شاعری بتاکر ان کے اسالیب کا اثر غالب کی ابتدائی شاعری پر بتایا گیاہے۔ تیسرے باب میں تمثیل نگاری خیال بندی اور مناسبات لفظی پر مختصراً لکھا گیا ہے اور چوتھے باب میں غالب کا اپنا کارنامہ بتایا گیا ہے۔ پہلے ضمیمہ میں غالب کے ان اشعار کا انتخاب ہے جن سے مختلف اساتذہ کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔ دوسرے ضمیمہ میں ان لفظوں اور تلازموں کا ذکر کیا گیا ہے جو «غالب کی ابتدائی شاعری میں بار بار وقیع انداز سے استعمال ہوئے ہیں۔» اس «دیدہ سوزی» کے پس منظر میں مصنف کی یہ تمنا کام کر رہی ہے جس کا اظہار ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔ «ممکن ہے کہ اس ضمیمہ کی بنیاد پر غالب کے ذہنی عمل کا مطالعہ کیا جاسکے۔»

غالبیات سے دل چسپی رکھنے والوں اور تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے یہ ایک مفید و قابل مطالعہ تصنف ہے۔

(ع، م)

ایڈیٹر: نجیب اشرف ندوی

پرنٹر پبلشر حامد اللہ ندوی نے ادبی پرنٹنگ پریس، ۸ شیفرڈ روڈ، بمبئی ۸ میں چھپواکر انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی ۱ سے شائع کیا۔

عمدۂ منتخبہ

یعنی

تذکرۂ سَرُوَرْ

اردو کے ۹۹۶ شاعروں کا ایک نایاب تذکرہ جو سنہ ۱۸۰۹ع
میں مرتب ہوا

تالیف: نواب اعظم الدولہ میر محمد خاں بہادر سرور
مرتبہ : ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی

جسے شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی نے بڑے اہتمام کے ساتھ نہایت
خوب صورت ٹائپ میں شائع کیا ہے

صفحات: ۸۳۶ قیمت (مجلد): بیس روپئے علاوہ محصول ڈاک

ملنے کا پتہ: ادبی پبلشرس
۸ شیفرڈ روڈ، بمبئی ۸

مقالــــہ نمــا

مرتب:

ڈاکٹر عالی جعفری

معــاونین:

سید مجاہد حسین حسینی

عبد الستار دلوی

علاؤ الدین جینابڑے

فہرست عنوانات

۱	مذہبیات	۱
۲	تذکرہ و سیرت نگاری	۳
۳	تاریخ و سیاسیات	۴
۴	ادب ، تنقید ، لسانیات	۵
۵	تعلیمات	۱۶
٦	متفرقات	۱٦

مذہبات

۱ ابو الاعلیٰ مودودی
السجده
(ترجمان القرآن ٦١ جولائی ٩-٣٠، اگست ٩-٣٢)
تفہیم قران کے سلسلے میں سورۂ سجده کی پہلی اور دوسری قسط.

۲ امام الدین ابو محمد
نظریۂ اوتار اور عقیدۂ رسالت
(زندگی رام پور ٦١ جولائی، اگست و ستمبر)
نویں، دسویں اور گیارہویں قسط.

۳ چودھری محمد اسماعیل
سود
(ثقافت ٦١ اگست ٤٥-٥٥)
چوتھی قسط.

۴ خلیل حامدی
عرب ممالک میں اسلامی دستور کا مطالبه
(ترجمان القرآن ٦١ جولائی ٥٨-٦٣)

۵ عبد الغنی حسن ڈاکٹر، مصنف
خلیل حامدی، مترجم
اسلام کا بین الاقوامی قانون
(ترجمان القرآن ٦١ اگست ٣٣-٦٠)
عربی سے ترجمه.

۶ رزاقی شاہد حسین
اسلام کے سیاسی تصورات اور خلافت الہیه اور اس کے مقاصد
(ثقافت ٦١ اگست ٥٦-٦٣)
مولانا محمد اسحاق سندیلوی کی متعلقه تحریروں کا خلاصه.

۷ رزاقی شاہد حسین
ابن تیمیه کا نظریۂ فرد و جماعت
(ثقافت ٢١ ستمبر ٦٥-٧٠)

۸ سردار جعفری
مصحف عثمانی کے متعلق ایک عینی شہادت
(معارف ٦١ اگست ١٠١-١٠٣)
سید شہاب الدین دسنوی کے کہنے پر سردار جعفری نے اس کی زیارت کی کیفیت دوسری متعلقه معلومات کے ساتھ بیان کی ہے.

۹ سعید رمضان ڈاکٹر
فرعون و کلیم کی داستان کشمکش
(ترجمان القرآن ٦١ جولائی ٢٧-٣٤)

۱۰ سلطان مبین
فطرت شرک
(زندگی رام پور ٦١ اگست ٤٩-٥٣ و ٥٥)

۱۱ عبد الله خاں
نماز بوقت خطبه پر محققانه بحث
(برہان ٦١ جولائی ٢٥-٣٠، اگست ٢٥-٣٠)

دوسری و تیسری قسط۔

۱۲ عروج قادری سید احمد

غیظ و غضب

(زندگی رام پور ۶۱ اگست ۹۔۱۷)

غیظ و غضب سے متعلق رسول اکرم کی احادیث مع توضیح و تصریح درج ہیں۔

۱۳ عمری جلال الدین سید

قرآن۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی کی نظر میں

(زندگی رام پور ۶۱ اگست ۱۸۔۳۹)

۱۴ فارق خورشید احمد

عمر فاروق کا اجتہاد

(ثقافت ۶۱ جولائی ۷۔۲۹)

۱۵ فارق خورشید احمد

حضرت عثمان کے سرکاری خطوط

(برہان ۶۱ اگست ۴۱۔۴۸)

دوسری قسط۔

۱۶ قاضی اطہر

فرقۂ یزیدیہ اپنے امیر کے بیان کی روشنی میں

(معارف ۶۱ ستمبر ۲۲۳۔۲۳۳)

۱۷ قریشی اکبر حسین

اقبال اور حدیث نبوی

(معارف ۶۱ جولائی ۴۷۔۶۲)

قرآن کے ساتھ اقبال احادیث نبوی کے بھی قائل تھے۔

۱۸ محمد فاروق

قرآن مجید کی حیرت انگیز جامعیت

(زندگی رام پور ۶۱ ستمبر ۲۷۔۴۴)

۱۹ معراج محمد بارق

اسلام کی ہمہ گیری

(معارف، لاہور ۶۱ جولائی ۱۷۔۲۸)

تکمیل انسانیت سے متعلق اسلام کی ہمہ گیری خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے،

۲۰ ندوی ابو الجلال

سورہ نمل، تفسیر و تشریح

(فاران ۶۱ جولائی ۱۲۔۱۹ اگست ۸۔۱۲)

چوتھی اور پانچویں قسط۔

۲۱ ندوی ابو الحسن علی

ہندوستان کی تہذیب و تمدن پر مسلمانوں کے اثرات

(الفرقان ۶۱ اگست ۱۸۔۳۱)

۲۲ ندوی رشید اختر

فقہائے شافعیہ

(ثقافت ۲۱ ستمبر ۴۳۔۶۴)

۲۳ ندوی محمد حنیف

حج کی فضیلت و اہمیت

(ثقافت ۶۱ جولائی ۳۰۔۴۶ اگست ۲۶۔۴۴)

۲۴ ندوی محمد حنیف

اسلام میں نکاح کی حیثیت

(ثقافت ۶۱ ستمبر ۲۶۔۴۲)

۲۵ نعمانی محمد منظور

اذان و اقامت سے متعلق بعض احکام

(الفرقان ۶۱ جولائی ۵۔۱۰ اگست ۵۔۱۷)

۲۶ نعمانی محمد منظور

مساجد، ان کی عظمت و اہمیت اور

آداب و حقوق
(الفرقان ۶۱ ستمبر ۵-۲۴)

۲۷ نعیم صدیقی
سلطان العنان اقتدار کے تحت محدود
(ترجمان القرآن ۶۱ جولائی ۴۴-۵۷ اگست ۱۸-۳۲)
دوسری و تیسری قسط.

مذہبی مناصب

تذکرہ و سیرت نگاری

۲۸ ابو القاسم رفیق دلاوری
مچھیرے کی بیٹی کا شاہانہ اوج و عروج
(تعمیر انسانیت، لاہور ۶۱ جولائی ۲۱-۲۵)
نصیر الدین حیدر کی ایک کنیز دھنیا مہری کے عروج کی داستان بیان کی ہے.

۲۹ صوفی محمد یعقوب
تذکرہ بزرگان اسلام
(عارف، لاہور ۶۱ اگست ۱۳-۲۲)
خواجہ عالم پیر نور محمد نقشبندی رح کے حالات درج کئے ہیں.

۳۰ ضیاء الحسن فاروقی
رشید رضا
(جامعہ ۶۱ جولائی ۵۸-۶۶)
مفتی محمد عبدہ کے ممتاز شاگرد رشید رضا شامی کے افکار و اعمال کا تذکرہ ہے.

۳۱ عبد العلی ڈاکٹر مصنف
ندوی ابو الحسن علی مرتب
ڈاکٹر عبد العلی صاحب مرحوم کے چند خطوط
(الفرقان ۶۱ جولائی ۳۶-۴۳ اگست ۳۲-۳۶)
مرتب کے نام سات خط جو مختلف نجی باتوں پر مشتمل ہیں. آخر کے دو خطوں میں مصر و حجاز کا ذکر ہے.

۳۲ عبد الغنی نیازی شاہ
مظہر نور خدا
(ماہ نو ۶۱ ستمبر ۲۱-۲۴)
مشہور صوفی حضرت شیخ ابو الحسن علی ہجویری لاہوری معروف بہ حضرت داتا گنج بخش رح سے متعلق اپنے معلومات پیش کی ہیں.

۳۳ عطاء اللہ پالوی
ڈاکٹر طہ حسین
(نگار ۶۱ ستمبر ۹-۱۶)
ڈاکٹر طہ حسین کی شخصیت اور علمی کاموں کا تعارف پیش کیا ہے.

۳۴ غبار یاور
ابوالعلا احمد المعری
(تعمیر انسانیت لاہور ۶۱ اگست و ستمبر ۲۱ - ۲۰)
ابوالعلا احمد المعری کے حالات بیان کئے ہیں اور ان کے علم و فضل کی تعریف کی ہے

۳۵ غوری شبیر احمد خان
علامہ اقبال اور اسلام کے تصور

زماں کی ترجمانی
(معارف ۶۱ اگست ۸۵ ـ ۱۰۳)

۳۶ غوری شبیر احمد خان
شیخ بو علی سینا کی عبقریت
(معارف ۶۱ ستمبر ۱۸۱ ـ ۱۹۳)
جون ۶۱ء سے مسلسل

۳۷ فصیح الدین بلخی
شبلی نعمانی
(صبح نو پٹنہ ۶۱ آزادی نمبر ۱۵ ـ ۱۶)
مولانا شبلی کی حیات اور کارناموں کا سرسری جائزہ ہے

۳۸ مبشر علی صدیقی
مولوی ذکاءاللہ دہلوی
(شاعر ، بمبئی ۶۱ جولائی ۳۲ ـ ۳۳)
مولوی ذکاءاللہ کی معلمانہ شخصیت پر تبصرہ کیا ہے

۳۹ محمد ابو ذرمانی
سارٹان کی تاریخ سائنس میں ابن سینا کا تذکرہ
(معارف ۶۱ اگست ۱۳۵ ـ ۱۴۲)

۴۰ محمد مسعود احمد
شیخ احمد سر ہندی
(معارف ۶۱ جولائی ۵ ـ ۲۱ اگست ۱۰۷ ـ ۱۱۹ ستمبر ۱۶۵ ـ ۱۸۰)
تاریخ و سیاست کے پس منظر میں شیخ احمد سر ہندی (مجدد الف ثانی) کے کارناموں کا جائزہ

۴۱ محمد موسیٰ حکیم امرتسری
علمائے امرتسر
(فیض الاسلام ، راولپنڈی ۶۱ جولائی ۳۳ ـ ۴۳)
مولانا مفتی پیر غلام مصطفیٰ قاسمی رح کے حالات زندگی اور انکے چند مستفیدین کا مختصر تعارف پیش کیا ہے

۴۲ مسعود حسن رضوی
بادشاہ بیگم
(فروغ اردو لکھنؤ ۶۱ جولائی ۹ ـ ۱۴)
نواب غازی الدین حیدر تاجدار اودھ کی بیگم کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے

۴۳ نصیر الدین ہاشمی
نواب سالار جنگ
(قومی زبان کراچی ۶۱ یکم و ۱۶ جولائی ۲۶ ـ ۳۰)
حیدرآباد کے نواب سالار جنگ کے کتب خانے اور ان کی علمی خدمات کا ذکر کیا ہے

۴۴ نعمانی محمد منظور
مولانا سید عطاءاللہ شاہ بخاری
(الفرقان ۶۱ ستمبر ۴۳ ـ ۵۳)
مولانا مرحوم کی علمی، مذہبی اور سیاسی سرگرمیوں کا تذکرہ

تاریخ و سیاسیات

۴۵ خالدی محمد ابوالنصر ڈاکٹر
ہندوستان کے متعلق جاحظ کے اجمالی معلومات کا تفصیلی مطالعہ
(برہان ۶۱ جولائی ۵ ـ ۲۰ اگست ۵ ـ ۲۴ ستمبر ۵ ـ ۲۴)

۴۶ خواجہ عبدالرشید ڈاکٹر و سعید احمد اکبرآبادی
علماء اور حکومت
(برہان ۶۱ جولائی ۵۷-۵۹ اگست ۴۳-۶۱ ستمبر ۴۳-۵۹)
علماء اور حکومت کے تعلقات کے سلسلے میں دو خط

۴۷ رزاقی شاہد حسین
انڈونیشیا میں داخلی کشمکش
(ثقافت ۶۱ جولائی ۴۷-۵۷)

۴۸ شریف النساء ڈاکٹر
حدائق السلاطین اور قطب شاہی سلاطین و وزراء
(صبا ۶۱ جولائی، اگست ۲۳-۳۰)

۴۹ عمر الہی
تاریخ کا مطالعہ
(جامعہ ۶۱ اگست ۵۴۰-۵۴۴)
تاریخ کی اہمیت اور اس کے مطالعہ کے اصول بیان کئے ہیں

۵۰ قاضی اطہر
ہنگری کے مستشرقین اور ان کے علمی کارنامے
(معارف ۶۱ جولائی ۶۳-۷۶)

۵۱ قاضی زین العابدین
عہد عباسی کی معاشرت کے روشن و تاریک پہلو
(جامعہ ۶۱ اگست ۵۱۳-۵۲۳)
خلفائے عباس کے عہد کی معاشرت کا تذکرہ کیا ہے

۵۲ قریشی، عبدالرزاق
ایم اے او کالج علی گڑھ
(جامعہ ۶۱ جولائی ۴۷۴-۴۸۱)
سر سید کے قائم کردہ ایم، اے، او کالج اور اس کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی ہے

۵۳ نذیر احمد ڈاکٹر
فارسی کا مستقبل ہندوستان میں
(علی گڑھ میگزین ۶۱-۱۹۵۹ ص ۱۲-۲۷)
فارسی زبان کے تہذیبی اثرات اور ہندوستان میں اس کے مستقبل کے بارے میں رائے دی گئی ہے

۵۴ یوسف حسین خاں، ڈاکٹر
انسانیت کا عروج و زوال - ۳
(فکر و نظر علی گڑھ ۶۱ جولائی ۱۰۹-۱۴۴)
تاریخ و فلسفہ کی روشنی میں انسانی تہذیب و تمدن کے ارتقا کا جائزہ لیا گیا ہے

ادب، تنقید، لسانیات

۵۵ ابو محمد سید علی سریر
اردو اداروں کا ارتقا - ۲
(فروغ اردو لکھنؤ ۶۱ جولائی ۴۰-۵۹)
انجمن ترقی اردو، دارالمصنفین،

ہندوستانی اکیڈمی ، حلقہ ادبیہ کانپور ، انجمن طلبہ مدرسہ اعظم ، انجمن حمایت اسلام مدراس وغیرہ کا مختصر ذکر ہے

٥٦ احتشام حسین

اردو تحقیق و تنقید

(جامعہ ٦١ ستمبر ٥٤٠-٥٤٧)

جدید اردو ادب کے تنقیدی اور تحقیقی سرمایہ کا جائزہ لیتے ہوئے ہماری جدید ثقافتی زندگی سے اس کے تعلق پر روشنی ڈالی ہے

٥٧ احراز نقوی

اردو صحافت کا پہلا محقق

(قومی زبان کراچی ٦١ یکم و ١٦ جولائی ١۴-١٨)

اختر الدولہ اشرف نقوی مؤلف اختر شاہنشاہی کا تذکرہ ہے

٥٨ احراز نقوی

اردو کا سب سے پہلا ماہنامہ

(سب رس ، حیدرآباد ٦١ اگست ٣-٧)

ماسٹر رامچندر کے رسالے خیر خواہِ ہند ، دہلی کو اردو کا سب سے پہلا ماہنامہ بتایا ہے

٥٩ احسن فاروقی ڈاکٹر

ادب کی تعلیم

(قومی زبان کراچی ٦١ یکم اگست ٨-١١)

ادب کی حقیقت ، اس کی تعلیم اور اسلوب تعلیم پر رائے پیش کی ہے

٦٠ احمد جمال پاشا

فنِ لطیفہ گوئی

(آجکل ٦١ ستمبر ٣٢-٣٩)

لطیفہ گوئی کو فن کی حیثیت سے پیش کرتے ہوئے اس کے ارتقا پر روشنی ڈالی ہے

٦١ احمر رفاعی

ہادی مچھلی شہری اور ان کی شاعری

(جام نو کراچی ٦١ دہ سالہ نمبر ٥٣-٦٥)

ہادی مچھلی شہری کی شاعری پر تبصرہ ہے

٦٢ اختر انصاری

کچھ اپنے قطعات کے بارے میں

(علی گڑھ میگزین ٦١-١٩٥٩ء ص ۴٩-٥٦)

اپنے قطعات کی تاریخی اور ادبی اہمیت کا تذکرہ کیا ہے

٦٣ اختر اورینوی

پرویز شاہدی کی فنکاری

(اشارہ ٦١ اگست ١٣-١٨)

٦۴ اختر اورینوی

وجہی کا نظریۂ فن و نقد فن

(علی گڑھ میگزین ٦١-١٩٥٩ء ص ٢٨-٣٦)

قطب مشتری اور سب رس کے مصنف ملا وجہی کی تحریروں سے اس کے فنی نظریات کا پتہ لگایا گیا ہے

٦٥ اختر حسن

ٹیگور کے حالات زندگی

(صبا ٦١ مئی ، جون ٩-٢٠)

٦٦ ا ۔ د ۔ نسیم

دلی (بارہویں صدی ہجری) کا

شاعرانہ ماحول

(اورینٹل کالج میگزین ۶۱ فروری ۳۱-۴۶)

۶۷ ا۔ د۔ نسیم

دلی (بارہویں صدی ہجری) کا شاعرانہ ماحول

(اورینٹل کالج میگزین ۶۱ مئی ۵۵-۹۶)

۶۸ اسرار احمد کریوی

حرفے چند (مسلسل)

(قومی زبان کراچی ۶۱ یکم اگست ۲۵-۲۶)

ہمزہ کے استعمال پر بحث کی ہے

۶۹ اسرار احمد کریوی

حرفے چند

(قومی زبان کراچی ۶۱ یکم و ۱۶ جولائی ۱۲-۱۳)

یائے تحتانی کے لسانی استعمال سے بحث کی ہے

۷۰ اسلوب احمد انصاری

مکاتیب مہدی

(شاعر، بمبئی ۶۱ خاص نمبر ۳۷-۴۳)

مہدی الافادی کی خطوط نگاری کا تنقیدی جائزہ لیا ہے

۷۱ اسیر عبداللہ جان

رحمان بابا رح

(ماہ نو کراچی ۶۱ جولائی ۲۱-۲۴)

رحمان بابا رح کی شاعری کا تعارف پیش کیا ہے

۷۲ اطہر پرویز

ظفر کی شاعری میں ہندوستانی تہذیب کے عناصر

(آجکل ۶۱ جولائی ۳-۹)

۷۳ ام ہانی فخرالزماں ڈاکٹر

شاہ محمد ممتاز علی آہ امیٹھوی

(معارف ۶۱ ستمبر ۲۰۸-۲۲۲)

حالات و شاعری پر تبصرہ مع انتخاب

۷۴ امین چند شرما

رباعیات امجد

(نوائے ادب، بمبئی ۶۱ جولائی ۵-۱۵)

امجد کی رباعیات کا تنقیدی جائزہ لیا ہے

۷۵ ایس۔ اے۔ رحمن، جسٹس

اکبر الہ آبادی

(ادب لطیف، لاہور ۶۱ جولائی ۵-۸)

اکبر مزاحیہ ادب کی تطہیر میں امام کا درجہ رکھتے ہیں

۷۶ ایس۔ ایل۔ پنڈت

ٹیگور بحیثیت ڈراما نگار

(نیا شعور، ۶۱ مئی ۲۳-۲۸)

ٹیگور کے ڈراموں کی تکنیک کا تجزیہ کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ ٹیگور نے بنگالی ادبی نشاۃالثانیہ میں ڈراما کو ایک خاص منزل تک پہنچادیا ہے

۷۷ اے۔ اے۔ نامی، ڈاکٹر

اٹھارہویں صدی عیسوی کے انگریزی ڈراموں میں اردو گانوں اور الفاظ کا استعمال

(نوائے ادب، بمبئی ۶۱ جولائی ۱-۱۶)

' سفر بنگال ' اور اس کے مصنف چارلس

اسمتھ کا تعارف کرایا ہے

۷۸ بشیرالنساء بیگم

ایران کی جدید شاعری

(سب رس، حیدرآباد ٦١ اگست ٨_١٠)

ایران کی جدید شاعری کا سرسری جائزہ لیا ہے

۷۹ پرویز شاہدی

اردو ادب آزادی کے بعد

(صبح نو پٹنہ ٦١ آزادی نمبر ١_١٩)

ایک ریڈیو تقریر ہے جس میں آزادی کے بعد اردو ادب کے ارتقا کا جائزہ لیا گیا ہے

۸۰ تبسم کاشمیری

پارسی الفنسٹن ڈرامیٹک کلب

(قومی زبان کراچی ٦١ یکم و ١٦ جولائی ٢١_٢٥)

۱۸۸۳ ع میں پارسی الفنسٹن ڈرامیٹک کلب کی لاہور میں آمد اور اس کی مقبولیت پر روشنی ڈالی ہے

۸۱ ت . چ . رستوگی طاہر

آسامی ادب

(شاعر بمبئی ٦١ جولائی ١٢_٣١)

آسامی ادب کا تاریخی و تنقیدی جائزہ لیا ہے .

۸۲ جاوید نہال

دہ مجلس یا کربل کتھا

(صبح نو پٹنہ ٦١ جولائی ١٧_١٩)

فضلی کی تصنیف دہ مجلس کا حال بیان کیا ہے .

۸۳ جاوید نہال

ایک قدیم داستان گو اور شاعر

(جام نو کراچی ٦١ دہ سالہ نمبر ٤١_٤٥)

مظہر علی خاں ولا کی داستان گوئی اور شاعری پر روشنی ڈالی ہے .

۸۴ حسن مثنیٰ ندوی

بہار میں اردو

(اشارہ ٦١ ستمبر ٤_٢٦)

۸۵ خاور عبد اللہ

خطوط غالب

(جام نو کراچی ٦١ دہ سالہ نمبر ٤٧_٥١)

غالب کے خطوط کے ہیئت اور مواد کا تجزیہ کیا ہے .

۸۶ خلیق احمد نظامی

دیوان حافظ

(فکر و نظر علی گڑھ ٦١ جولائی ١٤٧_١٦٢)

دیوان حافظ کے مطبوعہ ایڈیشنوں کا تقابلی مطالعہ ہے .

۸۷ خواجہ احمد فاروقی

حضرت جگر مرادآبادی

(فروغ اردو جگر نمبر حصہ دوم ٧٨_٨٢)

جگر کی شخصیت و فن پر ریڈیو کی ایک تقریر کا اقتباس ہے .

۸۸ ذکی الحق

شاد کا مسلک

(اشارہ ٦١ ستمبر ٣٢_٣٦)

شاد عظیم آبادی کی شاعری اور مسلک پر روشنی ڈالی ہے .

۸۹ رائے جانکی پرشاد

بابائے اردو
(سب رس حیدرآباد ۶۱ ستمبر اکتوبر ۲۲-۲۳)
مولوی عبدالحق مرحوم کی شخصیت سے متعلق ذاتی تاثر پیش کیا ہے۔

۹۰ رفیق خاور
آزاد نظم کے سراغ میں
(ماہ نو ۶۱ جولائی ۱۶-۲۱)
آزاد نظم کی ابتدا اور ارتقا پر روشنی ڈالی ہے۔

۹۱ رفیق خاور
آزاد نظم کے سراغ میں
(ماہ نو ۶۱ اگست ۱۰-۱۴)
گذشتہ سے پیوستہ

۹۲ آزاد نظم کے سراغ میں
(ماہ نو ۶۱ ستمبر ۱۲-۱۳)
اردو میں آزاد نظم کے ارتقا پر روشنی ڈالی ہے۔

۹۳ ریاض احمد
زرِ داغ دل
(ماہ نو ۶۱ جولائی ۹-۱۶)
عبدالعزیز خالد کی طویل نظموں کے مجموعہ «زرِ داغ دل» پر تبصرہ کیا ہے۔

۹۴ زیدی سید احمر
یگانہ کی خود نوشت
(علی گڑھ میگزین ۱۵۵-۱۶۴)
مرزا یاس یگانہ چنگیزی کی ایک غیر مطبوعہ خود نوشت کی نشاندہی کرتے ہوئے چند اقتباسات پیش کئے ہیں۔

۹۵ سخاوت مرزا
مثنوی مراۃ الحشر
(نوائے ادب، بمبئی ۶۱ جولائی ۲۶-۴۴)
مثنوی مراۃ الحشر اور اس کے مصنف سید محمد شراقی بیجاپوری رح کے متعلق تحقیقی مضمون۔

۹۶ سخاوت مرزا
میاں سید محمود منور مہدوی حیدرآبادی مرحوم
(سب رس، حیدرآباد ۶۱ ستمبر و اکتوبر ۶-۱۱)
سید محمود منور کے مختصر حالات اور کلام کا نمونہ پیش کیا ہے۔

۹۷ سردار جعفری
میر تقی میر کی شاعری
(شاعر، بمبئی ۶۱ خاص نمبر ۱۹-۲۸)
میر کی شاعری پر تنقید کی ہے۔

۹۸ سعادت نظیر
جگر کا تغزل
(فروغ اردو جگر نمبر حصہ دوم ص ۵۶-۶۶)
اردو غزل کی تاریخ اور اس کے فنی محاسن کے ساتھ جگر کے تغزل پر روشنی ڈالی ہے۔

۹۹ سلام سندیلوی
(جام نو کراچی ۶۱ دہ سالہ نمبر ۲۷-۳۱)
اردو کا پہلا رباعی گو شاعر
محمد قلی قطب شاہ کی رباعی گوئی کا تذکرہ ہے۔

۱۰۰ سلطان احمد بہزاد

شاد و صفیر

(صبح نو پٹنہ ۶۱ آزادی نمبر ۳۶-۳۸)

شاد عظیم آبادی اور صفیر بلگرامی کے متعلق چند غلط فہمیوں کا ازالہ کیا ہے۔

۱۰۱ سلیمان ندوی سید

شعلۂ طور۔ تعارف نووارد شاعر

(فروغ اردو ۶۱ جگر نمبر ص ۹-۱۴)

بڑے دلچسپ انداز میں جگر مرادآبادی کا تعارف کرایا ہے۔

۱۰۲ سید حسن پروفیسر

جگر کا فارسی کلام

(فروغ اردو۔ جگر نمبر حصہ دوم ص ۱۵-۳۱)

جگر کی فارسی شاعری پر مبسوط مقالہ ہے۔

۱۰۳ سید عبد اللہ، ڈاکٹر

مراۃ الاصطلاح

(اورینٹل کالج میگزین ۶۱ اگست ۱-۴)

فارسی کی مصطلحات کی تشریح سے متعلق رائے آنند رام مخلص کی کتاب مراۃ الاصطلاح کا متن (پہلی قسط صفحہ ۱-۴)

۱۰۴ سید عبد اللہ، ڈاکٹر

مثمر

(اورینٹل کالج میگزین ۶۱ اگست ۱-۴)

اصول علم لغت سے متعلق خاں آرزو کی تصنیف «مثمر» کا متن (پہلی قسط صفحہ ۱ - ۴)

۱۰۵ سیدہ اختر

نغمہ اور اہل عرب

(جام نو کراچی ۶۱ جولائی ۱۹-۲۲)

نغمہ کی ابتدا اور اہل عرب کی نغمہ پروری کا تذکرہ ہے۔

۱۰۶ سیدہ جعفر، ڈاکٹر

حسرت کی غزل

(شاعر بمبئی، خاص نمبر ۳۰-۳۴)

حسرت کی انفرادی آواز ان کی غزلوں میں گونجتی ہے اور عمر کے ساتھ تغزل مدھم ہوتا جاتا ہے۔

۱۰۷ سیدہ جعفر، ڈاکٹر

اردو نظم اور ہیئت

(نوائے ادب بمبئی ۶۱ جولائی ۵۰-۶۵)

آزاد نظم نگاری کا تاریخی جائزہ لیا ہے۔

۱۰۸ شبیر احمد خاں غوری

چہار مقالہ کا سال تصنیف

(فکر و نظر علی گڑھ ۶۱ جولائی ۵۵-۷۱)

نظامی عروضی سمرقندی کی تصنیف چہار مقالے کا تاریخی جائزہ لیا ہے۔

۱۰۹ شریف احمد

ٹیگور اور نیا ہندوستان

(نیا شعور، ٹیگور نمبر ۶۱ مئی ۶۰-۶۹)

ٹیگور کی ہمہ جہت شخصیت اور فنکارانہ عظمت پر تبصرہ کیا ہے۔

۱۱۰ شکیل الرحمان

رابندر ناتھ ٹیگور کا رومانوی ذہن

(نیا شعور، ٹیگور نمبر ۶۱ مئی ۲۹-۵۹)

ٹیگور کے رومانوی تصورات کا نفسیاتی تجزیہ کیا ہے۔

۱۱۱ شہاب جعفری
جذبی
(علی گڑھ میگزین ۶۱-۱۹۵۹ ص ۱۱۱-۱۲۴)
معین احسن جذبی کی شاعری کا فنی تجزیہ کیا گیا ہے

۱۱۲ صابر شاہ آبادی
تنقید اور زندگی
(نگار ۶۱ ستمبر ۶۵-۶۹)

۱۱۳ صابر شاہ آبادی
غزل کی فنی و معنوی اہمیت
(شاعر، بمبئی، ۶۱ جولائی ۱۵-۱۹)
غزل کی فنی ومعنوی خصوصیتوں کی وضاحت کرتے ہوئے ان کی اہمیت بتلائی ہے

۱۱۴ ضمیر علی بدایونی
خیالوں کے دھارے
(ماہ نو ۶۱ اگست ۱۵-۲۰)
ادب اور معاشرے کے تعلق پر اظہار خیال کیا ہے

۱۱۵ ضیا احمد بدایونی
عہد خاقانی کی چند جھلکیاں
(علی گڑھ، میگزین ۱۹۵۹ع تا ۱۹۶۱ع ص ۱ سے ۱۱)
ایران کے مشہور شاعر خاقانی شروانی کے کلام میں اس کے عہد کی سیاسی اور سماجی حالت کے متعلق اشارے تلاش کئے گئے ہیں

۱۱۶ طلحہ رضوی برق
خاور بانکوٹی کی شاعری
(صبح امید ۶۱ جولائی ۶-۳۰)
رتناگیری (کوکن) کے قصبہ بانکوٹ کے ایک شاعر کے کلام پر تبصرہ ہے

۱۱۷ ظفر عالم گیر
دکن کی قدیم اردو شاعری
(صبح نو پٹنہ ۶۱ آزادی نمبر ۲۰-۳۳)
دکن کی قدیم اردو شاعری پر تفصیلی تبصرہ ہے

۱۱۸ عابد حسین ڈاکٹر
ترکیبی ادب
(جامعہ ۶۱ اگست ۵۰۷-۵۱۱)
تخلیقی اور غیر تخلیقی ادب کی نوعیت پر ایک تقریر ہے

۱۱۹ عابد رضا بیدار
ادب کی رفتار سنہ ۱۹۶۰ ع
(قومی زبان کراچی ۶۱ یکم اگست ۱۸-۲۱)
سنہ ۱۹۶۰ ع کی قابل ذکر اردو تحریروں کا ایک اشاریہ ہے

۱۲۰ عابد رضا بیدار
حسرت موہانی
(برہان ۶۱ جولائی ۴۱-۵۶ اگست ۴۹-۵۲ ستمبر ۴۵-۵۲)
حسرت کی شاعری اور دوسرے کارناموں کا تذکرہ

۱۲۱ عابدی، وزیرالحق
باغ دودر
(اورینٹل کالج میگزین ۶۱ اگست)
غالب کی فارسی امید باغ دودر کا باقی

متیں (صفحہ ۹۲ تا ۱۸۸)

۱۲۲ عتیق صدیقی
اردو مرثیہ کا تہذیبی مطالعہ
(نگار ۶۱ ستمبر ۱۷-۲۰)

۱۲۳ علاؤالدین حبیب
ٹیگور کا آرٹ
(سب رس ، حیدر آباد ، ۶۱ جولائی ۱۲-۱۳)
ٹیگور ، بحیثیت مصور ، کا تعارف کرایا ہے

۱۲۴ علی جواد زیدی
مولانا آزاد کی نثر
(اشارہ ۶۱ جولائی ۱۷-۱۹)
ابوالکلام آزاد کی نثر پر اظہار خیال کیا ہے

۱۲۵ علی عباس حسینی
جرم محمد آبادی
(صبح نو پٹنہ ۶۱ آزادی نمبر ۳۴-۳۵)
علامہ آرزو کے شاگرد رشید حضرت جرم محمد آبادی کا تعارفی تذکرہ ہے

۱۲۶ عمیق حنفی
کالیداس
(شاعر بمبئی ، ۶۱ خاص نمبر ۵۵-۵۹)
کالیداس کا تعارف کرایا ہے

۱۲۷ غبار یاوز
شاعری میں اظہاریت
(جام نو کراچی ۶۱ دہ سالہ نمبر ۳۳-۳۹)
اظہاریت کے مفہوم اور اس کی فنی اہمیت کو واضح کیا ہے

۱۲۸ غلام رسول
اردو املا نامہ پر ایک نظر
(معارف ۶۱ اگست ۱۴۳-۱۵۰)
ترقی اردو بورڈ (پاکستان) کی متعلقہ تجویزات کے ساتھ مقالہ نگار نے اپنی تجویزیں بھی دی ہیں کہ تقابلی مطالعہ ہو سکے

۱۲۹ فصیل جعفری
شاہد صدیقی کی شاعری
(سب رس حیدر آباد ، ۶۱ ، ستمبر و اکتوبر ۱۲-۱۶)
شاہد صدیقی کے کلام پر اجمالی تبصرہ کیا ہے

۱۳۰ قاضی عبدالودود
تیغ تیز
(فکر و نظر علی‌گڑھ ۶۱ جولائی ۴۰-۵۴)
غالب کے نثری رسالہ تیغ تیز کا تحقیقی مطالعہ ہے

۱۳۱ قطب انسا بیگم ہاشمی
ایک صنف ادب
(آج کل ۶۱ جولائی ۱۳-۱۸)
سفر ناموں پر اظہار خیال کیا ہے

۱۳۲ گوپی چند نارنگ
سوامی مارہروی
(آجکل ۶۱ ستمبر ۳-۸)
سوامی مارہروی اور ان کے گیتوں پر اظہار خیال کیا ہے

۱۳۳ لال چند بسمل
مسلم صوفی کا ہندی کلام اللہ نامہ

(نوائے ادب، بمبئی جولائی ۴۵-۵۰)
«اللہ نامہ» پر تبصرہ کیا ہے

۱۳۴ مبارز الدین رفعت
مولانا شرر کی نظم «شب غم»
ایک ادبی تحریک
(شاعر، بمبئی ۶۱ خاص نمبر ۴۴-۴۷)
مولانا عبدالحلیم شرر کی دو نظموں «شب غم» اور «شب وصل» کا تعارف کرایا ہے

۱۳۵ مجنوں گورکھپوری
ایک نقاد شاعر
(ادب لطیف، لاہور ۶۱ ستمبر ۷-۱۰)
خورشید الاسلام کی ادبی صلاحیتوں پر تبصرہ کیا ہے

۱۳۶ محمد احمد صدیقی
تخیلات جگر
(جام نو کراچی ۶۱ جولائی ۱۱-۳۵)
جگر مراد آبادی کے ذہنی ارتقا اور ان کے تغزل کے مختلف عناصر پر روشنی ڈالی ہے

۱۳۷ محمد حسن
جگر کی شاعری
(آج کل ۶۱ اگست ۳-۶)

۱۳۸ محمد حسن ڈاکٹر
اردو شاعری میں ایہام گوئی
(فکر و نظر علی گڑھ ۶۱ جولائی ۱۳-۳۹)
ایہام گوئی کی تشریح کے ساتھ اردو شاعری میں ایہام گوئی کی روایت پر روشنی ڈالی ہے

۱۳۹ محمد شفیع
ڈاکٹر شمس العلماء مولوی محمدحسین آزاد
(اورینٹل کالج میگزین ۶۱ فروری ۱۹-۳۰)
آزاد سے متعلق پرانے ریکارڈوں سے معلومات فراہم کی ہیں

۱۴۰ محمد عتیق صدیقی
ابوالکلام آزاد
(جامعہ ۶۱ اگست ۵۲۴-۵۳۳)
ابوالکلام آزاد کے اخبار لسان الصدق کے پہلے شمارے کا جائزہ لیا ہے

۱۴۱ محمد عظیم فیروزآبادی
حسرت کا مزاج
(شاعر بمبئی خاص نمبر ۲۹-۳۳)
حسرت کی شاعری، نجی اور سیاسی زندگی کی روشنی میں حسرت کے مزاج کا خاکہ کھینچا ہے

۱۴۲ محمد مجیب
غالب کے تین شعر
(جامعہ ۶۱ جولائی ۴۵۱-۴۵۶)
غالب کے تین اشعار کی ایک خاص انداز میں توضیح و تشریح کی ہے

۱۴۳ محمود بیگ، مرزا
ادبی مقالہ
(جامعہ ۶۱ ستمبر ۵۷۸-۵۸۲)
ادبی مقالہ کی تعریف، خصوصیات اور اقسام سے بحث کی ہے

۱۴۴ محی الدین احمد

مولوی عبدالحق کی چند کمزوریاں

(سب رس ۔ حیدرآباد ۶۱ ستمبر و اکتوبر ۲۴_۲۵)

مولوی عبدالحق کی چند اخلاقی خوبیاں بیان کی ہیں

۱۴۵ محی الدین قادری زور

انشائیے فضائل خانی

(سب رس ، حیدرآباد ۶۱ ستمبر و اکتوبر ۳_۵)

کرنول کی ایک قدیم تاریخ کا تعارف کرایا ہے

۱۴۶ مختارالدین احمد ، ڈاکٹر

شاہ حاتم کا فارسی دیوان

(علی گڑھ میگزین ۶۱_۱۹۵۹ع ۱۳۵_۱۵۴)

شاہ حاتم کے فارسی دیوان پر تاریخی و تحقیقی مقالہ ہے

۱۴۷ معین الدین دردائی

یاس بہاری

(صبح نو پٹنہ ۶۱ جولائی ۱۳ ـ ۱۶)

سید شـــاہ امین احمد فردوسی کے صاحبزادے حضرت یاس کا تذکرہ ہے

۱۴۸ منظورالحسن برکاتی

اختر شیرانی کی رومانی شاعری کا پس منظر

(آجکل ۶۱ اگست ۲۷_۳۳)

۱۴۹ وفا راشدی

حـــیدرآباد میں اردو ادب کے چودہ سال

(جام نو کراچی ۶۱ دہ سالہ نمبر ۶۷_۷۲)

حیدرآباد سندھ میں ۱۹۴۷ سے ۱۹۶۱ع تک کے اردو ادب کا جائزہ ہے

۱۵۰ نادم بلخی

مومن اور وہابی تحریک

(اشارہ ۶۱ اگست ۲۷_۳۴)

۱۵۱ ناظر کاکوروی

جگن ناتھ آزاد

(اشارہ ۶۱ جولائی ۱۶۱ ـ ۱۶۸)

جگن ناتھ آزاد کی شخصیت اور شاعری پر اپنے تاثرات پیش کئے ہیں

۱۵۲ ناہید نوا

شاعر شیریں نوا

(ماہ نو جولائی ۲۶_۲۹)

رحمان بابا رح سے متعلق اپنے تاثرات پیش کئے ہیں

۱۵۳ نثار احمد فاروقی

جگر مرادآبادی

فروغ اردو ۶۱ جگر نمبر حصہ ۲ ص ۴۷_۵۵)

حضرت جگر کی شخصیت اور ان سے اپنے ذاتی مراسم کا تذکرہ کیا ہے

۱۵۴ ندوی شاہ معین الدین

شعلۂ طور

(فروغ اردو جگر نمبر حصہ دوم ۶۱ اگست و ستمبر)

ادبی نقوش سے ماخوذ ایک مبسوط تبصرہ ہے جس میں جگر کی غزلوں کے محاسن کا بیان کیا ہے

۱۵۵ ندوی عبدالسلام

اردو شاعری اور فن تنقید

(معارف ۶۱ جولائی ۳۲_۴۶ ، اگست ۱۲۰_۱۳۴ ستمبر ۱۹۴_۲۰۷)

تیسری، چوتھی اور پانچویں قسط

۱۵۶ نذیر احمد ڈاکٹر

ملک قمی اور اسکے نثری رسالے

(اورینٹل کالج میگزین ۶۱ مئی ۱-۵۴)

فارسی کے مشہور نثار اور شاعر ظہوری کے خسر ملک قمی کے نثری رسالوں کا تعارف پیش کیا ہے

۱۵۷ نذیر محمد خان

اقبال اور تصوف

(سب رس، حیدرآباد ۶۱ جولائی ۳-۱۱)

افلاطون اور حافظ کے بر خلاف اقبال کے سارے فلسفے کا خمیر اسلامی تصور زندگی سے اٹھتا ہے

۱۵۸ نصیر اختر صدیقی

البرٹ کا میو اور اس کی ناول نگاری

(سب رس، حیدرآباد ۶۱ اگست ۱۲-۱۴)

فرانس کے مشہور ناول نگار اور نوبل انعام یافتہ البرٹ کامیو کی ناول نگاری پر تبصرہ کیا ہے

۱۵۹ نقی احمد ارشاد

مرثیہ اور موسیقار

(صبح نو پٹنہ ۶۱ جولائی ۸-۱۲)

فن مرثیہ خوانی میں موسیقی کی گنجائش پر زور دیتے ہوئے مشہور مرثیہ خواں میر علی، میر بندہ حسن اور میر علی حسن کا تذکرہ کیا ہے

۱۶۰ نیاز فتحپوری

جگر کی شاعری

(نگار ۶۱ اکتوبر ۱)

جگر کی شاعری پر تفصیلی تبصرہ کیا ہے

۱۶۱ وارث کرمانی

ادب اور نظریہ

(علی گڑھ میگزین ۶۱-۵۹ ۱۹ ص ۷۵-۸۸)

ہندوستان کی ادبی تاریخ کو پس منظر بناکر ادب اور نظریہ کا رشتہ تلاش کیا ہے۔

۱۶۲ وزیر آغا، ڈاکٹر

پطرس کی مزاح نگاری

(علی گڑھ میگزین ۶۱-۱۹۵۹ ص ۴۱-۴۸)

اردو میں مزاح نگاری کی تاریخ بتاتے ہوئے مزاح نگاری کا جائزہ لیا ہے۔

۱۶۳ وقار حسن

انیس سے قبل لکھنؤ کی مرثیہ گوئی

(علی گڑھ میگزین ۶۱-۱۹۵۹ ص ۸۹-۹۹)

میر انیس سے پہلے شمالی ہند کی مرثیہ نگاری کا جائزہ ہے۔

۱۶۴ ویریندر پرشاد سکسینہ

رائے سُدھ ناتھ بلی فراقی

(قومی زبان کراچی ۶۱ یکم و ۱۶ جولائی ۱۹-۲۰)

دریا باد بارہ بنکی کے ایک گمنام شاعر کا تذکرہ ہے۔

۱۶۵ ویریندر پرشاد سکسینہ

رتن ناتھ سرشار

(قومی زبان کراچی ٦۱ یکم اگست ۲۲-۲۴)
فسانۂ آزاد کے مصنف سرشار کی حیات اور ان کی شاعری پر روشنی ڈالی ہے ۔

۱٦٦ ہاشمی فرید آبادی
اردو زبان کی حقیقت
(قومی زبان کراچی ٦۱ یکم و ۱٦ جولائی ۳۴-۳۸)
اردو زبان کی تاریخ اور اس کے ماخذ پر روشنی ڈالی ہے ۔

تعلیمات

۱٦۷ امتیاز علی عرشی
آداب المتعلمین اور طوسی
(فکر و نظر علی گڑھ ٦۱ جولائی ۱-۱۲)
تقابلی مطالعہ کرکے ثابت کیا گیا ہے کہ نہ تو یہ کتاب محقق طوسی کی تصنیف ہے اور نہ تعلیم المتعلم کا خلاصہ ۔

۱٦۸ محمد ریاض گھلوی
اقبال کا نظریۂ تعلیم و تربیت
(عارف لاہور ٦۱ ستمبر ۲۵-۳۲)
اقبال کے نظریۂ تعلیم و تربیت کی وضاحت کی ہے ۔

۱٦۹ محمد سلیمان
اصول تعلیم ، آداب درس و تدریس از افادات علامہ محمد بن ابراہیم کفانی (٦۳۹-۷۳۲)
(فاران ٦۱ جولائی ۲۰-۳۳)

متفرقات

۱۷۰ ایم . ایم . شریف (مصنف)
انوار حسین (مترجم)
فلسفۂ لذت کا اثر مغربی اقتصادیات پر
(ثقافت ۲۱ ستمبر ٦-۲۵)

۱۷۱ ڈار بشیر احمد
ہندی فلسفہ
(ثقافت ٦۱ اگست ۸-۲۵)

۱۷۲ قریشی اللہ بخش
عورت اور مرد کی مساوات
(فیض الاسلام راولپنڈی ٦۱ ستمبر ۳۳-۴۹)
اسلامی و معاشی نکتۂ نظر سے عورت اور مرد کی مساوات پر اظہار خیال کیا ہے ۔

۱۷۳ محمد ہاشم سید
آزاد جنسی اختلاط
(فاران ٦۱ اگست ۲۵-۳۲)

۱۷۴ معین الظفر ، ڈاکٹر
ارسطو کے سیاسی نظریات
(فکر و نظر علی گڑھ ٦۱ جولائی ۷۲-۱۰۸)
یونان کے مشہور فلسفی ارسطو کی زندگی اور اس کے سیاسی افکار سے بحث کی ہے ۔

نوائے ادب بمبئی

جلد ۱۳ | اپریل ۱۹۶۲ ع | شمارہ ۲

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	شذرات	پروفیسر نجیب اشرف ندوی	۲
۲	محرق قاطع برہان	قاضی عبدالودود	۵
۳	آئینہ سکندر	نصیر الدین ہاشمی	۱۳
۴	سرمایۂ کلام غالب	پروفیسر طالب کشمیری	۲۱
۵	مومن کی عشقیہ شاعری	پروفیسر یوسف سرمست	۳۰
۶	سید عبداللہ جائسی لندنی	سید محمود حسن قیصر	۳۹
۷	اکبر — ایک مطالعہ	پروفیسر امین چند شرما	۵۷
۸	اردو ٹائپ میں تلفظ کا مسئلہ	ڈاکٹر گیان چند	۶۶
۹	تبصرے		۷۲
۱۰	مقالہ نما (ضمیمہ)	حامد اللہ ندوی و دیگر مرتبین	۱-۱۲

شذرات

اگر یہ صحیح ہے کہ «سالے کہ نکوست از بہارش پیدا است» تو ہم کو خوش ہونا چاہئیے کہ یہ سال اردو ادب اور ادیبوں کے لئیے انشاء اللہ بہت مبارک سال ہوگا. اگر ایک طرف حکومت نے اردو کے دو دیرینہ ادیبوں کو معزز خطاب (پدما بھوشن) سے نوازا تو دوسری طرف ساہتیہ اکادمی نے اردو کے ایک مستند محقق و نقاد کی تازہ ترین تالیف کو اپنے گراں قدر انعام کے ذریعہ ان کا وہ حق ادا کیا جس کے وہ عرصہ سے مستحق تھے.

جناب جعفر علی خان اثر لکھنوی اور جناب نیاز فتح پوری وہ بزرگ ہیں، جنھوں نے تقریباً نصف صدی سے اپنے رشحات قلم سے گلستان ادب کی آبیاری ہی نہیں کی ہے بلکہ اس چمن کو نئے تختوں اور روشوں سے سجا کر اس کی زیبائش و آرائش اور قیمت و افادیت کو اور بڑھادیا ہے.

مولانا امتیاز علی عرشی ان خاموش کام کرنے والوں میں ہیں جو اخبار و رسائل کے صفحات پر تو بہت کم نظر آتے ہیں لیکن انھوں نے عربی، فارسی، اردو کی مختلف کتابوں کے عالمانہ ترتیب و تحشیہ کے ذریعہ اپنے لئے ایک بلند مقام پیدا کرلیا ہے. وہ ہندی سے بھی غافل نہیں اور شاہ عالم ثانی کے ہندی کلام کو اڈٹ کرکے اس مجلس میں بھی اپنی جگہ پیدا کرلی ہے.

ان کا ترتیب دیا ہوا غالب کا یہ دیوان ہم کو نہ صرف غالب کے موجودہ منتخب دیوان کا اچھا اڈیشن پیش کرتا ہے بلکہ اس میں وہ کلام بھی ہے جو نسخہ حمیدیہ میں موجود تھا اور اس کے علاوہ وہ بھی جو غالب نے نسخہ حمیدیہ کی ترتیب کے وقت شائد نظر انداز کردیا تھا. پھر مولانا عرشی کا محققانہ دیباچہ، فکر زا شرح اور معلومات بخش حواشی کے لحاظ سے. اس سلسلہ میں جو کام بھی ہوا ہے اس میں سب سے زیادہ ممتاز اور غیرفانی کارنامہ ہے. مولانا عرشی اپنے بلند مقام کی وجہ سے وہاں پہنچ جاتے ہیں جہاں ہم ارضی انسانوں کا گذر بہت مشکل ہے.

اس سلسلہ میں ہم کو اردو زبان کے کہنہ مشق. انسان دوست، وطن پرست، شاعر و معلم پروفیسر تلوک چند محروم کا بھی ذکر ضروری ہے. انھوں نے اردو

شاعری کے دامن کو وسیع کرنے اور اس کو نئے نئے رنگ کے پھولوں سے بھرنے کی جو کوشش کی ہے اس کا اقتضا یہ تھا کہ ملک و حکومت ان کی خدمات کا عملی ثبوت پیش کرے. اردو دوستوں کی طرف سے تو اس کا اظہار ان عقیدت مندانہ اجتماعوں سے ہوتا رہتا ہے جو وقتاً فوقتاً منعقد ہوتے رہتے ہیں لیکن اب حکومت پنجاب نے خلعت و انعام کے ذریعہ ان کی خدمات کا اعتراف کیا ہے.

اردو کے ان فضلا کے ساتھ ہی ساتھ ہم جناب آصف علی اصغر علی فیضی صاحب کو بھی مبارکباد دیتے ہیں کہ حکومت نے ان کی عربی و قانونی تصانیف و تالیفات اور تعلیمی و ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کو بھی « پدما بھوشن » کے خطاب سے سرفراز کیا ہے. جو لوگ ان کو جانتے ہیں وہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ اردو زبان سے ان کو بہت لگاؤ ہے چنانچہ خود مولانا عرشی نے دیوان غالب کے انتساب میں لکھا ہے کہ یہ فیضی صاحب کی پرخلوص فرمائش اور پیہم اصرار تھا جس نے ان کو اس کام پر آمادہ کیا. ان کی علمی خدمات کے اعتراف ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ وہ کیمبرج یونیورسٹی میں پروفیسر کی حیثیت سے جارہے ہیں اور ان کی یہ عزت افزائی ہمارے لئے باعث فخر و مسرت ہے.

ہم ان پانچوں بزرگوں کو پر خلوص دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو گرانمایہ خدمات کے لئے عرصہ دراز تک عملی حیثیت سے جوان اور صحت و سکون کے ساتھ سلامت رکھے، آمین.

اردو کے سلسلہ میں ایک خوش آیند حقیقت یہ بھی ہے کہ ادھر چند برسوں سے مختلف جامعوں کے اساتذہ اور ان کے تربیت یافتہ رفقائے کار نے اردو کے اہم موضوعات پر اہم کام شروع کئے ہیں. کشمیر سے لے کر میسور و مدراس تک اور پنجاب سے لے کر مشرقی بنگال تک میں علمی و تحقیقاتی حیثیت سے قابل قدر کام ہورہا ہے. ایک طرف نایاب تذکروں کی اشاعت ہورہی ہے تو دوسری طرف نایاب کتابوں کو اڈٹ کرکے شائع کیا جارہا ہے، کچھ لوگ قدیم دکنی ادب کی ترتیب و اشاعت میں مصروف ہیں تو کچھ اردو ادب و زبان کی علاقائی تاریخیں ترتیب دے رہے ہیں. پھر ایک وہ باہوش و باخبر جماعت بھی ہے جو تمام کاموں

کا تعمیری جائزہ لیتی رہتی ہے۔ اگر یہی ذوق و شوق اور یہی دلبستگی باقی رہی تو انشاءاللہ اردو ادب کا سرمایہ بہت جلد وزنی و وقیع ہوجائے گا۔

ادھر انجمن ترقی اردو (ہند) نے بھی اردو زبان و ادب کی ترویج کی طرف عملی قدم بڑھایا ہے۔ اردو کی تعلیم و ترقی کے سلسلہ میں املاء و اعراب کے مسائل کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ وقتاً فوقتاً انفرادی اور اجتماعی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کی جاتی رہی، چنانچہ عرصہ ہوا خود انجمن نے اپنے عہد قدیم میں اس سلسلہ میں ایک تجویز پر عمل کرنا شروع کردیا تھا لیکن کچھ دنوں بعد خود انجمن کی کتابوں میں سے بھی وہ نظر انداز کردی گئی تھی، لیکن آج کل اس سلسلہ میں مختلف لوگوں نے مختلف زاویوں سے اس کو سوچنا شروع کیا ہے اور اسی نئی رو سے متاثر ہوکر انجمن نے ایک کمیٹی اس سلسلہ پر از سر نو غور کرنے کے لئے بنائی ہے۔ امید ہے کہ یہ کمیٹی ایسے اصول مرتب کرے گی جو اردو کے لکھنے پڑھنے اور چھاپنے کے سلسلہ میں زیادہ آسانی اور کم سے کم رکاوٹ پیدا کریں گے۔

گذشتہ شمارہ میں ہم ڈاکٹر محمد حفیظ سید کے انتقال کی خبر دے چکے ہیں۔ خاکسار کو ان کی خدمت میں تیس بتیس سال سے نیاز حاصل تھا اور نیازمندی کے صرف دو اسباب تھے۔ ایک ان کی بزرگانہ شفقت اور دوسرے اردو سے ان کی بے پایاں محبت۔ ادارہ کے قیام کے وقت ہی سے ان کو اس سے کافی دلچسپی پیدا ہوگئی تھی اور اس کا زندہ ثبوت دو ہزار کی وہ رقم ہے جو انہوں نے اپنے وصیت نامہ میں ادارہ کے لئے چھوڑی ہے۔ ہم کوشش کررہے ہیں کہ اس رقم کو کسی ایسے کام میں صرف کریں جس سے ایک طرف ان کی یادگار باقی رہے اور دوسری طرف زبان و ادب کے شوقین اس سے ہمیشہ فائدہ اٹھا سکیں۔

نواے ادب ممبئی

جلد ۱۳ | اپریل ۱۹۶۲ ع | شمارہ ۲

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	شذرات	پروفیسر نجیب اشرف ندوی	۲
۲	محرق قاطع برہان	قاضی عبدالودود	۵
۳	آئینہ سکندر	نصیر الدین ہاشمی	۱۳
۴	سرمایۂ کلام غالب	پروفیسر طالب کشمیری	۲۱
۵	مومن کی عشقیہ شاعری	پروفیسر یوسف سرمست	۳۰
۶	سید عبداللہ جائسی لندنی	سید محمود حسن قیصر	۳۹
۷	اکبر ـــ ایک مطالعہ	پروفیسر امین چند شرما	۵۷
۸	اردو ٹائپ میں تلفظ کا مسئلہ	ڈاکٹر گیان چند	٦٦
۹	تبصرے		۷۲
۱۰	مقالہ نما (ضمیمہ)	حامد اللہ ندوی و دیگر مرتبین	۱ـ۱۲

شذرات

اگر یہ صحیح ہے کہ «سالے کہ نکوست از بہارش پید است» تو ہم کو خوش ہونا چاہئیے کہ یہ سال اردو ادب اور ادیبوں کے لئے انشاء اللہ بہت مبارک سال ہوگا۔ اگر ایک طرف حکومت نے اردو کے دو دیرینہ ادیبوں کو معزز خطاب (پدما بھوشن) سے نوازا تو دوسری طرف ساہتیہ اکادمی نے اردو کے ایک مستند محقق و نقاد کی تازہ ترین تالیف کو اپنے گراں قدر انعام کے ذریعہ ان کا وہ حق ادا کیا جس کے وہ عرصہ سے مستحق تھے۔

جناب جعفر علی خان اثر لکھنوی اور جناب نیاز فتح پوری وہ بزرگ ہیں، جنھوں نے تقریباً نصف صدی سے اپنے رشحات قلم سے گلستان ادب کی آبیاری ہی نہیں کی ہے بلکہ اس چمن کو نئے تختوں اور روشوں سے سجا کر اس کی زیبائش و آرائش اور قیمت و افادیت کو اور بڑھادیا ہے۔

مولانا امتیاز علی عرشی ان خاموش کام کرنے والوں میں ہیں جو اخبار و رسائل کے صفحات پر تو بہت کم نظر آتے ہیں لیکن انھوں نے عربی، فارسی، اردو کی مختلف کتابوں کے عالمانہ ترتیب و تحشیہ کے ذریعہ اپنے لئے ایک بلند مقام پیدا کرلیا ہے۔ وہ ہندی سے بھی غافل نہیں اور شاہ عالم ثانی کے ہندی کلام کو اڈٹ کرکے اس مجلس میں بھی اپنی جگہ پیدا کرلی ہے۔

ان کا ترتیب دیا ہوا غالب کا یہ دیوان ہم کو نہ صرف غالب کے موجودہ منتخب دیوان کا اچھا اڈیشن پیش کرتا ہے بلکہ اس میں وہ کلام بھی ہے جو نسخہ حمیدیہ میں موجود تھا اور اس کے علاوہ وہ بھی جو غالب نے نسخہ حمیدیہ کی ترتیب کے وقت شائد نظر انداز کردیا تھا۔ پھر مولانا عرشی کا محققانہ دیباچہ، فکر زا شرح اور معلومات بخش حواشی کے لحاظ سے، اس سلسلہ میں جو کام بھی ہوا ہے اس میں سب سے زیادہ ممتاز اور غیرفانی کارنامہ ہے۔ مولانا عرشی اپنے بلند مقام کی وجہ سے وہاں پہنچ جاتے ہیں جہاں ہم ارضی انسانوں کا گذر بہت مشکل ہے۔

اس سلسلہ میں ہم کو اردو زبان کے کہنہ مشق، انسان دوست، وطن پرست، شاعر و معلم پروفیسر تلوک چند محروم کا بھی ذکر ضروری ہے۔ انھوں نے اردو

شاعری کے دامن کو وسیع کرنے اور اس کو نئے نئے رنگ کے پھولوں سے بھرنے کی جو کوشش کی ہے اس کا اقتضا یہ تھا کہ ملک و حکومت ان کی خدمات کا عملی ثبوت پیش کرے ۔ اردو دوستوں کی طرف سے تو اس کا اظہار ان عقیدت مندانہ اجتماعوں سے ہوتا رہتا ہے جو وقتاً فوقتاً منعقد ہوتے رہتے ہیں لیکن اب حکومت پنجاب نے خلعت و انعام کے ذریعہ ان کی خدمات کا اعتراف کیا ہے ۔

اردو کے ان فضلا کے ساتھ ہی ساتھ ہم جناب آصف علی اصغر علی فیضی صاحب کو بھی مبارکباد دیتے ہیں کہ حکومت نے ان کی عربی و قانونی تصانیف و تالیفات اور تعلیمی و ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کو بھی « پدما بھوشن » کے خطاب سے سرفراز کیا ہے ۔ جو لوگ ان کو جانتے ہیں وہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ اردو زبان سے ان کو بہت لگاؤ ہے چنانچہ خود مولانا عرشی نے دیوان غالب کے انتساب میں لکھا ہے کہ یہ فیضی صاحب کی پرخلوص فرمائش اور پیہم اصرار تھا جس نے ان کو اس کام پر آمادہ کیا ۔ ان کی علمی خدمات کے اعتراف ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ وہ کیمبرج یونیورسٹی میں پروفیسر کی حیثیت سے جارہے ہیں اور ان کی یہ عزت افزائی ہمارے لئے باعث فخر و مسرت ہے ۔

ہم ان پانچوں بزرگوں کو پر خلوص دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو گرانمایہ خدمات کے لئے عرصہ دراز تک عملی حیثیت سے جوان اور صحت و سکون کے ساتھ سلامت رکھے ، آمین ۔

اردو کے سلسلہ میں ایک خوش آیند حقیقت یہ بھی ہے کہ ادھر چند برسوں سے مختلف جامعوں کے اساتذہ اور ان کے تربیت یافتہ رفقائے کار نے اردو کے اہم موضوعات پر اہم کام شروع کئے ہیں ۔ کشمیر سے لے کر میسور و مدراس تک اور پنجاب سے لے کر مشرقی بنگال تک میں علمی و تحقیقاتی حیثیت سے قابل قدر کام ہورہا ہے ۔ ایک طرف نایاب تذکروں کی اشاعت ہورہی ہے تو دوسری طرف نایاب کتابوں کو اڈٹ کرکے شائع کیا جارہا ہے ، کچھ لوگ قدیم دکنی ادب کی ترتیب و اشاعت میں مصروف ہیں تو کچھ اردو ادب و زبان کی علاقائی تاریخیں ترتیب دے رہے ہیں ۔ پھر ایک وہ باہوش و باخبر جماعت بھی ہے جو تمام کاموں

کا تعمیری جائزہ لیتی رہتی ہے۔ اگر یہی ذوق و شوق اور یہی دلبستگی باقی رہی تو انشاءاللہ اردو ادب کا سرمایہ بہت جلد وزنی و وقیع ہوجائے گا۔

ادھر انجمن ترقی اردو (ہند) نے بھی اردو زبان و ادب کی ترویج کی طرف عملی قدم بڑھایا ہے۔ اردو کی تعلیم و ترقی کے سلسلہ میں املاء و اعراب کے مسائل کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ وقتاً فوقتاً انفرادی اور اجتماعی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کی جاتی رہی، چنانچہ عرصہ ہوا خود انجمن نے اپنے عہد قدیم میں اس سلسلہ میں ایک تجویز پر عمل کرنا شروع کردیا تھا لیکن کچھ دنوں بعد خود انجمن کی کتابوں میں سے بھی وہ نظر انداز کردی گئی تھی، لیکن آج کل اس سلسلہ میں مختلف لوگوں نے مختلف زاویوں سے اس کو سوچنا شروع کیا ہے اور اسی نئی رو سے متاثر ہوکر انجمن نے ایک کمیٹی اس سلسلہ پر از سر نو غور کرنے کے لئے بنائی ہے۔ امید ہے کہ یہ کمیٹی ایسے اصول مرتب کرے گی جو اردو کے لکھنے پڑھنے اور چھاپنے کے سلسلہ میں زیادہ آسانی اور کم سے کم رکاوٹ پیدا کریں گے۔

گذشتہ شمارہ میں ہم ڈاکٹر محمد حفیظ سید کے انتقال کی خبر دے چکے ہیں۔ خاکسار کو ان کی خدمت میں تیس بتیس سال سے نیاز حاصل تھا اور نیازمندی کے صرف دو اسباب تھے۔ ایک ان کی بزرگانہ شفقت اور دوسرے اردو سے ان کی بے پایاں محبت۔ ادارہ کے قیام کے وقت ہی سے ان کو اس سے کافی دلچسپی پیدا ہوگئی تھی اور اس کا زندہ ثبوت دو ہزار کی وہ رقم ہے جو انہوں نے اپنے وصیت نامہ میں ادارہ کے لئے چھوڑی ہے۔ ہم کوشش کررہے ہیں کہ اس رقم کو کسی ایسے کام میں صرف کریں جس سے ایک طرف ان کی یادگار باقی رہے اور دوسری طرف زبان و ادب کے شوقین اس سے ہمیشہ فائدہ اٹھا سکیں۔

* قاضی عبدالودود

محرق قاطع برہان

صفحہ ۱، ومن یضلل‌الله فماله من ہاد. الحمدلله که کتاب لاجواب ہدایت انتساب باسناد شعرائے اہل زبان ایران المسمّٰی به « محرق قاطع برہان [۱]- ۱۲۸۰ » تصنیف منیف جناب [۲]- سید سعادت علی صاحب بجواب قاطع برہان رقمزدۂ مرزا اسدالله غالب، در مطبع حیدری دلہائی (کذا) طبع شد. صفحہ ۲، میں بعد بسم الله الخ. ۱۱ سطریں ہیں، (مسطر ۱۹ سطری) حاشیے میں بعض الفاظ کے معانی درج ہیں (ازاں جمله فرگاه = حضرت) سطر ۱ یه ہے: « آدم ناچیز ذره مانند که بتاب مہر عنایت ذره نوازی چیز گفت چه تواند که سپاس آلاء »

۱ غالب نے محرق قاطع برہان کے خلاف دو رسالے لکھے، ایک کا کوئی نام نہیں، اور عبدالکریم کے طرف منسوب ہے، عبدالکریم یا تو وجود خارجی سے محروم ہے، یا بالکل مجہول الاحوال شخص ہے، دوسرا لطائف غیبی ہے جسے انہوں نے میاں داد خاں، سیاح کی طرف سے تحریر کیا ہے۔

۲ لطائف غیبی مین ہے ,, منشی سعادت علی نه نثر سے واقف نه نظم سے آگاه، نه عقل کا سرمایه نه علم کی دستگاه، کسی گاؤں میں کسی گھاٹ پر، کسی باٹ پر ان کا نام کسی سے نہیں سنا ،، ص ۲ غالب نے سعادت علی کو ,, سر رشتـه دار معزول ،، لکھا ہے۔ تیغ تیز مصنفه ۱۸۶۷ع میں یه عبارت ملتی ہے ,, میں تم کو صاحب محرق کا مقلد کہہ سکتا ہوں، اس شخص کو مجھ سے جامع برہان کی محبت کے سبب سے عداوت شدید ہو گئی تھی کیا عجب ہے که اس نے تم کو ڈھونڈ نکالا ہو، اور عرائض عجز آمیز، خشم انگیز متواتر لکھ کر مجھ پر برسر قہر لایا ہو. وه تھا کوڑیالا (کوڑیالا سانپ بھی ہوتا ہے، اور اسی کی رعایت سے یه لفظ آیا ہے)، یعنی مالدار. بھلا اگر دستمزد تحریر نہیں، نه سہی صرف مطبع و کاغذ اپنے بیت المال خاص سے بھجوا دیا ہوگا. خیر، اب منشی جی کے واسطے دعائے تخفیف عذاب ... مانگتا رہونگا،، ص ۲۷. ان کا علمی و ادبی مرتبه پست ہو یا بلند، سماج کے با عزت لوگوں میں ان کا شمار ہوگا، اور یه ہرگز گمنام محض نه ہونگے. انہوں نے اجمیر میں ایک مسجد بھی بنوائی تھی، جس کی تاریخ سبد چین اور باغ دو در دونوں میں موجود ہے۔ انہیں ,, معزول کہنا بھی صحیح نہیں، یه دوسری بات ہے که محرق قاطع برہان کی تحریر کے وقت اپنے عہدے سے علحده ہوچکے ہوں یه بات که صاحب موید برہان (تیغ تیز اس کا جواب ہے) کو سعادت علی کا ,, صرف مطبع و کاغذ ،، بھیجنا کہیں سے ثابت نہیں، بلکه اس کی مطلقاً شہادت موجود نہیں که دونوں میں کسی قسم کا تعلق تھا. قاطع القاطع (رد قاطع برہان) کے مصنف کی طرف البته محرق میں اشاره ہے ص ۶۴ تیغ تیز کی عبارت منقوله اس پر مشعر ہے که اس کے سپرد قلم ہونے سے قبل، سعادت علی کی وفات ہوچکی تھی.

* قاضی عبدالودود بیرسٹر پٹنه

تمہید مصنف کی عبارات ذیل قابل توجہ ہیں:

« پیش ازیں چند سالی[1] کتابی مسمّٰی بحدائق العجائب[2] بتقدیم لغات ہندی مستعملۂ زبان اردو و تاخیر لغات فارسی و عربی ہم معنی لغات ہندی مذکورہ مندرجۂ کتاب برہان قاطع، و فرہنگ رشیدی، و غیاث اللغات، و شمس اللغات وغیرہ فارسی، و صراح، و قاموس، وغیرہ عربی تالیف کردہ بودم (ص ۲). اکنوں شنفتم کہ مرزا اسد اللہ غالب بکمال استعداد نظم و نثر و وفور اخلاق کہ از مبدء فیاض عطا شدہ، نظیری ندارند، رسالہ باعتراض نادرست بودن لغات فارسی مرقومۂ کتاب برہان قاطع نگاشتہ اند ... پشیمان گشتم کہ چرا ایں قدر عرق ریزی در انتخاب لغات از برہان قاطع و تالیف ایں کتاب کردم. چوں آں رسالہ نزدم رسید، دیدم کہ دو صد و ہشتاد و چہار لغت اعتراض کردۂ مرزا ... دریں منقوشند. اکنوں خرد منداں ... داوری فرمایند کہ در اکثر کتب لغت زیادہ از پنج یا شش ہزار لغت نمی باشند، و در برہان قاطع ہژدہ ہزار و ہشت صد و ہشتاد ہفت لغت و در ملحقات آں سہ ہزار و چہار صد و سی و پنج لغت ... اند ... احدی از فرہنگ نویساں چنیں عرقریزی در ترتیب نکردیدہ، اگر سہو و غلط ... سرزدہ باشد ... جای طعنہ و سرزنش نیست. ہرگاہ کہ ایں نگارندہ لغات نادرست شمردۂ مرزا ... در تالیف خویش پژوہید بیست و چہار لغت ازاں جملہ برآمدند ... تصدیق و تصحیحش بدوں از کتب لغت مندرجہ اشعار اسناد اساتذہ سخنوران اہل زباں مناسب ندانستم. فرہنگ رشیدی و فرہنگ جہانگیری و مدار الافاضل و موید الفضلا و بہار عجم را نگریستم. اسناد تحریر لغات صاحب برہان قاطع و اجتہاد در رقم اعتراض مرزا ... ہویدا گشت، دانستم کہ مرزا ... کہ نام رسالہ را قاطع برہان کردہ ازیں قبیلست کہ ع برعکس نہند (ص ۳) نام زنگی کافور ... خواستم کہ ازیں اوراق ... را خاتمۂ ... حدائق العجائب سازم مگر ایں اوراق کہ بہ آگاہی اندفاع اعتراضہا و صحاح لغات برہان قاطع

---

١ عرق مطبوعہ میں ،، سالی ،، لیکن کسی نے ،، سال ،، بنانے کی کوشش کی ہے. رسالۂ عبدالکریم م
،، سالی ،، پر اعتراض ہے .

٢ کوئی غالب شناس اس کتاب سے واقفیت کا مدعی نہیں. خبر نہیں کہ چھپی بھی تھی یا نہیں .

مندرجۂ حدائق العجائب انـد ، گویا بمنزلۂ معرّف . . . اند ، لهذا ایں اوراق را مسمّٰی به محرق قاطع برہان کرده ، دیباچۂ نخستین کتاب پنداشته ، اول از دو دیباچۂ آں کتاب جاداده ام ، و خاتمۂ دگر نبشتم ، و ترتیب رقم پاسخہا بروش ترتیب رسالۂ مرزا . . . کرده شـده که سر آغاز لغت مع تعبیرش . . . برہان قاطع ، و سر آغاز اعتراض که قاطع برہان و تنبیه و فائده است براں لفظ قوله اضافه ساخته بعدش بر سر پاسخ اعتراض لفظ اقول نگاشتم ، و از بیست و چهار لغت در لغت نخستیں افسوس را در ضمن پاسخ اعتراض باختر ، دوم فراز را در ضمن جواب اعتراض آنچنیں نوشتـه ام (ص ۴) »

ذیل میں محرق کے مختلف مقـامات سے اس کی کچھ عبارات نقل کیے جاتے ہیں. غالب نے لکھا ہے کہ جامن ایران میں نہیں ہوتی ، اس کی فارسی کہاں سے آگئی، اس کا جواب یہ ہے :

« افمشه[1] از ولایت انگریزاں . . . می آید ، ہندیاں یک قسم جامه را نین سکھ و قسم دیگر را لٹھ گویند ، حال آنکه ہر دو جامه در ہند نمی باشند ، و نیں سکھ و لٹھ انگریزی ہم نیست . . . باغبانی بوتـۂ درخت آورده در صحن خانۂ ما نشانید ، گفتم چیست ، گفت درخت انگریز است ، نام ایں گل فانوس . گفتم نام انگریزی چیست . گفت ما گل فانوس میگویم دگر ہیچ . . . واقعی گلش بنقش گلہای که در فانوس شیشۂ انگریزی می شود مانا شـد . ہمیں روش اہل ہر ولایت چیزہای آمـدۂ دیگر ولایت را نامی بمناسبتی میدارند » ص ۱۰ .

غـالب نے وا اسفا کو افسوس سے مستخرج بتایا ہے ، اس کے باب میں صاحب محرق نے لکھا ہے :

مبدء فیاض ایں صنعت بخاص قابلۂ فکر « طبع سلیم[2] غلط مپسند جز براستی

---

۱ جامن کی فارسی آلوسیه بتائی گئی ہے . محرق کے جواب میں لطائف غیبی میں صرف یہ مرقوم ہے کہ ,, یوع کا پته دے کر منشی جی جامن کھانے چلے گئے ، اور آلوسیه کا جھگڑا نکالا ، مجھ کو آلوسیه میں الوسیه کی صورت نظر آئی ، منزجر و متنفر ہوکر بھاگا ،، ص ۱۱

۲ یه الفاظ غالب کے ہیں ، اپنے متعلق . قاطع برہان ص ۸۰

مپیوند » مرزا[1] ... عطا شد که سه لفظ تازی توام که یک ازاں با سراپا یعنی مع وا حرف ندبه و الف مد صوت است از بطن یک لفظ پارسی جامد استخراج کرده ، و شور زمزمهٔ زاج سور این عجیب الخلقت در گوش رہروان وادی گفتار ایجاد زبدانی انداختـه . حیرانم که مرزا ... بیان مولود شریف لغات عجائب المخلوقات کرده ، یا اظہار اضغاث احلام خود فرموده .
بہرحال این تعبیر مرزا ... بمثابهٔ این شعر است :

پہلے تو روغن گل بھینس کے انڈے سے نکال ☆ پھر دوا جتنی ہے کل بھینس کے انڈے سے نکال » ص ۱۹

تو من (تمن) کی بحث میں ہے :

یاد دارم ہنگامی که میر منشی دفتر فارسی محکمهٔ عالیه صاحب انتظام کل امور ... متعلقهٔ ... راجستـان بودم کاغذات از قصبهٔ جادو ... مضاف گوالیار معرفت محکمه نیمچھ می‌آمدند ، در آن بجای لفظ تحصیلدار تمندار نگاشته میشد ، نه معلوم که چندین ده تحت وی بودند و پیش ازیں در فوج بادشاه دہلی در یکھزار پیاده ده تمن صد صد کس می بودند و افسر صد کس را تمندارمینامند ... تومن ... ترکیست ده بست را گویند ہرچه باشد و در محاورهٔ ہر ملک تمن بمعانی مختلف مستعملست و تومان در ملک روم نام زر مسکوک و بدانست خاکسار ... در آن ده که تمندار قیام داشته باشد ، آن راتمن گفتـه باشند ازروی مجاز . ص ۳۷

بحث جمدھر میں ہے :

ہمه کسان بل ہمه اطفال دہلی که بریسمان بادفر میپرانند و بران بادفر نقش برینصورت که برحاشیه نگاشته ام از کاغذ رنگین تراشیده میچسپانند و آن بادفر را کٹار دار جمدھر نیز گویندو . ورای این تحریر حکایت و کبت و دوہره بیان کردهٔ پندت دامودر دت باشنده بلبگڈھ اکنون قیام پذیر دہلی بوجه ثبوت اتحاد مصداق کٹار و جمدھر بقلم می آرم که ظالم سنگھ قرابتـدار راجه اجیت سنگھ جدالجد راجه ناہر سنگھ رئیس بلب گڈھ مہلوک بجرم سرکار انگریزی پیش از ہفتاد و دو سال بر ہانیدن بہرهٔ زمین از راجه

---

۱ اس مقالے میں جہاں بھی مرزا کے بعد نقطے ہیں «مرزا» کے بعد «اسد الله غالب» مرقوم ہے لطائف ص ۴ میں اس کی شکایت ہے : «آدھا نام لکھتے ہیں یعنی «مرزا اسد الله غالب» ہائے فردوسی ... کیا خوب لکھا ہے : «چوں اندر تبارش بزرگی نبود   نیارست نام بزرگاں شنود »

اجیت سنگھ متقاضی بر روزجی سیندھیه گشت، سنیدھیه مذکور که مہربانی بحال راجه اجیت سنگھ داشت خواست که از خشم لفظ کنوار (کذا) نسبت ظالم سنگھ از زبان بر آرد، ظالم سنگھ بی اتمام لفظ کنوار از کٹار کار سینـدھیه و راجه اجیت سنگھ ساخت کـه کبت و دوہره بـریں دالست

کبت : پت [1] جاتی پرتیت جاتی کُل ہُوکی ریت جاتی ہمت جاتی کدر جاتی سبھی یا نام دھاری کی. بانکوں میں بانک جاتی امینڈوں میں مینڈ جاتی دکھن میں ساکھ جاتی ہند کی کٹاری کی. کہیں ہر نام جائے گنگاکے پرتنگا نه ہوتی تو جد جاتی جالم سنگھ کھٹن کراری کی. جانی ایسی دل میں کٹاری موٹھ چلتی تو دل کی بینٹھ جاتی بینچ پن مالی کے.

دوہره، [2] :　اون گنگا مکھ سے کہا ان کھینچی جمدھار
وار کتھی پایا نہیں ان کر دینی پار

پس ازیں (ص ۴۱) ... احقر العبـاد از پندت ہری چنـد عمرش دراز باد که در علم شاسترو سنسکرت و دیگر علوم ہندیه نظیر خود در ینجا ندارد، پرسیـد که لفظ جم چـه معنی دارد، گفت که «چیزی ناگوار و شخصی ناگوار و سخت مزاج و حاکم جابر و بیرحم را گویند». گفتم که بعض میگویند کـه جم در سنسکرت عزرائیل راگوینـد ... گفت نی نی، مگر بمناسبت معانی مذکوره توان گفت، دگر گفت که جم نخست در زبان شاستریم ... بود بکثرت استعمال و تغیر لہجۀ مردم عوام جم گفتن آغازید ... ویم در شاستر بمعنی اثنین است که آن راجم نیز خوانند. باز پرسیدم که لفظ دھر که در جمدھر است و آن راکٹـار نیز گویند چه زبانست، گفت دھرمخفف دھار است، بس بوادید جم (ص ۴۳) بمعنی چیزی ناگوار، جم دھار بمعنی بسیـاربد دھار است، و بوادیدجم بمعنی اثنین ... جمدھار بمعنی دو دھاره این وجه اقرب مطاوبست ... دگر [3] منقوش خاطر

---

(۱) و (۲) مطابق اصل، میں صحت متن کا ضامن نہیں. بہت سی فارسی عبارتیں بھی صحیح نہیں معلوم ہوتیں، یه بھی مطابق اصل نقل ہوئی ہیں

(۳) ,,دگر،، سے ,,تصحیف دندان عزرائیل،، تک نسخه کتبخانه خدابخش کے حاشیے میں ہاتھ سے لکھا ہوا ہے، میں جاننا چاہتا ہوں که دوسرے نسخوں کا کیا حال ہے.

نگرندگان این صفحه میکنم کـه حکیم حسین تبریزی نه جم راعزرائیل، نه دهر را دندان نبشته که مرزا اسد الله غالب بردندان عزرائیل اعتراض کرده بل بمشابهت جمدهر باناب که دندان نشتر است، جمدهر را دانت نگاشت و به نبودن جان بری زخمی جمدهر آن را دانت عزرائیل گفت چه درآن زمان بزبان ہندی آن ملک جمدهر را دانت عزرائیل گفته باشند از تصحیف دندان عزرائیل ص ۴۴.

لطائف ص ۳ کی عبارت ذیل غالبـاً محرق کی عبارت ہذا کے جواب میں ہے: «منشی جی [1] اپنے نزدیک بہت دور ہیں لکین اقتضای المرء یقیس، علی نفسه، سے مجبور ہیں، جس طرح منشی جی پر استاد سے فتح باب ہوا ہے جانتے ہیں کہ ہر شاگرد اپنے استاد سے اسی طرح فیضیـاب ہوا ہے»

اگر نزد مرزا ۰۰۰ بتعلیم ہرمزد ۰۰۰ فراوان کمـال و دانش آمرزگار از دوازده تا چهارده سالگی زیر شدن درست و پسند است، صاحب برہان قاطع آن ہم نوشته کـه فکانـه ۰۰۰ بکسرۂ کاف عربی ہم آمده ۰۰۰ مرزا ۰۰۰ ہنگام شوق وفور اعتراض تا آخر عبارت مانند عامل «لاتقربو الصلٰواة» پیش ندیدند، اگر میدیـدند (کذا) زیر وزبر راہم میدیدند ص ۵۴.

شورامه: [2] شورطعم ذائقه وہم غوغاست و امه بالف و میم وہای ہوز بمعنی دوات و توده و پشته است ص ۶۳.

ایک جگہ غالب کے لئے ایک نسخه تجویز کیا ہے، اور حکیم محمود خان کی طرف رجوع کرنے کا مشوره دیا ہے:

«مرزا ۰۰۰ غالب ناروا دل رامیسوزاند، و برائے رفع سوزش دل ۰۰۰ نسخۂ عجیب سریع التا ثیر مجوز است که قرص کافور عجب و پندارنکردن خود بین خود پسند نبودن برگروه دیگر رشک و حسد نبردن صنـدل شکیبائی و تحمل و بردباری و شربت انارین شیرین زبانی و ترش کلام نکردن ہر روز صبح و شام استعمال فرمایند ۰۰۰۰ و فصد با سلیق بنما یشهای خویش نیک کار دیگر را بید نسبت نکردن ہمراه عرقی

---

(۱) میں نے عبدالصمد پر جو مضمون لکھا ہے اس کی تحریر کے وقت محرق موجود نہ تھی، اس کے چند اقتباسات تھے، جن میں ,,اگر نزد الخ،، نہ تھا.

(۲) شورامه مستعملۂ غالب، عبارت محرق حاشیه محرق میں ہے. لطائف میں اس پر اعتراض ہے کہ شورامه کو شورابه سمجھے. میں نے اگر کہیں یه لکھا ہے که صاحب محرق نے اس لفظ کو غلط کہا ہے اور سند مانگی ہے تو یه ٹھیک نہیں غالباً صاحب موید برہان نے اسے غلط کہا ہے میں نے کسی فرہنگ میں اسے نہیں دیکھا

در ابتدا ہم درست مگر بنظر پیری و نقاہت ... و نیز باینکہ این مرض از پنجاہ و دو سالست اخراج خون ... پس ازیں قدر مدت کہ یبوست لازم اینچنیں سوزشست سبب زیادتی یبوست گردد، بہتر اینست کہ ... پیش حکیم محمود خان[1] کہ مسیح زمان خود ... اند، اظہار این مرض فرمایند و آنچہ حکیم محمود خان ... رقم زنند، یا تجویز ماءالجبن کند، ہمان نمایند ص ۶۵

عبارت ذیل عبدالصمد والے مضمون میں میں نے نقل کی ہے:

«مرزا دو سال در عمر سیزدہ و چہاردہ سالگی در میوہ خوردن و کلاہ زردوزی کج نہادن روبروی ہرمزد ... گزرانیدہ باشد و سوای چند الفاظ پارسی غیر مشہور کہ وی ہمیں دانستہ باشد، نیاموختہ، و اگر باور کنم کہ وی زباندان و عالم پازند بود تا ہم بچۂ سیزدہ و چہاردہ سالہ بجز خور و پوش بدیگر امور علم افزای خرد و ہوش کے می پردازد و استعداد فارسی و سخنوری کے پیدا کردن می تواند. مرزا ... ہرچہ می خواہد از راست و ناراست بحوالۂ آموزگار مذکور می گوید و حاشا ثم حاشا می خواند.» ص ۶۸

۲۲ فصول کا خاتمہ ص ۸۶ میں ہوتا ہے اور اسی صفحہ سے خاتمے کا آغاز ہے، خاتمہ مشتمل «بر دو لطف و یک قبح» لطف اول میں غالب کے تین اصولی اعتراضوں کے جواب ہیں. (۱) مشتقات کا مصدر پر تقدم (۲) لغات مشہورہ کا اندراج (۳) ایک لغت کی ایک سے زیادہ شکل. لطف دوم میں فرہنگ جہانگیری[2] و فرہنگ رشیدی کے ماخذ کے نام ہیں. قبح میں غالب کے وہ قبیح[3] الفاظ درج ہیں جو انھوں نے صاحب برہان قاطع کے حق میں استعمال کئے ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں: «چادر را گذاشتن و مادر را آوردن بیحیائیست» «این مرد در ژاژ خوانی ہمتا ندارد» «عامی اعمیٰ» «کفش آورد کہ ہمیں را درخوراست» (غالب

(۱) لطائف میں اس پر یہ اعتراض ہے کہ ایک خاص طبیب کا نام اس جگہ کیوں لکھا

(۲) اس میں بہت سی ایرانیوں کی فرہنگیں بھی ہیں. لیکن اس کے باوجود غالب نے لطائف میں یہ دعوی کیا کہ کسی زمانے میں کسی ایرانی نے فرہنگ نہیں لکھی، سب فرہنگیں ہندوستانیوں کی مولفہ ہیں. یہ بات جس کا اعادہ قاطع برہان اشاعت ۲ میں بھی ہے، لطائف سے قبل ان کے قلم سے نہیں نکلی

(۳) محرق میں سب جمع نہیں کئے

نے بجاے است «دانست» لکھا ہے). «ہیچ کس نمیبیند که از دہان ایں کس چه فرو میریزد» (اس سے قبل بول و غائط ، کا ذکر) «چغد . . . ویرانه و غول . . . بیاباں . . » «به (با) غالب) کدام خرس در جدال شده ام» «بعد از دغدغهٔ رفع ایلاوس میگوید» (رفع دغدغهٔ ، غالب) «آیا کسی از غمخواراں . . نبود که ہرگاه ایں بیچاره آہنگ نوشتن برہان قاطع کرد ، و آں مقدمهٔ جنوں بود ، خون خرس بگلو می ریخت ، و ببینی میدمید و بکف پای میمالید ، تا از رنج سودا میرست و لب از ہذیان می بست» «دکنی سوختنی» «دکنی . . . اینجا واژ گوں خفت» «اگر تمسخر نیست جنوں خواہد بود» «نزد جمہور کلام فحش و منکر بدتر از حبس و قتال و ضرب وغیره است . . . علاوه ازیں الغیبة اشد من الزنا ، ورای بد گفتن زندہا مرده ہا ہم ممنوع . . . است که حدیث . . . بدیں دانست ، اذکرو فحاش موتا کم و کفو عن مسا ویہم . . . نه معلوم که مرزا . . . با وجود ادعای خود باسلام خلاف قرآن و حدیث . . . و قانون عیسائیاں و شاستران ہندواں و تورهٔ حاکماں بکه رہبر و از که مذہب و ملت اخذ کرده». اس کے بعد لکھا ہے که محمد حسین قیامت میں داد خواه ہوگا ، اور بطور سزا غالب کے اعمال میں سے وه جو پسند آئینگے محمد حسین کے اعمال قرار دئے جائینگے [1] «والا آنچه شد نیست خواہد شد»

خاتمے کے آخر میں یه عبارات ہیں «قد حصل الفراغ من تسوید ہٰذه‌الاوراق فی یوم‌الجمعه التی وقعت فیه غرة محرم‌الحرام سنة ثمانین و مأتین والف من ہجرة‌النبویة صلی‌الله علیه وسلم»

اس کے بعد شیخ احمد کاتب کا قطعهٔ تاریخ فارسی ہے ، اور بالکل آخر میں یه عبارت ہے [2] : در مطبع احمدی واقع شاہدره دلہائی باہتمام امو جان طبع شد» ص ۹۶

میر سعادت علی کو نثر لکھنے کا سلیقه نہیں ، محرق میں اغلاط طباعت بھی ہیں ، جن کی تصحیح کے لئے غلط نامه شامل نہیں .

---

(۱) لطائف میں اس کا جواب یه ہے که اگر ایسا ہوا تو صاحب محرق کے اعمال حسنه غالب کے اعمال قرار دئے جائینگے ... غالب رند مشرب برابر رہا ، دکنی بچا ، منشی دھرا گیا .»

(۲) یه آخری صفحه محرق کا ہے ، قاطع برہان اشاعت اول بھی ۹۶ صفحات پر مشتمل ہے اور اس کی تقطیع بھی (غالباً) وہی ہے جو محرق کی ہے ، لیکن قاطع کا مسطر ۲۳ سطری ہے ، اور اس کی ایک سطر میں محرق کی ایک سطر سے زیاده عبارات ہیں .

* جناب نصیر الدین ہاشمی صاحب

آئینہ سکندر

یعنی

بمبئی کا پہلا اردو اخبار (۱۸۳۴ ع)

اردو اخباروں کے متعلق کئی ایک کتابیں اب تک شایع ہوئی ہیں جن میں شمالی ہند اور دکن کے اردو اخباروں کی صراحت درج کی گئی ہے. ان کتابوں میں خصوصیت سے دو کتابیں جو حال میں شائع ہوئی ہیں قابل تذکرہ ہیں یعنی (۱) ہندوستانی اخبار نویسی، از مولوی محمد عتیق صاحب صدیقی. (۲) تاریخ صحافت، از مولانا امداد صابری.

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ دونوں کتابیں بڑی تحقیق، تجسس اور کد و کاوش سے لکھی گئی ہیں، مگر ابھی ان کو جامع و مکمل نہیں کہا جاسکتا کیونکہ آئے دن کوئی نہ کوئی جدید اخبار کا پتہ چل جاتا ہے. چنانچہ ایک جدید اخبار آئینۂ سکندر کا پتہ چلا ہے جو بمبئی سے سنہ ۱۹۳۴ ع میں جاری ہوا تھا.

آئینۂ سکندر کا ایک فائل حیدر آباد میں محفوظ ہے جو ہم کو عبدالحی صاحب ایم. اے. کی مہربانی سے دستیاب ہوا ہے. یہاں اس کی صراحت کی جاتی ہے

آئینۂ سکندر در اصل فارسی اخبار ہے مگر سنہ ۱۸۳۴ ع میں اس کا ضمیمہ اردو ہی میں شائع ہونے لگا ہے. اخبار (۱۲ × ۸) سائز کے بارہ صفحے پر ہفتہ وار ہر پنجشنبہ کو بمبئی سے شائع ہوتا رہا ہے. اس کے ایڈیٹر فضل حق صاحب تھے اور مسٹر رامس کے پریس میں طبع ہوتا تھا. اس فائل میں فارسی اخبار سنہ ۱۸۳۳ع سے شامل ہیں. صفحات کی تعداد مقرر نہیں ہے بلکہ کم و زیادہ ہوتی رہی ہے. کاغذ دیدہ زیب مضبوط ہے. اس فائل میں اردو ضمیمے کے صرف چار پرچے ہیں جن کی تاریخیں حسب ذیل ہیں.

---

* جناب نصیرالدین ہاشمی صاحب. کٹل منڈی، حیدرآباد (آندھرا پردیش)

(۱) ۳ اپریل سنہ ۱۸۳۴ ع مطابق ۲۳ شہر ذیقعدہ سنہ ۱۲۴۹ ھ
(۲) ۲۴ اپریل سنہ ۱۸۳۴ ع مطابق ۱۲ ذی الحجہ سنہ ۱۲۴۹ ھ
(۳) ۲۶ جون سنہ ۱۸۳۴ ع مطابق ۱۷ صفر سنہ ۱۲۵۰ ھ
(۴) ۲۴ جولائی سنہ ۱۸۳۴ ع

اخبار کا ٹائیٹل یعنی پہلا صفحہ اس طرح ہے۔

بمبئی
آئینۂ سکندر

نمبر ۱۰۵ تاریخ ۲۴ اپریل سنہ ۱۸۳۴ ع مطابق ۱۴ شہر ذیحجہ سنہ ۱۲۴۹ ھ
روز پنجشنبہ

آئینـــۂ سکندر جام جہان نمـا ہے ٭ ملکوں کی کیفیت ہے اور طرفہ ماجرا ہے

اس کے بعد دو کالموں میں نفس مضمون کی صراحت ہوئی ہے۔ ہر ملک کی خبر علاحـدہ علاحدہ لکھی ہے مگر اسی شہر یا ملک کے مختلف واقعـات ایک ساتھ بلا کسی فصل یا علاحـدہ فقرہ کے لکھے گئے ہیں یعنی گویا مسلسل مضمون بن گیا ہے۔ ابتدائی شعر تبدیل بھی ہوگیا ہے چنانچہ کئی اخباروں میں یہ شعر ہے۔

از فضل حق بمبئی مطبوع شد منور ٭ آئینـۂ سکندر حسب الامر گورنر

اس شعر سے ثابت ہوتا ہے کہ گویا یہ نیم سرکاری اخبار تھا کیونکہ گورنر کے حکم سے شائع ہوتا تھا۔

یہاں فارسی اخبارات کو متروک کر کے اردو پرچوں کی مزید صراحت کی جاتی ہے۔ جیسا کہ صراحت کی گئی ہے۔ اس میں مختلف شہروں کی خبریں درج ہوتی رہی ہیں۔ اور اکثر عنوان کا آغاز کسی شعر سے کیا گیا ہے۔ عبارت کے درمیان بھی اشعار آتے گئے ہیں۔

چند عنوان اور چند اشعار یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) بغداد کی خبر (۲) عجیب خبر (۳) مدراس کی خبر (۴) دہلی کی خبر (۵) انـدور کی خبر (۶) منی رام سیٹھ کے احوال (۷) گوالیر کی خبر (۸) یورپ کی خبر، روسیوں اور ترکوں کی خبر (۹) بمبئی کی خبر (۱۰) چوری کی خبر۔

چند شعر ملاحظہ ہوں۔

شہروں کا ماجرا بد ست و قلم؟ ٭ چیدہ چیدہ کیا ہے میں نے رقم

اسپین کی خبر

کچھ نہیں دنیا دوں کو اعتبار ٭ لیک کار خیر ہیں نت برقرار

خبر شاہ فرانس و سلطان افریکا

ہے زمانے کا بس یہی اسلوب ٭ ایک غالب ہے دوسرا مغلوب

خبر دار السلطنت لکھنؤ

مالک ملک شاہ عالی جاہ ٭ رہے حاتم (قائم؟) ہمیشہ شام پگاہ

سردھنہ کی خبر

اپنی دانائی سے جو کوئی ہو مشیر ٭ کار مشکل اس کے ہوں رونق پذیر

خبر لاہور

میں کروں ہوں رقم یہ حال وزرا ٭ جو ہے مشہور اعظم الامرا

ان عنوانوں کے تحت جو واقعات لکھے گئے ہیں ان میں سے ایک نمونہ ملاحظہ ہو جو دار السلطنت لکھنؤ کے تحت لکھا گیا ہے۔

واضح ہو کہ اس زمانہ میں سلطنت اودھ موجود تھی سلاطین اودھ حکومت کرتے تھے۔ یہ سلطان نصیر الدین حیدر کا زمانہ تھا[1]۔

«حضور کا حکم اشرف روشن الدولہ بہادر کے نام سے یوں ہوا ہے کہ حضرت امیر المومنین علی مرتضیٰ کی شہادت کے روز تابوت جو حضرت عباس کے روضہ میں لے جاتے ہیں اثناء راہ میں بہ سبب مذہب کے دونوں فرقوں سے جنگ و جدل ہمیشہ ہوا کرتا ہے ایسا بندوبست کیجیو کہ کوئی بات بے موقع نہ ہونے پاوے اور کسی کی زبان سے بری بات نہ نکلے۔ چنانچہ بموجب ارشاد فیض بنیاد کے خوب ہی کارپردازان اہتمام عمل میں لایا اور ساری رعیت کو امن و امان کا منہ دکھلایا۔ راجہ درشن سنگ سے فرمایا کہ ہماری مرضی مبارک یوں ہے کہ تم ہمیشہ بارگاہ سلطانی میں حاضر رہا کرو اور ہمارے حضور برکت معمور سے جدا

۱۔ نصیر الدین حیدر بن غازی الدین حیدر ۳۰ اکتوبر سنہ ۱۸۲۷ع مطابق ۲۸ ربیع الاول سنہ ۱۲۴۳ ھ کو تخت نشین ہوئے اور ۷ جولائی سنہ ۱۸۳۷ ع مطابق ۳ ربیع الثانی سنہ ۱۲۵۳ ھ کو وفات پائی۔

نہ ہونا راجہ نے زمین خدمت کی چوم کر بہت ہی محظوظ اور نپٹ خورسند ہوا۔

ایک روز خود بدولت و اقبال نے بادشاہ باغ میں تشریف فرما کر زینت باغ کی رونق زیادہ بڑھائی اور وہاں سیر گل گشت میں مشغول تھے۔ اچانک نظر مبارک کئی درویشوں پر جاپڑی۔ راجہ مذکور سے مخاطب ہوکر پوچھے کہ یہ لوگ کون ہیں اس نے عرض کی کہ یہ درویش ہیں کامل اور فقیر ہیں روشن دل۔ حکم ہوا کہ پندرہ ہزار روپئے بطریق دعوت ان کے حوالے کرو۔

میرزا علی رضا بیگ کے آدمی اور راجہ درشن سنگھ کے کئی نوکروں کے فی مابین کوئی گذری ہوئی بات پر لڑائی ہوئی۔ یہاں تک کہ تلوار کی نوبت پہنچی۔ راجہ نے حضور اعلی میں میرزا کے نوکروں کی زیادتی ظاہر کی۔ حکم غضب ہوا کہ دو ہزار روپئے جرمانہ میرزا کے سپاہ سے لیویں کیونکہ بانی فساد وہی لوگ ہیں۔

بخشی پتر چند نے عرض کی کہ میرزا برق کی پلٹن کی تنخواہ بہت دنوں سے نہیں ملی۔ ظفر الدولہ بہادر کو حکم ہوا کہ تیس ہزار روپئے خزانہ عامرے سے لے کر بخشی گیری کی کچہری میں بھجوادیں تا انہیں تقسیم ہو۔

منا سنگھ ہرکارہ نے پرچہ نذر گذرانا اس مضمون پر کہ دو سو روپے بخشی لال جی نے رام چند سے بطور رشوت کے لئے ہیں۔ حکم قہر ہوا کہ راجہ درشن سنگھ فی الفور اس بدکردار کو ایسے برے اطوار سے منع کرے اور جس سے رشوت لی ہے وہی پیسا اس کے حوالے کرے۔

ظفرالدولہ کو ارشاد ہوا ہے سبھوں نے بالاتفاق تخت پر بٹھلایا تمام مملکیت اس کے قبضے اقتدار میں دے کر آپ مطیع اور فرمانبردار ہوئے۔ کہتے ہیں یہ بھی بادشاہ عادل اور سخی دیر ہمیشہ دریا دل رہا ہے» (؟)

عبارت بالا سے واضح ہوتا ہے کہ ایک جگہ کی مختلف خبریں کو علاحدہ علاحدہ لکھنے کی جگہ مسلسل لکھا جاتا تھا۔ اخبار ٹائپ میں طبع ہوا ہے اور بعض الفاظ خاص صورت میں لکھے گئے ہیں۔ مثلاً روپیہ کو «روپے» اعلی کو «اعلا» وغیرہ۔

اقتباس سے شاہ اودھ کی سیرت پر بھی روشنی پڑتی ہے. ان کی سخاوت، عدل اور انصاف، بیدار مغزی کا ثبوت ملتا ہے. رشوت لینے کی خبر بادشاہ کو معلوم ہوتی تھی اور اس کا انتظام کیا جاتا تھا.

« سردھنہ کی خبر » کا کسی قدر اقتباس موجب دلچسپی ہوسکتا ہے.

« ایک دن ساری رعیت نے بیگم سمروکے در دولت پر حاضر ہوکر فریاد کی کہ ہمیں غلے کی گرانی نے برباد کیا اور غلے فروشوں نے اپنے گھروں کو آباد. ہماری جانیں لبوں پر آئیں. رنج و تعب سے بہت گھبرائیں، غربا، فقراء، نادار مارے افلاس کے ہوگئے. ... بلکہ دولت مندوں کی بھی گذران عسرت پر آرہی ہے. گرانی سے سب کے ہوش و حواس جاتے رہے ... . بیگم موصوفہ نے دو تین غلے فروشوں کو بلوا کر تاکید شدید کی کہ اتنا اناج مہنگا بیچنا اور سستا نہ کرنا مناسب نہیں، چاہئے کہ روپے کے بیس سیر گیہوں بیچیں اور نہیں تو ہماری قید میں سب پابند ہوں گے.

« غلہ فروش بیگم سمرو کے حکم پر راضی نہیں ہوئے اور بیس سیر کے بجائے دس سیر بیچنے سے بھی انکار کیا اور سب کے سب واپس ہوگئے. بیگم سمرو نے اپنے حکم کی تعمیل کے لئے ایک نیا طریقہ اختیار کیا. تالابوں پر سپاہی متعین کر دئیے اور غلہ فروشوں کو پانی دینا بند کردیا. اس ترکیب سے غلہ فروش مجبور ہو گئے اور حسب ذیل عرض کیا.

« جس طور سے کہ بیگم صاحبہ نے ٹھیرایا تھا اسی پرچھہ ماہ تک راضی ہوئے اور عدول حکمی سے توبہ کئے اور گزارش کی کہ اگلا برس جو اچھا آئیگا تو اس سے زیادہ ارزاں بیچینگے. »

اس کیفیت سے واضح ہوتا ہے کہ گرانی کے انسداد کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا گیا.

سنہ ۱۸۳۴ ع کو آج سے مقابلہ کیا جائے تو واضح ہوگا کہ غلہ کی ارزانی کس طرح ہوئی اور بیگم سمرو نے رعایا کی پریشانی کا کس طرح انسداد کیا تھا.

۲۴ جولائی سنہ ۱۸۳۴ ع کے اخبار کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو.

دہلی کی خبر

« وہاں کے اخبار سے جو اٹھارھویں جون کی ہے دریافت میں آیا کہ شاہ شجاع الملک جو اندیس ندی کے اس پار فتح کرتا ہے اس کی تلاش میں ہم بہت امیدواری سے رھکر ڈھونڈھتے ہیں. ان دنوں کابل سے خبر آئی ہے اس سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ دوست محمد خان کے مرنے کی خبر چند روز کے آگے اڑی تھی سو سکھوں کی بندش کی افواہ تھی کہ پشاور کے حکومت والے کابل جائیں اور وہاں لوٹ مچائیں تو اطراف اکناف میں ہنگامہ فتنہ و فساد گرم نہ ہو، قندھار کی حکومت کرنے والوں کو شاہ شجاع الملک نے محاصرہ کیا ہے. قلعہ اس کے ہاتھ میں نہیں آیا. دوست محمد خان سے سنا کہ پشاور کو سکھوں نے ہی اس سبب اپنے بھائیوں کے مدد کی خاطر خود آپ قندھار جانے والا ہے .... »

منی رام سیٹھ کا احوال

منی رام سیٹھ کا چھٹکارا پچاس لاکھ رپے کے دینے سے ہو گیا. ہم یوں جانتے ہیں کہ اس شخص کو محنت و مشقت سے بچانے کی خاطر مسٹر کاوندش نے بھامئی اور خوبی سے اس کا ضامن اور مبلغ کا واجب الادا اپنے سر پر لیا ہے جبتک یہ شخص یعنی مسٹر مذکور درمیاں نہ تھا تب تک اس سیٹھ کے سبھی برا اور نا سزا کہتے تھے. ایسے لوگ کام تو اچھے محنت کے ساتھ کرتے ہیں لیکن آخر میں اسے بخوبی انجام (نہیں) دیتے ہیں ،

اخبار ٢٦ جون کا ایک اقتباس

بمبئی کی خبر

کچھ کارخیر کرلے بہت کم ہے زندگی ☆ نیکی نہووے تجھ سے تو صد حیف زندگی

« ہرکارہ بمبئی یہ خبر دیتا ہے کہ جو مجلس گداؤں محتاجوں کی پرورش کے واسطے اوایل میں مقرر ہوئی تھی اوس کی بعض تجویزیں رہگئی تھیں، سو ابھی جمعہ کے روز نویں تاریخ اس مہینے کی مجلس میں تمام اکابران شہر جمع ہوکر یہ مقرر کیا جو صلاح کار و مختار اس مجلس کے تھے

ان کے نام یہ ہیں: جان فبرش اسکویر، ریوریندر جے لاری، میجر مور. ریورنگ یانگ، فرام جی کاوس جی. جگناتھ شنکر سیٹھ، مسٹر میگنٹ. کپتان جیک، ہررکیسو ۰۰۰۰۰۰۰۰۰

بمبئی کی ایک دوسری خبر.

« تھوڑے دنوں سے اس دارالحکومت میں وبا کا مرض شدت سے پھیلا ہے. اس لئے سرکار دولت مدار نیک نام علی مقام نواب مستطاب گورنر صاحب بہادر اجلاس کونسل دام اقبالہ نے ہر ہر محلے اور بر ہر کوچے میں دوا خانے بناکر دواوں سے معمور کرکے کنٹری ڈاکٹر ؁ یعنی معالج اس ملک کے متعین کئے ہیں. ہر ایک شخص کو جو اس مرض میں گرفتار ہوجائے فی الفور اسے دوا دینا خوبی اور نیکی سزاوار کمپنی بہادر کی سرکار کی ہے. »

۲۴ اپریل سنہ ۱۸۳۴ ع
آئینہ سکندر جام جہاں

احوال پیالا شاہ حکیم کاظم علی خان کے باب میں. تاریخ بارھویں جمادیالثانی ۱۲۴۹ ھ کو آئینہ سکندر میں احوال پیالا شاہ اور منی رام کا بڑودے میں راجہ سیا جی راؤ کے پاس امرا میں حکیم کاظم علی خان نے بدذاتی اور عداوت سے ۰۰۰ کروایا تھا سو اب لکھے معتبر احوال مفصل حکم کی ابتداء سے معلوم ہوا وہ مختصر ظاہر کیا جاتا ہے کہ حکیم کاظم علی خان گوالیار میں دولت راؤ سندھئے کے پاس نوکر تھا. ایک قحبہ عورت بازارن کے واسطے بھائی حقیقی اپنےکو نوکروں سے مروا ڈالا سندھیہ نے تلاش قاتلوں کو حکم دیا حکیم نے ذمہ اپنا کرکے پہلوتھی کی کہ خود بانی حرکت تھا اور اس عورت کو اپنے گھر میں رکھا کہ اس کو دولڑ کے پیدا ہوئے کہ اب حکیم کے پاس بڑودے میں ہیں ان کا نام ہاشم علی خان اور دوسرے کا نام عالم علی خان ہے.

ایک حرکات نالایقی سرکار میں ظاہر ہوئی اور یہ بات بھائی کو مروا ڈالنے کی بھی ثابت ہوئی. تب سرکار سے نکالا گیا کہ یہ بات ظاہر ہے وہاں سے خراب خستہ تباہ حال حیدرآباد کو گیا. حکیم شفائی خان کہ مرد بزرگ اور مشہور ہیں ان سے ملاقات کی انھوں نے حکیم کاظم علی خان کو مہاراج چندو لال کے پاس نوکر رکھوایا. چند مدت کے بعد بد گوئی و غیبت شفائی خان پر روا رکھی. حق اور خوبی ان کی فراموش کرکے فعل بدذاتی کا نکالا. قول بزرگ کا درست ہے:

نکوئی بابـدان کردن چنان است ٭ کہ بد کردن بجائے نیک مردان

سوائے اس کے اور حرکت نالائق نسبت مہاراج چندو لال کے درمیان لایا، تب مہاراج چندو لال نے اس بدذات کو راتوں رات شہر حیدرآباد سے بدر کیا ...»

حکیم کاظم علی خان کی اعلی قابلیت اور اخلاق حسنہ کے متعلق حیدرآباد کے ایک معتبر تاریخ گلزار آصفیہ کا اقتباس ملاحظہ ہو.

« حکیم کاظم علی خان آصفجاہ ثالث کے زمانہ میں گوالیار میں دولت رائے سندھیہ کے یہاں تین ہزار روپیہ ماہوار پر ملازم تھے. سندھیہ کے فرزند سے ناواقفیت کی وجہ حیدرآباد آئے. راجہ چندو لال کے پاس تین ہزار روپیہ ماہوار پر ملازم ہوئے. دوسرے حکماء جس قسم سے علاج کرتے ہیں اس سے آپ اپنے فن میں بلند مرتبہ رکھتے تھے. فنی مہارت کے علاوہ اپنے اخلاق اور سخاوت بلند ہمتی ارباب احتیاج سے سلوک کے لحاظ سے ان کا درجہ اور بلند تھا. دو سال کے بعد جب اپنے وطن کی کشش غالب آئی تو دوبارہ گوالیار کو واپس ہوگئے اور وہاں خوبی سے اوقات بسر کرتے ہیں.»

تاریخ اور اخبار کا اختلاف اس سے واضح ہوسکتا ہے.

اخبار کے ان اقتباسات سے اخبار کے انداز بیان اور اس کے اسلوب کے علاوہ زبان کی بھی بخوبی وضاحت ہوجاتی ہے آج سے ایک سو تیس سال پہلے کی بمبئی کی زبان کا ایک صحیح اندازہ ہوجاتا ہے.

* پروفیسر طالب کشمیری

سرمایۂ کلام غالب

(۲)

حقیقت شعر و شاعری

شعر کی ماہیت یا حقیقت سے کیا مراد ہے اور شاعری کی تعریف کیا ہے. اس موضوع پر مغربی و مشرقی عالموں، ادیبوں اور نکتہ سنجوں نے اپنے اپنے زاویۂ نگاہ اور انداز تفکر سے اظہار خیال کیا ہے. اس سلسلے میں چند خیالات ملاحظہ فرمائیے: (۱) شاعری ایسا موزوں کلام ہے جو متکلم نے بالقصد موزوں کیا ہو. (۲) شاعری تخیل کا نام ہے اور تخیل ایک ایسی قوت ہے کہ معلومات کا ذخیرہ جو تجربہ یا مشاہدہ کے ذریعہ سے ذہن میں پہلے سے مہیا ہوتا ہے یہ اس کو مکرر ترتیب دے کر ایک نئی صورت بخشتی ہے اور پھر اس کو الفاظ کے ایسے دلکش پیرایہ میں جلوہ گر کرتی ہے جو معمولی پیرایوں سے بالکل یا کسیقدر الگ ہوتا ہے. (۳) مقدمات موہومہ کی ترتیب سے اچھی چیز کو بدنما اور بری چیز کو خوشنما ثابت کرنا شاعری ہے. (۴) شاعری وہ کلام ہے جو جذبات یا احساسات کو برانگیختہ کرسکتا ہو. (۵) شعر ایک قسم کی مصوری یا نقالی ہے لیکن مصور صرف مادی اشیاء کی تصویر کھینچ سکتا ہے اور شاعر ہر قسم کے خیالات جذبات اور احساسات کی تصویر کھینچ سکتا ہے، یعنی شاعری کسی چیز کا اسطرح بیان کرنا ہے کہ اس کی اصلی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جائے یا وہی اثر دل پر طاری ہوجائے یا بالفاظ دیگر جو شخص واقعات اور مظاہر قدرت سے عام لوگوں کی نسبت زیادہ متاثر ہو اور بعینہ اس اثر کو الفاظ سے بھی ادا کرسکتا ہو وہی شاعر ہے. (۶) شاعر کے لفظی معنی صاحب شعور کے ہیں. شعور اصل میں احساس کو کہتے ہیں یعنی شاعر وہ شخص ہے جس کا احساس قوی ہو. اس کی طبیعت پر جو خاص اثر پڑتا ہے اور موزوں الفاظ کے ذریعے سے ظاہر ہوتا ہے. اسی کا نام شاعری ہے. (۷) شعر الفاظ، وزن، نغمہ اور رقص کا نام ہے. (۸) جو

---

* پروفیسر ان ال کے طالب کشمیر ایم. او. ایل جموں و کشمیر یونیورسٹی سری‌نگر

خیال ایک غیر معمولی اور نرالے طور پر لفظوں کے ذریعے سے اس لئے ادا کیا جائے کہ سامع کا دل اس کو سن کر خوش یا متاثر ہو وہ شعر ہے خواہ نظم میں خواہ نثر میں۔ (۹) شعر حقائق زندگی کی گہرائیوں، تصوف یا عرفان اور فلسفہ بیان کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ (۱۰) شاعری وجدانی دنیا کا دوسرا نام ہے۔ شاعر اپنے فکر کی قوت، احساس کی ذکاوت اور خیال کی رفعت کے باعث وجدانیات ہی کی ترجمانی کرتا رہتا ہے۔ (۱۱) شاعری کا موضوع استقصاء حسن و عشق ہے۔ (۱۲) شاعری شیریں زبان مصوری ہے جس کا تعلق وقت سے ہے۔ (۱۳) شاعری خیال و احساس کے باطنی زمان و مکان کی توضیح و تعبیر ہے۔ (۱۴) شعر ایک سریلا خیال ہے۔ (۱۵) شاعری مثالیت کے مترادف ہے۔ (۱۶) شاعری ایک سلطنت ہے جس کی قلمرو اس قدر وسیع ہے جس قدر خیال کی قلمرو اور یہ ایسا عالمگیر علم ہے جس سے نہ تو کوئی وحشی قوم معرا رہی اور نہ کوئی صاحب علم قوم گریزاں۔ (۱۷) شعر جذبات کا ایک شعلہ اور خوشی کی کوئی لہر ہے۔ (۱۸) وہ کوئی ربانی چیز ہے۔ جو علم و حکمت کا مرکز بھی ہے اور محیط بھی۔ بہترین اور پر نشاط دماغوں کی بہترین پیداوار اور پر نشاط گھڑیوں کا مرقع ہے۔ (۱۹) وہ علم و فن سے بے نیاز علم کا نچوڑ اور جوہر لطیف یعنی بے ساختہ بول ہے جو ہیجان کے ساتھ ساتھ وفور لذت کا سرچشمہ بھی ہے۔ (۲۰) شاعری تخیل کے لئے جذبات عالیہ کا مجسم نغمہ ہے۔ (۲۱) خاص خدا ہی کی کوئی چیز ہے۔ (۲۲) شاعری دانش منظوم کا نام ہے۔ (۲۳) نظم دراصل ایک آلہ ہے جس سے شاعر اپنے باطنی تجربے کو اوروں تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ گویا اس کی واردات قلب کا ایک آئینہ ہے جس میں اوروں کو بھی اپنے دل کی بات نظر آتی ہے۔ (۲۴) شاعری جذبات کی وجدانگیز عکاسی اور تفریح طبع کا نام ہے۔ (۲۵) شاعری قوانین حسن و صداقت کے تابع تنقید حیات یا تفسیر حیات ہے۔ (۲۶) شاعری ذوق حسن اور لطافت جذبات کی مصوری ہے۔ (۲۷) شاعری دلی جذبات یا خیالات کا اظہار ہے جو شاعر وزن اور مناسب الفاظ کے ساتھ ادا کرتا ہے۔ (۲۸) شاعری جذبات کا اظہار اس طرح ہے کہ اس میں زندگی کی تنقید بھی ہو، تصویر بھی ہو اور تفسیر بھی۔ (۱۹) شاعری جزویست از پیغمبری۔

(۳)

شاعری میں مرزا کا مقام

شعر و شاعری کی منقولۂ بالا تعریفوں اور اس سے متعلق کم و بیش اسی قسم کے خیالات، کا دفتر بے پایاں مد نظر رکھا جائے تو وہ شخص جس کے کلام میں ان میں سے کوئی بھی پہلو جلوہ گر ہو عام طور پر شاعر کے نام سے موسوم کیا جاسکتا ہے لیکن اگر مجموعی طور پر ان سب نظریوں کو سمیٹ کر ایک معجون مرکب تیار کی جائے اور اس میں وہ تمام نکات بھی شامل کئے جائیں جو بعض خوردہ بین نگاہیں شعر و سخن میں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالنے کے درپے رہتی ہیں تو مرزا تو کیا شاید دنیا کا کوئی شاعر پورے معنوں میں شاعر کہلائے جانے کا دعوی' نہیں کرسکتا۔ دیکھنا یہ ہے کہ اہل ادب کے نزدیک مجموعی طور پر شاعری کا عام مفہوم کیا ہے اور خاص کر مشرقی نقطۂ نظر سے اس سے کیا مراد ہے اور پھر یہ کہ کیا مرزا اس معیار پر پورے اترے ہیں یا نہیں۔ ان کا کلام بغور مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہوجائیگی کہ اس لحاظ سے وہ بعض کوتاہیوں اور عیوب کے باوجود یقیناً گراں قدر شعراء کی صف میں جگہ پانے کے مستحق ہیں اس کے خلاف جہاد کرنا نہ صرف تنگ نظری ہے بلکہ انصاف سے بعید اور ہٹ دھرمی کا کھلا ثبوت۔

مرزا ایسے شاعر کے کلام کو جانچنے اور اس کی خصوصیات کو پرکھنے سے پہلے اس دور اور ماحول سے واقفیت پیدا کرنا ضروری ہے جس میں انھوں نے آنکھیں کھولیں اور پرورش پائی۔ یہ اس لئے کہ شاعر کے جذبات و خیالات جن کی وہ ترجمانی کرتا ہے کسی نہ کسی رنگ میں اس سے پرتو پذیر ہوتے ہیں۔ یہ وہ دور تھا جب ایک طرف تو سلطنت مغلیہ کا اقتدار دم توڑ رہا تھا اور دوسری طرف ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت روز بروز زور پکڑتی جاتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی کی سرکاری و دفتری حیثیت ختم ہوئی۔ اس کے باوجود ایک مدت تک ایسے لوگوں کی خاصی تعداد باقی رہی جو فارسی ادب اور زبان سے محبت رکھتے تھے اور اس پر ان کو بڑی قدرت حاصل تھی۔ مرزا انھیں میں سے ایک تھے۔

ازیں ان کے ماحول میں ان کی تعلیم و تربیت کا پس منظر ، عوام کا مذاق
، ان کے پیشرو استادوں کے نزدیک مفہوم شاعری اور خصوصاً موضوع غزل
ِعیت ، ان کے ہمعصروں کا انداز بیان اور زبان کے اعتبار سے اردو کا ابتدائی
ل سے گذر کر اس کی ارتقائی تشکیل اور ناتراشیدہ تراکیب و اسالیب وغیرہ
کچھ شامل ہے . مزید برآں شاعری میں ان کا صحیح مقام پہچاننے کے لئے
خواہ علمی استعداد ، وسیع مطالعہ اور بالغ نظری کی ضرورت کو نظر انداز
کیا جاسکتا .

آج تک ان کا کلام جن اہل ادب حضرات کی رائے زنی کا تختۂ مشق بنا
گر ان کی نظریوں کا تجزیہ کیا جائے تو ان میں سے انتہا پسندوں کے رویہ
یک بڑی وجہ ان واقعات سے دانستہ یا نادانستہ آنکھیں بند کرلینا ہے . مرزا
کلام کو سراسر الہامی ٹھہرانا اتنا ہی مضحکہ خیز ہے جتنا ان کو پرلے سرے
، ُسرا اور گونگا قرار دینا یا یہ حکم لگانا کہ ان کا شمار مشاہیر عالم میں
ہوسکتا. اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کے محاسن و معائب کلام کا
قدر تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا جائے . اس غرض سے ہم حسب ضرورت
ے مختلف اشعار پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی خصوصیات کا مختصر سا
کھینچ کر یہ دکھانے کی کوشش کریں گے کہ ان کی شاعری کی حقیقت
ے . اس میں ان کی جدت کہاں تک کار فرما ہے . انہوں نے فارسی و اردو
دیگر شعراء کے کلام سے کیا کچھ اخذ کیا ہے اور کس حد تک وہ استفادہ
. میں کامیاب رہے ہیں . دیگر شعرا نے ان سے اکتساب فیض میں کس قدر
، لیا ہے . تکرار مضمون کا عیب یا ہنر کن اشعار میں پایا جاتا ہے وغیرہ .
سے ہماری مراد نہ بلا وجہ مدح سرائی ہے اور نہ بیجا نکتہ چینی اور نہ مرزا
ِاہ مخواہ سرقہ کا الزام عائد کرنا مقصود ہے اگرچہ بعض .سخن فہموں کی
ہیں وہ اس کے بھی مرتکب ہیں . غرض فقط یہ ہے کہ مرزا کی شاعری کے
، پہلوؤں کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجائے تاکہ یکطرفہ رائے قائم کرنے
کے نظریوں کی حقیقت واضح ہوجائے کہ وہ مرزا کو دنیا کا بہترین یا نہایت
درجے کا شاعر قرار دینے میں کہاں تک حق بجانب ہیں اور یہ کہ مرزا کی
، کا پایہ متعین ہوسکے .

(۴)

محاسن کلام

مرزا کی شاعری کے دلدادوں کی اس مبالغہ آرائی سے قطع نظر جس کے زیر اثر وہ ان کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں اس میں شک نہیں کہ ان کا کلام بحیثیت مجموعی قابل قدر ہے اور بعض صورتوں میں بے نظیر۔ ان سے پہلے اردو شاعری اور خصوصاً غزل کا میدان بہت محدود تھا۔ شعراء کی توجہ زیادہ تر زبان کے چٹخارے، نشست الفاظ، حسن بندش، محاورے کی چستی، لفظی رعایت، صنائع بدائع اور مشکل سے مشکل قافیہ کے کھپانے پر مرکوز رہتی تھی۔ نفس مضمون کے اعتبار سے اچھی غزل کا معیار یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس میں گل و بلبل، زلف و سنبل، خط و خال، ہجر و وصال، شمع و پروانہ، ساقی و پیمانہ، عاشق کی گریہ و زاری و وفا شعاری اور معشوق کی کج ادائی و بے وفائی غرض فقط عاشقانہ مضامین کی ترجمانی ہو۔ شعراء تو دام زلف میں الجھ کر رہ جاتے تھے یا معشوق کے دہن موہوم اور کمر معدوم کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے تھے۔ ان کے دواوین اٹھا کر دیکھئے تو اس قول کی تصدیق ہوجائے گی۔ موضوع غزل کی روایتی پابندی نے انھیں اکثر مطالعہ کائنات کی وسیع النظری سے محروم رکھا تھا۔ پرانی روش سے انحراف کرنا خلاف دستور سمجھا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ اگر کوئی شاعر احیاناً کسی نئی ترکیب یا اچھوتی تشبیہ کو استعمال کرتا تو اس پر اعتراض کیا جاتا اور قدیم اساتذۂ فارسی یا اردو سے سند طلب کی جاتی، سند کی عدم موجودگی میں اس کا کلام قابل التفات یا وقیع نہیں سمجھا جاتا۔ لہذا زبان اور موضوع کی روایتی پابندی کے پیش نظر شعراء اسی محدود چکر میں پھنسے رہے۔ غالب سے پہلے اگر کسی نے اس روایت سے بغاوت کی تو وہ میر تقی میر تھے جنھوں نے عشقیہ مضامین کے علاوہ عوام کی زبان میں زندگی کی واردات کو سادہ اور موثر انداز میں پیش کیا۔

یہ درست ہے کہ مرزا نے عشق و عاشقی کا دامن نہیں چھوڑا مگر انھوں نے اس طلسم کو توڑا کہ غزل میں دوسرے خیالات اور مضامین ادا نہیں کئے جاسکتے۔ اس میں مختلف قسم کے مسائل سمو دئے۔ مختصر سے اردو دیوان میں ایسے متنوع

ر داخل کئے جن سے غزل کے موضوع میں معنوی وسعت پیدا ہوئی حالانکہ بھی ان کو یہ شکایت رہی کہ :

شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل ٭ کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لئے

مرزا ایک جدت طراز فنکار ہیں۔ وہ شاہراہ عام سے ہٹ کر اپنی راہ الگ ہیں اور بہر صورت اپنی انفرادیت کو قائم رکھتے ہیں۔ ادائے مطالب کے لئے و معنی کا ایک نیا رشتہ دکھاتے ہیں۔ تازہ تشبیہوں اور نادر استعاروں سے خیالی اور معنی آفرینی کے دریا بہا دیتے ہیں۔ ترکیب سازی و الفاظ گری ، و اختصار اور تمثیل و کنایہ سے کام لے کر عبارت قلیل میں معنی کثیر ادا ہیں۔ جدت ادا سے مفہوم شعر میں رنگینی اور وسعت پیدا کرتے ہیں۔ مین و متاخرین اور بعض اوقات معاصرین کے خیالات و مضامین میں لفظی و تصرفات سے کہیں پرانے خیال میں اضافہ کرتے ہیں۔ کہیں خیال کے ایک بدل کر اس کا دوسرا پہلو سامنے لاتے ہیں۔ کہیں دو مختلف خیالوں سے ایک خیال کو جنم دیتے ہیں اور اس طرح پامال و فرسودہ مضامین کو طرفگی اور کا جامہ پہناتے ہیں۔ کبھی پیش پا افتادہ مضمون کو اپنے زبردست تخیل مدد سے بلند کرکے اس میں نئی روح پھونک دیتے ہیں۔ وہ فکر و ذہن کے نئے گوشے نکال لیتے ہیں۔ بقول ایک سخن فہم کے ان کے یہاں آنسو بھی ور شبنم بھی ، غنچے بھی ہیں اور خار بھی ، ایک فلسفی کے خشک نظرئے ہیں اور ایک رند خرابات کا مستی بھرا نعرہ بھی ہے۔ ان کے یہاں غنچے ے کی لطیف آواز بھی ہے اور رعد کی کڑک بھی۔ ان کے یہاں نہ خواب کی تعبیریں ہیں اور نہ سوز الفت کی ترجمانیاں۔ وہ کتاب دل کی تفسیریں واقعیت و مثالیت ، اشاریت و ایمائیت ، پرواز تخیل ، قوت ادراک ، حسن ن ، امید و ناامیدی کی کشمکش ، درد کی کسک ، گداز کی کیفیت اور ذہنی ت نے ان کی شاعری کو وہ رنگ بخشا جس کا پرتو اردو کے دوسرے شعراء کے ہاں ڈھونڈھے سے بھی نہیں ملتا۔ نظر فریبی کا رنگ جمانا اور سے بات پیدا کرنا ان کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔ غزل میں جو موضوعات داخل ہیں انسانی زندگی کی پیداوار ہیں۔ انہیں فلسفی کہنا شاید درست نہ ہو اس لئے کے غیر مربوط فلسفیانہ خیالات میں زندگی کا کوئی مستقل فلسفہ نہیں پایا

جاتا لیکن وہ ایک فلسفی شاعر ضرور ہیں۔ ان کے ہاں فلسفیانہ نظریات کا شعور ہے۔ حقائق اشیا کی جستجو میں قوت تخیل سے جلوہ گر ہونیوالے تاثرات کو نہایت کامیابی سے بیان کرتے ہیں۔ وہ عملاً صوفی تھے یا نہ تھے ان کے ان اشعار سے جن میں انھوں نے متصوفانہ خیالات کا اظہار کیا ہے اور اس کے علاوہ ان کی مختلف تحریروں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ عقیدے کے اعتبار سے وہ صوفی تھے۔ انھوں نے کائنات اور انسانی زندگی کے بعض مسائل کو صوفی کے دل سے محسوس کیا۔ نفسیاتی حقائق کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کے انداز فکر میں اس کی جھلک نمایاں ہے۔ ان کی بذلہ سنجی اور شوخی میں لطف انگیزی اور ظرافت میں متانت و شائستگی کے ساتھ ساتھ ایک ایسی شیرینی ہے جو ذہنی انبساط کا باعث ہوتی ہے اور روح کو تازگی و شگفتگی بخشتی ہے۔ ان کے ہاں جذبات غیرت و خود داری اور رشک سے متعلق مضامین بھی پائے جاتے ہیں۔ ان کے کلام میں ایسی غزلیں بھی ملتی ہیں جن میں ہر شعر کا مضمون الگ الگ ادا کرنے کی بجائے ایک ہی مضمون پر مسلسل اشعار لکھ کر طبع آزمائی کی ہے۔ دیوان میں پہلودار اشعار بھی موجود ہیں جن میں اگرچہ تصنع کو دخل ضرور ہے لیکن ان سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ وہ زبان پر ایسی قدرت رکھتے ہیں جو ہر ایک کو نصیب نہیں۔ ان کے انداز فکر اور ذہنی تصورات میں ایک حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ اپنے منفرد اسلوب بیان سے خیالات و مشاہدات کو ذہنی کیفیات میں تبدیل کرتے ہیں۔ گو انھوں نے عمر قنوطی ماحول میں بسر کی جو بعض اشعار میں منعکس ہے لیکن چونکہ فطرتاً رجائی واقع ہوئے تھے آلام و مصائب پر ہنسی اڑانے میں انھیں لطف آتا ہے۔ وہ داخلی کیفیات کے مصور ہیں خارجی حالات کے نہیں۔ انھوں نے غزل کو ایک نیا شعور عطا کیا۔

مرزا کے کلام کا بیشتر حصہ جو متذکرۂ صدر محاسن کا حامل ہے اور جس پر ان کی شہرت و عظمت کا انحصار ہے واقعی اردو زبان کا سرمایۂ ناز ہے۔ جب تک نیرنگیٔ تصورات، روح پرور خیالات اور وجد آفریں نغمات انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتے رہیں گے اور بزم ہستی کو فانوس خیال سے روشن کرنے کی تمنا اہل بصیرت کے دلوں میں باقی رہے گی یہ پیش گوئی کرنا مشکل نہیں کہ زمانے کی بدلتی ہوئی رفتار کے ساتھ ساتھ موضوع سخن اور مفہوم شاعری میں انقلاب

آنے کے باوجود ان کا کلام قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا اور ان کے متنوع خیالات کی بنا پر ان کی مقبولیت میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہے گا۔

(۵)

معائب کلام

کوئی صاحب عقل اس بات کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ ہوگا کہ بقول: «الانسان مرکب من الخطا والنسیان» مرزا سہو و خطا سے بالکل مبرا تھے یا یہ کہ دیوان غالب ایک آسمانی صحیفہ ہے اور اسی پر شاعری کا خاتمہ ہوگیا ہے۔ جس طرح ان کے پرستاروں نے ان کو دنیا کا بہترین شاعر ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے اس طرح ان کے مخالفوں نے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر عیب نکالنے کے شوق میں ان کی شاعری کو در خور اعتنا نہیں سمجھا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان انتہا پسند مخالفوں کی رائے سے اختلاف رکھتے ہوئے بھی ان کے جزوی کلام میں عیب موجود ہیں جن کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کی جاسکتیں اور جن کو ایک انصاف پسند نقاد نظر انداز نہیں کرسکتا۔ مثلاً بعض اشعار میں فارسیت کی اس قدر بھرمار ہے کہ ان پر بہ مشکل اردو اشعار کا اطلاق کیا جاسکتا ہے۔ یہ کہنا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ مرزا در اصل فارسی زبان کے دلدادہ اور بلند پایہ شاعر تھے یا یہ کہ وہ شروع شروع میں مرزا بیدل کی تقلید کرتے تھے اور اس وجہ سے ان کا ایسی زبان سے احراز کرنا ناگزیر تھا ان کو اس عیب سے بری قرار نہیں دے سکتا۔ ان کے ہاں گنجلک ہے۔ بعض موقعوں پر پیچیدہ اور غیر مانوس تراکیب نے ان کے اشعار کو معما بنا دیا ہے جس سے «المعنی فی بطن الشاعر» کی صورت پیدا ہوگئی ہے۔ بعض اشعار گٹھلی دار ہیں اور بعض اگر سراسر بے معنی نہیں تو اہمال کی حد تک ضرور پہنچ جاتے ہیں۔ ان اشعار کے علاوہ جن میں مرزا نے اپنی قوت تخیل اور فنکارانہ کمال سے اوروں کے خیالات و مضامین سے استفادہ کرکے ان کو ترقی دی ہے اور اردو زبان کو مالا مال کیا ہے ان کے ہاں ایسے اشعار بھی بکثرت ملتے ہیں، جن کا مضمون انہوں نے فارسی و اردو کے قدیم شعراء بلکہ بعض معاصرین سے یا تو اخذ کیا

ہے یا صاف اڑا لیا ہے یا پھر ترجمہ کرکے اپنا لیا ہے۔ کلام میں الفاظ کی ثقالت اور غرابت کی مثالیں بھی دیکھنے میں آتی ہیں جو کانوں کو ناگوار گذرتی ہیں۔ اس میں قواعد و زبان کی غلطیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ کہیں کہیں بے ضرورت تکرار مضمون کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ بعض اشعار سوقیانہ اور بازاری ہیں۔ اور کلام میں ناہمواری بھی ہے۔

(باقی آئندہ)

عمدۂ منتخبہ

یعنی

تذکرۂ سُرُورؔ

اردو کے ۹۹۶ شاعروں کا ایک نایاب تذکرہ جو سنہ ۱۸۰۹ ع میں مرتب ہوا

تالیف: نواب اعظم الدولہ میر محمد خاں بہادر سرور

مرتبہ: ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی

جسے شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی نے بڑے اہتمام کے ساتھ نہایت خوب صورت ٹائپ میں شائع کیا ہے

صفحات: ۸۳۶　　قیمت (مجلد): بیس روپئے علاوہ محصول ڈاک

ملنے کا پتہ: ادبی پبلشرس

۸ شیفرڈ روڈ، بمبئی ۸

* پروفیسر یوسف سرمست ایم۔اے

مومن کی عشقیہ شاعری

«دنیا میں عشق ہی سب کچھ ہے وہ تو خدا ہے»

عشق انسانی جذبات میں «دل» کا مقام رکھتا ہے۔ یہی انسانی زندگی کا محور ہے کیونکہ اسی کی وجہ سے «نغمہ تارِ حیات» بجنے لگتا ہے اور اسی کے دم سے «نور حیات» کی روشنی بھی رہتی ہے اور «نار حیات» کی گرمی بھی اس جذبہ کے تحت انسانی اعمال و افعال کا ایک لا متناہی سلسلہ شروع ہوتا ہے اور بعض وقت یہ کچھ ایسا پیچ در پیچ اور ایسی عجیب و غریب صورتیں اختیار کرتا ہے کہ اس کے بہروپ کو دیکھ کر اس کے اصلی روپ کا پتہ چلایا ہی نہیں جاسکتا۔ یہ صد ہزار جلووں کی صورت اختیار کرتا ہے اور ہر جگہ اس کی جلوہ گری ایک نئی شان رکھتی ہے۔ کبھی تو یہ انسانوں کے باہمی تعلقات میں رگ جاں کی طرح نظر آتا ہے اور اس طرح تصویر کائنات میں رنگ بھرتا ہے اور کبھی یہ انسان اور خدا کی وابستگیوں کی وجہ سے معراج پر پہونچ جاتا ہے اور انسان کی زندگی میں تقدس اور الوہیت کی خیرگی اور برگزیدگی پیدا کرتا ہے اور کبھی انسان کی فطرت پرستی کا مظہر بن کر کائنات کے سارے حسن کو شعر و ادب کے آئینہ خانہ میں منعکس کرتا ہے۔ عشق کی اسی ہمہ گیری اور بے کراں وسعت کو دیکھ کر ایک مغربی مفکر نے اسے خدا کہہ دیا ہے۔

لیکن شاعری میں عشق جہاں رس گھولتا ہے اور آب حیات کی شیرینی پیدا کرتا ہے وہیں زہر کی ہلاکت خیزی بھی پیدا کرسکتا ہے۔ عشق «سایۂ شاخ گل» کے بجائے «افعی» اسی وقت نظر آتا ہے جبکہ اس میں حقیقت کی روشنی اور گرمی نہ رہے۔ عشقیہ شاعری کو جذبے کی سچائی ہی رفعت اور بلندی بخشتی ہے۔ عشقیہ شاعری میں بھی بڑی وسعت اور ہمہ گیری ہوتی ہے۔ لیکن اردو میں عشقیہ شاعری زیادہ تر عشق حقیقی اور عشق مجازی تک محدود رہی۔ عشق حقیقی میں شاعری میں «ارضیت» کم ہوتی جاتی ہے۔ اور شاعر اگر بہت زیادہ اس میں گم ہو

* جناب یوسف سرمست صاحب حیدرآباد۔ دکن

تو « سرحد ادراک » سے پرے چلا جاتا ہے اور دوسروں کو اس کی شاعری کا « قبلہ نما » ہی نہیں ملتا۔ ایسی صورت میں شاعر کا ساتھ دینا بہت مشکل ہوجاتا ہے۔ عشق مجازی میں بھی شعر میں حسن اور تازگی اسی وقت پیدا ہوسکتی ہے جب کہ وہ صحت مند ہو، فطری ہو، ایسی شاعری میں اگر « حادثات شباب » ہی کو سب کچھ سمجھ لیا جائے اور صرف انہی کو شعر کا موضوع بنانے کی کوشش کی جائے تو پھر عشقیہ شاعری کی رنگینی، تازگی اور اس کا جمالیاتی بانکپن مجروح ہوجاتا ہے۔ اس میں ایک ہی دائرہ میں چکر کاٹنے سے فرسودگی اور تھکاوٹ پیدا ہوجاتی ہے۔ ایک ہی بات کی تکرار سے شاعرانہ خلوص و اعتماد کا فقدان ظاہر ہوتا ہے۔ اور عشق بیمار نظر آنے لگتا ہے۔ وہ ایک مصیبت اور روگ بن جاتا ہے۔

مومن کی عشقیہ شاعری میں نہ تو عشق بیمار اور روگی نظر آتا ہے اور نہ ہی وہ ماورائیت میں گم ہوتا ہے۔ ان کی شاعری صحت مند انسانی جذبات پر روشنی ڈالتی ہے۔ غزل کے مختلف شاعروں کے یہاں عشقیہ شاعری کا آہنگ مختلف رہا ہے۔ لیکن مومن ہمیشہ ایک طرف خاص رغبت اور جھکاؤ رکھنے کی اپنی انفرادیت کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ میر کے پاس ہجر و فراق، مایوسی اور ناکامی نے جو فضا پیدا کی ہے، مومن اس سے بھی بہت حد تک دور ہیں۔ مومن لکھنوی شعرا سے ایک حد تک متاثر نظر آتے ہیں لیکن وہ کبھی ان کی طرح مبتذل نہیں ہوتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے ہاں معاملہ بندی ملتی ہے اور خارجی پہلو کی نقش گری بھی دکھائی دیتی ہے۔ عشق مجازی ہی ان کے لئے سب کچھ ہے۔ لیکن اس کے باوجود جرأت کے پاس جو معاملہ بندی اور کھل کھیلنے والا ماحول ہے اس سے بھی انہیں کوئی واسطہ نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ وہ انتہا پسندی کے شکار نہیں ہوئے۔ ان کے پاس ہجر و فراق، مایوسی اور ناکامی کا بیان ہوتا بھی ہے تو اس میں زندگی سے بیزاری یا فرار نام کو نہیں ملتا۔ وہ ہر حالت میں زندگی کو عزیز رکھتے ہیں۔ وہ « شبِ فراق » میں بھی زندگی پر مرتے ہیں :-

شب فراق میں بھی زندگی پہ مرتا ہوں ⁂ کہ گو خوشی نہیں ملنے کی پر ملال تو ہے

زندگی کی یہ عزیز داری ایسی حالت میں بھی ایک صحت مند رجحان کو ظاہر کرتی ہے۔ اردو شاعری میں زندگی سے یہ محبت کم ہی ملتی ہے۔ ورنہ عشق میں ہر شاعر بعض وقت خواہ مخواہ جان سے بیزار نظر آتا ہے۔ لیکن مومن کہتے ہیں:

جینا امید وصل پہ ہجراں میں سہل تھا ٭ مرتا ہوں زندگانی دشوار کے لئے

«زندگانی دشوار» پر مرنے کا یہ حوصلہ مومن کے ہاں اکثر جگہ نظر آتا ہے:۔

شب فراق میں بھی زندگی پہ مرتا ہوں ٭ کہ گو خوشی نہیں ملنے کی پر ملال تو ہے

مایوسیوں اور ناکامیوں کے با وجود زندگی کی مسرتوں اور دل آویزیوں کا انہیں احساس رہتا ہے۔ اس لئے وہ زندگی کو برتنے اور بسر کرنے کی چیز سمجھتے ہیں۔ اور اس کوشش میں اگر ان کی جان بھی چلی جاتی ہے تو وہ اس کی پرواہ نہیں کرتے:۔

دل لگانے کے تو اٹھائے مزے ٭ جی بلا سے رہا، نہ رہا

لیکن وہ موت کو زندگی پر کبھی بھی، ترجیح نہیں دیتے۔ «زندگی ہجر» میں بھی وہ موت کی مسیحائی کے قائل نہیں:۔

زندگی ہجر بھی اک موت تھی ٭ مرگ نے کیا کار مسیحا کیا

یہی وجہ ہے کہ مومن کی شاعری کی عام فضا میں مایوسی، محرومی یا حرماں نصیبی پرتوفگن نہیں ہے اس کے بجائے وہ ابتہاجیت کا رنگ لئے ہوئے ہے ان کی شاعری کی لے بڑی حد تک مسرت اور جولانی کا احساس پیدا کرتی ہے۔ لیکن مومن باوجود اپنی لذت پسندی کے کھل کھیلتے نہیں کیونکہ وہ لذت پرست نہیں ہیں۔ چھیڑ چھاڑ سے بھی انہیں کچھ ایسی زیادہ دلچسپی نہیں ہے اور کھل کھیلنے کی طرف بھی وہ راغب نہیں۔ لیکن فطرت مسرتوں سے بہرہ ور ہونے کو وہ جائز سمجھتے ہیں اور ان ہی کو پیش کرتے ہیں۔ وہ حسن و عشق کی جن واردات اور کیفیات کی ترجمانی کرتے ہیں ان کا اطلاق ہر انسان پر ہوسکتا ہے۔ وہ حسن و عشق کی جن منزلوں کی نشاندہی کرتے ہیں اس سے ہر جسمانی، ذہنی اور جذباتی طور پر صحت مند انسان گزرتا ہے۔ مومن کی شاعری میں یہ جو ہمہ گیری اور عمومیت آگئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے «جذبات سے مغلوب ہونے کے بجائے وقوف جذبات کو اپنی شاعری کا خاص مقصد قرار

دے لیا تھا»۔ مومن کی غزلیں ایک صحت مند انسان کے اس فطری رجحانات کی عکاسی کرتی ہیں:۔

یارب وصال یار میں کیونکر ہو زندگی — نکلی ہی جان جاتی ہے ہر ہر ادا کے ساتھ
میں اپنی چشم شوق کو الزام خاک دوں — تیری نگاہ شرم سے کیا کچھ عیاں نہیں
ہے نگاہ لطف دشمن پر تو بندہ جائے ہے — یہ ستم اے بیمروت کس سے دیکھا جائے ہے
اس کوچے کی ہوا تھی کہ میری ہی آہ تھی — کوئی تو دل کی آگ پہ پنکھا سا جھل گیا
ہوش میں آؤ مجھ میں جان نہیں — غفلت جرأت آزما کب تک
اس بت کی ابتدائے جوانی مراد ہے — مومن کچھ اور فتنۂ آخر زماں نہیں
غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا — میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا
شب تم جو بزم غیر میں آنکھیں چرا گئے — کھوئے گئے ہم کچھ ایسے کہ اغیار پا گئے
ان سے پری وش کو نہ دیکھے کوئی — مجھ کو مری شرم نے رسوا کیا
اے ناصحو آ ہی گیا وہ فتنۂ ایام لو — ہم کو تو کہتے تھے بھلا اب تم تو دلکو تھام لو

مومن اپنے تغزل میں صرف ایسے ہی جذبات کو جگہ دیتے ہیں جن کی نوعیت فطری ہونے کے باوجود بہیمانہ نہیں ہوتی۔ وہ انسان کے بہیمانہ جذبات میں اپنے لطیف اور مہذب احساس سے انسانیت کا رنگ بھرتے ہیں۔ اگرچہ مومن کی شاعری کی بنیاد جنسیت ہے جیسا کہ نیاز فتحپوری نے کہا ہے «مومن کی شاعری بالکل جنسیاتی شاعری ہے»۔ لیکن مومن کے ہاں جنسیت کا ارتقا ملتا ہے۔ جیسا کہ فراق گورکھپوری نے کہا ہے:۔

«جنسیت اور جنسی جبلتیں خیروشر کی آما جگاہ ہیں۔ اس تخلیقی قوت کے لئے اہرمن اور یزداں کی مسلسل جنگ رہتی ہے۔ جنسیت کی مادی بنیاد لمسیات میں پنہاں ہے۔ پھر لمسیات سے ابھر کر جنسیت تصور جمال اور جذبہ عشق بنتی ہے۔ پھر یہ تصور اور یہ جذبہ عاشق کی شخصیت میں جاری اور ساری ہوجاتا ہے۔»

مومن کے ہاں جنسیت کا یہ تدریجی ارتقا نظر آتا ہے اور «ہوس» کا سلسلہ «پیار» تک پہونچ گیا ہے

جنسیت سے جذبہ عشق تک سلامتی سے پہونچ جانا کچھ کھیل نہیں۔ مومن بھی اس راہ میں ذلیل ہو جاتے اگر ان کے پاس اپنی تہذیبی قدروں اور معاشرتی معیاروں کا اتنا گہرا شعور نہ ہوتا۔ کیونکہ مومن نے جس ماحول میں پرورش پائی ہے، اس میں شاہدان بازاری کے عشق کے چرچے تھے۔ مومن بھی اس کوچہ میں گئے اور «سر کے بل» گئے۔ مومن نے عشق کیا تھا اور ایسی «بے جگہ» آنکھ لڑائی تھی کہ انھیں کیا کچھ نہ کرنا پڑا ہوگا۔ اس کا اندازہ اس شعر سے ہوسکتا ہے۔

کیونکر یہ کہیں منت اعدا نہ کرینگے ٭ کیا کیا نہ کیا عشق میں کیا کیا نہ کرینگے

مومن کو کن کن کٹھن مقامات سے گزرنا پڑا ہے اور کیسی کیسی آزمائشوں پر پورا اترنا پڑا ہے۔ وہ اس شعر سے ظاہر ہے:

اے شب وصل غیر بھی کاٹی ٭ تو مجھے آزمائے گا کب تک

اس بدنام شعر میں اظہار کرب کے ساتھ الفاظ میں جو روک تھام ہے وہ مومن کے معاملات عشق پر روشنی ڈالتا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی شاعری میں کوچہ گردی کی بو آتی ہے اور اس سے بھی کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ رشک اور غیر کا بیان ان کے ہاں ایک حد تک ضرورت سے زیادہ ملتا ہے۔ لیکن باوجود اس کے مومن اس خار زار سے جس انداز میں دامن کشاں گزر جاتے ہیں وہ ان کے عشقیہ جذبات کی صحت کی دلیل ہے۔ ایسے موضوعات پر اسطرح کے شعر کہنا مومن کا حصہ ہے:

اس نقش پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل
میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

کیسے گلے رقیب کے کیا طعن اقربا
تیرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

غیر کے ہمراہ وہ آتا ہے میں حیران ہوں
کس کے استقبال کو جی تن سے میرا جائے ہے

ہے دوستی تو جانب دشمن نہ دیکھنا
جادو بھرا ہوا ہے تمہاری نگاہ میں

غیر سے سر گوشیاں کو لیجئے پھر ہم بھی کچھ
آرزو ہائے دل و رشک آشنا کہنے کو ہیں

جاں نہ کھا وصل عدو سچ ہی سہی پر کیا کروں
جب گلہ کرتا ہوں ہمدم وہ قسم کھا جائے ہے

بے جرم پائمال عدو کو کیا کیا
مجھ کو خیال بھی تری سر کی قسم نہیں

کس دن تھی اس کے دل میں محبت جو اب نہیں
سچ ہے کہ تو عدو سے خفا بے سبب ہوا

مومن کی عشقیہ شاعری کی بنیادیں حقیقت میں پیوست ہیں. عشق کی منزل تک پہونچنے کے لئے « حسن پرستی » کی راہ اختیار کرنی پڑتی ہے. اس راہ سے گزرتے ہوئے حسین تاثرات کو انھوں نے شعر کے سانچوں میں ڈھال دیا ہے:

دشنام یار طبع حزیں پر گراں نہیں ٭ اے ہم نفس نزاکت آواز دیکھنا
تھا محو رخ یار میں کیا آئینہ دیکھوں ٭ معلوم ہے یارو مجھے جو رنگ مرا ہے
میرے تغیر رنگ کو مت دیکھ ٭ تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے
دیکھیو مت دیکھیو کہ آئینہ ٭ غش تمہیں دیکھ کر نہ ہو جائے

سر سے شعلے اٹھتے ہیں آنکھوں سے دریا جائے ہے
شمع سے کس نے یہ ذکر اس محفل آرا کا کیا

کیا جلوے یاد آئے کہ اپنی خبر نہیں
بے بادہ مست ہوں میں شب ماہتاب میں

ہر آن آن دگر کا ہوں میں عاشق زار ٭ وہ سادہ ایسے کہ سمجھے وفا شعار مجھے
آنکھوں سے حیا ٹپکے ہے ناز تو دیکھو ٭ ہے بوالہوسوں پہ بھی ستم ناز تو دیکھو
اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک ٭ شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو
باد بہار میں ہے کچھ اور عطر بیزی ٭ تم آجکل میں شاید سوئے چمن گئے ہو

مومن کی عشقیہ شاعری میں کیفیات حسن اور معاملات عشق کی ترجمانی کو نمایاں اور اہم مقام حاصل ہے. لیکن یہ ترجمانی مومن کے ہاں خیالی یا تصوری نہیں

ہوتی۔ بلکہ شاعری کی اس شیشہ گری میں حقیقت اور واقعیت کا زنگار لگا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک آئینہ خانہ بن گیا ہے اور اس شیش محل میں ہر ایک کو اپنی شکل نظر آجاتی ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ مومن نے خود عشق کیا تھا اور ساری عمر اسی کوچے کی خاک چھانتے رہے۔ ان کا ایک عشق تو کافی مشہور بھی ہوا جس کی یادگاران کی مثنوی «قول غمیں» ہے۔ میری مراد امۃ الفاطمہ بیگم صاحب جی والے عشق سے ہے۔ یہ تو ایک عشق ہوا اگر ہمیں مومن کی زندگی کے تمام حالات مل جائیں تو نہ جانے ایسی کتنی عشق کی داستانیں دستیاب ہوں۔ لیکن ان تجربات کی وجہ سے مومن کی شاعری میں «نگاہ یار» کی «معجز بیانی» آگئی ہے اور ہر ایک کو گماں ہوتا ہے کہ یہ اسی کے دل کی بات ہے۔ مومن کے پاس گو ایک ابتہاجی کیفیت ہے لیکن اس میں سوز و گداز اور دردمندی بھی پائی جاتی ہے۔ نرم آنچ کی لپک ان کے کلام میں کیوں نہ آتی انھوں نے عشق کیا تھا اور اس «آگ کے دریا» میں سے ڈوب کر جانا پڑا تھا۔ اس لئے مومن کی عشقیہ شاعری «سوز و ساز» کی لے پر رقصاں نظر آتی ہے:

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا ٭ جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے ٭ ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا
ہم بھی کچھ خوش نہیں وفا کرکے ٭ تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی
میرے آنسو نہ پوچھنا دیکھو ٭ کہیں دامان تر نہ ہو جائے
وہ ہنسے سن کے نالہ بلبل کا ٭ مجھے روتا ہے خندہ گل کا
شبنم خرابِ مہر و کتاں سینہ چاک ماہ ٭ لو اور بھی ستم زدہ روزگار ہیں
ڈرتا ہوں آسماں سے بجلی نہ گر پڑے ٭ صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں
صبح عشرت ہے وہ نہ شام وصال ٭ ہائے کیا ہو گیا زمانے کو
وصل کی بات کب بن آتی ہے ٭ دل سے دفتر بنائے لوگوں نے
نہ مانونگا نصیحت پر نہ سنتا میں تو کیا کرتا ٭ کہ ہر ہر بات میں ناصح تمہارا نام لیتا تھا
تا نہ پڑے خلل کہیں آپکے خواب ناز میں ٭ ہم نہیں چاہتے کمی اپنی شب دراز میں
دیدہ حیران نے تماشا کیا ٭ دیر تلک وہ مجھے دیکھا کیا
چارہ دل سوائے صبر نہیں ٭ سو تمہارے سوا نہیں ہوتا

دمبدم رونا ہمیں چاروں طرف تکنا ہمیں ٭ یا کہیں عاشق ہوئے یا ہوگیا سودا ہمیں

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی ٭ تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

ہے اعتماد مرے بخت خفتہ پر کیا کیا ٭ وگرنہ خواب کہاں چشم پاسباں کیلئے

اگر نہ ہنسنا ہنسانا کسی کا بھا جاتا ٭ تو بات بات پہ یوں رو دیا نہ کرتے ہم

کیا خجل ہوں اب علاج بیقراری کیا کروں
دھر دیا ہاتھ اس نے دل پر تو بھی دل دھڑکا کیا

عشق کی نیاز آگینی ہر شعر سے ٹپکتی ہے ۔ نیاز عشق کی بلندی اس سے زیادہ اور کیا ہوگی کہ مومن شب فراق میں بھی زندگی پر مرتے ہیں۔ ہجر کی شب دراز میں کمی کا خیال بھی انہیں ناپسند ہے کیونکہ ان کو اپنے آرام سے زیادہ خواب ناز کی ناز برداریاں منظور ہیں ۔ وہ اپنے آنسو صرف اس لئے خشک نہیں کرتے کہ ان کا محبوب تر داماں نہ ہو جائے وہ نہیں چاہتے کہ معشوق ان کی حالت زار دیکھے کیونکہ انہیں اندیشہ ہے کہ کہیں اس کو «اپنی نظر نہ ہوجائے» مومن کی عشقیہ شاعری کا یہ وہ حصہ ہے جو اردو کی بلند ترین عشقیہ شاعری کا جز ہے ،

مومن نے اپنی عشقیہ شاعری میں ناز حسن اور نیاز عشق کی تفصیل کو پیش کرتے ہوئے گہرے نفسیاتی شعور کا ثبوت دیا ہے ۔ مومن کی نفسیاتی ژرف نگاہی ان کے کلام میں بڑی گہرائی اور گیرائی پیدا کرتی ہے ۔ مومن خود حسن و عشق کی مختلف منزلوں کو طے کرچکے تھے ، اس لئے ان کی نفسیات کا انہیں عملی تجربہ تھا ۔ مومن نے انہی تجربات اور احساسات کو منفرد و شاعرانہ بانکپن کے ساتھ پیش کیا ۔ مومن نے عشقیہ احساسات و جذبات کو پوری شدت سے محسوس کیا اور انکا وقوف حاصل کیا لیکن ان پر فلسفہ و فکر کی چھاپ نہیں لگائی ۔ اسی وجہ سے مومن کے ہاں نہ تو فکر کی گہرائی پیدا ہونے پائی ہے نہ کسی فلسفیانہ رنگ کا جلوہ نظر آتا ہے فلسفہ و فکر مومن کے مزاج میں تھا ہی نہیں پھر شاعری میں کہاں سے آجاتا ۔ لیکن مخصوص انداز اور منفرد آہنگ نے مومن کی شاعری کو جمالیاتی اعتبار سے ایک نئے سانچے میں ڈھالا ہے ۔ یہ جمالیاتی اظہار اور اس کا

نیا سانچہ مومن کے ہی ساتھ مخصوص ہے۔ ان کے ہاں اس جمالیاتی اظہار میں نہ میر کی سادگی اور آہستہ روی آتی ہے نہ غالب کی سی تندی اور پرکاری جگہ پاتی ہے۔ انھوں نے ان دونوں کے اسلوب سے جداگانہ اسلوب پیدا کیا ہے۔ اس اسلوب میں دونوں پہلوں کا ایک حسین اور متوازن امتزاج نظر آتا ہے۔ جس نے مومن کی عشقیہ شاعری کو زیادہ دل نشیں اور دلاویز بنا دیا ہے۔ مومن کی عشقیہ شاعری میں نہ تو نری داخلیت ہے اور نہ ہی نری خارجیت انھوں نے ان دونوں گلدستوں سے عطر کھینچا ہے اور اسے یکجا کر دیا ہے اور یہی ان کی عشقیہ شاعری کی امتیازی خصوصیت ہے۔

میرزا مظہر جان جاناں رح

اور

ان کا اردو کلام

میرزا مظہر جان جاناں کے عہد کے سیاسی، معاشرتی، مذہبی حالات اور اردو شاعری کا جائزہ۔ ان کے سوانح حیات، ان کے خلفا و تلامذہ کے حالات، ان کے ملفوظات، ان کے فارسی و اردو کلام پر تبصرہ اور ان کے منتشر اردو کلام کی ترتیب

مرتبہ: عبدالرزاق قریشی، رفیق انجمن اردو رسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی

صفحات: ۲۷۲ قیمت ٦ روپیہ

ملنے کا پتہ: ادبی پبلشرز، شیفرڈ روڈ، بائیکلا، بمبئی۔ ۸

* سید محمود حسن قیصر، امروہوی

سید عبد اللہ جائسی لندنی

سید عبد اللہ جائسی، ہندوستان کے ان گنے چنے افراد میں ہیں جنھوں نے یورپین ممالک میں ہندوستانی ادب کی اشاعت میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیا اور اس لحاظ سے ان کی خدمات بجا طور پر سراہنے کے قابل ہیں. افسوس ہے کہ ان کے تذکرہ سے تاریخ و ادب کی تمام کتابیں یکسر خالی ہیں جس کی وجہ بجز اس کے اور کچھ متعین نہیں کی جاسکتی کہ ان کی زندگی کا ایک بڑا حصہ یورپین ممالک میں بسر ہوا اور کوئی تصنیف ان کی محفوظ نہیں رہ سکی ورنہ اپنی شخصیت کے لحاظ سے وہ ان لوگوں میں نہ تھے جن پر اہل و علم و ادب کی نگاہیں نہ پڑتیں. مجھے بڑی تلاش کے بعد موصوف کے جس قدر حالات مل سکے ہیں وہ ہدیہ ناظرین کرتا ہوں.

ولادت و نسب | سید عبد اللہ لندنی، قصبہ جائس، ضلع رائے بریلی (اودھ) میں انیسویں صدی عیسوی میں پیدا ہوئے، ان کا نسب نامہ بائیس پشت کے بعد حضرت امام علی نقیؑ پر منتہی ہوتا ہے. موصوف نواب نجم الملک سید نجم الدین نقوی سبزواری فاتح جائس متوفی ۴۲۰ھ کی نسل سے تھے[1]

یہ خاندان کئی نسلون سے سیادت و امارت اور علم و فضل کا مرکز رہا ہے. ان کے والد سید محمد ابن نجات علی اپنے زمانہ کی ممتاز اور سر برآوردہ شخصیتوں میں تھے، موصوف ایک عرصہ تک جبل پور مین تحصیلدار یا سب کلکٹر آف ریونیو کی حیثیت سے رہے[2]، نیز ان کے بیٹے سید عبد اللہ کی تصریح کے مطابق چالیس سال تک انھوں نے برٹش گورنمنٹ کی ملازمت کی. غدر ۱۸۵۷ ع میں انھوں نے انگریزوں کے آفیسر کی حیثیت سے ان کی حمایت میں سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا جس کے صلے میں گورنر جنرل ان کونسل نے سکریٹری آف اسٹیٹ کی منظوری سے ۱۸۶۰ ع میں ان کے لئے لائف پنشن مقرر کردی اور خاں بہادر

---

* جناب سید محمود حسن قیصر امروہی، انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ

۱ ۔ اکابر جائس، قلمی مولفہ سر جائسی

۲ ۔ میمورنڈم سر ڈانلڈ فریل

کا خطاب عطا کیا. آخر عمر میں اپنے وطن لکھنؤ آگئے تھے جہاں ۳۰ نومبر ۱۸۶۷ ع کو ستر سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا [۱].

ان کے انتقال پر ای. ایچ. پالمر [۲] نے ۱۰ فروری ۱۸۶۸ ع کو ۱۰ صفحے عربی میں (جن میں ایک مرثیہ اور تاریخ وفات بھی شامل ہے) اور آٹھ صفحے انگریزی میں لکھے ہیں. انگریزی حصے کا عنوان ہے :

"An address to the people of India" یہ چند سطریں اس نے جس جذبہ کے تحت لکھی ہیں اس کا اندازہ خود اس کی حسب ذیل عبارت سے ہوتا ہے :

.....I feel that in this expressing myself I am but performing my duty, my duty as a friend, to my best of friends, his son, Sayed Abdulla, and my duty as an Englishman.. .

(میں محسوس کرتا ہوں کہ میں اپنے اس بیان میں واقعی طور پر اپنا فرض انجام دے رہا ہوں جو مجھ پر دو حیثیتوں سے عائد ہوتا ہے ، ایک اس حیثیت سے کہ مرحوم کے بیٹے سید عبد اللہ میرے سب سے بڑے دوست ہیں ، دوسرے اس حیثیت سے کہ میں ایک انگریز ہوں)

اس کتابچے میں شائع الوقت ممتاز اور مشہور انگریزی اخباروں کے ان تعزیتی نوٹوں کے اقتباسات بھی شامل ہیں جو سید محمد مرحوم کے انتقال پر لکھے گئے. یہ نوٹ انگریزی اخباروں کے عام تعزیتی نوٹوں کی طرح ہیں اور ان میں بس سید محمود مرحوم کے حالات زندگی بیان ہوئے ہیں [۳].

اس کے علاوہ ان کے کچھ حالات مسٹر ای. ایچ. پالمر کے "Address to the people of India" مورخہ ۱۸۶۸ ع سے بھی معلوم ہوتے ہیں. یہ پورا ایڈریس میرے سامنے نہیں البتہ میرے دوست کلب مصطفے صاحب

---

۱ ۔ حاشیہ میمورنڈم سر ڈانلڈ فریل

۲ ۔ ای. ایچ پالمر انگلینڈ کا ایک زبردست ماہر مشرقیات تھا جس نے ان علوم پر متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں جو لندن اور کیمبرج سے شائع ہوچکی ہیں ان میں حسب ذیل تین کتابیں میرے مطالعہ سے گذری ہیں.

1. Haroun al Rashid (ہارون الرشید), London, 1894.
2. Oriental Mysticism! a treatise on the sufistic and unitarian theosophy of the Persian, Cambridge, 1857.
3. Concise dictionary of the Persian Language, London, 1949.

۳ ۔ مکتوب جناب کلب مصطفے صاحب جائسی بنام مولف مورخہ ۲۲ اکتوبر سنہ ۶۰ ع

جائسی نے اس کے چند اقتباسات مجھ کو ارسال کئے ہیں جو ذیل میں نقل کرتا ہوں.

یہ ایڈریس ص ۳ سے شروع ہوتا ہے، ممکن ہے پہلے صفحے پر An address to the people of India رہا ہو اور دوسرا صفحہ خالی ہو، صفحہ ۳ پر انگریزی سلطنت کے فیوض کا تذکرہ کر کے صفحہ ۵ پر سید محمد کا تذکرہ ان الفاظ میں ہے. اختصار کی غرض سے صرف ترجمے پر اکتفا کرتا ہوں،

« سید محمد خاں بہادر ابن نجات علی ابن السید؟ النقوی، ہندوستان کے مسلمانوں میں جس طرح اپنی شاندار ولادت اور علم و فضل میں ممتاز اور متعارف ہیں اسی طرح اپنی سچائی اور وفاداری میں بھی بلند مقام رکھتے ہیں.

مرحوم ہندوستان کے ایک شریف خاندان کی فرد تھے، جس کا سلسلۂ نسب محمد صاحب کے چچا زاد بھائی، علی سے ملتا ہے، وہ سنہ ۱۲۱۵ ھ میں جائس (اودھ) میں پیدا ہوئے، جہاں انھوں نے ایسی تعلیم حاصل کی جو ان کے عہدے اور حیثیت کے لئے موزوں تھی. لٹریری سوسائٹی کے فوائد سے بہرہ اندوز ہونے اور پالی ٹکس میں دلچسپی پیدا کرنے کے بعد وہ ہمارے گرمجوش حامیوں میں ہوگئے اور بالآخر اپنے نصب العین کو پاگئے ... برٹش گورنمنٹ کی طرف سے ان کا تقرر ایک ذمے دار اور ممتاز عہدے پر ہوا. اس پوزیشن میں انھوں نے ہر شخص کی زرین رائے اپنے حق میں جیت لی، نیز جن لوگوں کا ان سے سابقہ رہا تھا ان کے دل میں مرحوم کی محبت اور عزت کا جو جذبہ تھا وہ ان کے موت کے دن تک برابر بڑھتا رہا میرے لئے ان کی تعریف میں زیادہ کہنا غیر ضروری ہوگا اس لئے کہ (TIMES) کا حسب ذیل اقتباس کافی طور پر ان لوگوں کے جذبۂ احترام اور محبت کو ظاہر کرتا ہے جن کے درمیان مرحوم کی قسمت کو ڈال دیا گیا تھا. میں نے عربی داں طبقے کے فائدے کی غرض سے اس اقتباس کا عربی نظم میں ترجمہ کر دیا ہے، یہ امید کرتے ہوئے کہ اس طرح ہندوستان کی ایک ممتاز شخصیت اور برٹش گورنمنٹ کے ایک سچے دوست کی یادگار قائم رہے»

اس کے بعد (TIMES) مجاریہ ۱۰ جنوری ۱۸۶۸ ع کے (Deaths) کالم

میں ان کے لڑکے سید عبد اللہ کی طرف سے حسب ذیل عبارت درج ہے۔

"At Lucknow on the 30th Nov. 1867 in the 70th year Meer Syed Mohammad Khan Bahadoor formerly the distinguished magistrate and Revenue Collector of Jubbulpore, who after a faithful service of fifty years had received from the British Government an honourary title and a handsome pension...."

(۳۰ نومبر ۱۸۶۷ ع کو میر سید محمد خاں بہادر نے جو جبل پور میں ایک ممتاز مجسٹریٹ اور ریونیو کلکٹر کی حیثیت سے رہ چکے تھے، ستر سال کی عمر میں بمقام لکھنؤ انتقال کیا، جنھوں نے آخر میں اپنی پچاس سالہ خدمات کے صلے میں برٹش گورنمنٹ کی طرف سے ایک اعزازی خطاب اور معقول پنشن حاصل کی)۔

پھر "Death of a distinguished Indian" کے عنوان سے بقیہ ص ۶ اور ص ۷ نیز ص ۸ کے حصے پر (TIMES) کا مفصل ادارتی نوٹ ہے، جس کے چند اقتباسات ذیل میں نقل کرتا ہوں۔

Contrary to the majority of his Muslim brethren who are enthralled by the greatest superstition and bigotry and opposed to English education and improvement......this enlightened Mohamedan cast off all those illebral feelings......sent his son at once to the Government college established in Jubbulpore in 1839. This young gentleman, Syed Abdulla was the first Mohamedan boy who commenced learning English here.

(برخلاف اپنے دوسرے مسلمان بھائیوں کے جو تعصب اور تنگ نظری کا شکار ہیں اور اس بناپر انگریزی تعلیم اور ترقی کے خلاف ہیں...اس روشن خیال مسلمان نے تمام تنگ نظرانہ محسوسات کو نکال کر پھینک دیا... انھوں نے اپنے لڑکے کو فوراً جبل پور کالج جو ۱۸۳۹ ع میں قائم ہوا تھا، بھیج دیا، یہ شریف نوجوان سید عبد اللہ پہلے مسلمان طالب علم تھے جنھوں نے وہاں انگریزی کی تعلیم حاصل کی)[1]۔

سید عبد اللہ کے ایک چچا زاد بھائی سید واجد بن سید محمد حسین، صاحبِ تصنیف تھے، جنھوں نے «اسرار الاشرار» کے نام سے اردو میں ٹھگوں کی واردات پر مشتمل ایک بہت ہی دلچسپ اور مفید کتاب لکھی ہے جو $\frac{22\times18}{8}$ سے بڑی

۱۔ مکتوب کلب مصطفےٰ صاحب جائسی بنام راقم ۲۷ اکتوبر سنہ ۶۰ ع

تقطیع کے ۳۴۲ صفحات پر مشتمل ہے ، ان کا ترجمہ کیا ہوا ایک قلمی نسخہ (فل اسکیپ تقطیع پر) «مخزن البکا» کا بھی موجود ہے جس کا نام انھوں نے «کنز البکا» رکھا تھا یہ کتاب ایک مقدمے چودہ مجلسوں اور ایک خاتمے پر جس میں امام حسین ع کے آٹھ خطبوں کا ذکر ہے ، مشتمل ہے . یہ ترجمہ ۱۳ نومبر ۱۹۱۹ ع بمقام جوہری محلہ لکھنؤ پایۂ تکمیل کو پہنچا تھا ، آخر میں یہ دعا ہے ، «محتاج ہوں اللہ مجھے زاد سفر دو»

اس کے علاوہ انھوں نے «غصے کا قصہ» کے نام سے بھی ایک کتابچہ تصنیف کیا تھا ، مگر اب وہ گویا ناپید ہے . ان کا انتقال شروع دسمبر ۱۹۱۹ ع کو عالم مسافرت میں ہوا [۱] .

اس خانــــدان میں اب تک اہل علم و فضل کا سلسلہ قائم ہے ، چنانچہ کلب مصطفے صاحب جائسی جو اس وقت مشاہیر اہل ادب میں ہیں ، سید عبد اللہ سے قریبی تعلق رکھتے ہیں .

سید عبد اللہ حسینی اسی خاندان کے ایک ہونہار فرزند تھے ، افسوس ہے کہ ان کے سوانح زندگی اس قدر تاریکی میں ہیں کہ سنہ ولادت کا بھی متعینہ طور پر پتہ نہیں چل سکا ، البتہ اس قــدر تحقیق سے معلوم ہے کہ ۱۸۴۶ ع وہ لاہور رزیڈنسی میں ٹرانسلیٹر (مترجم) ہوکر چلے گئے تھے اور اس وقت تک جبل پور کالج کا کورس ختم کرنے کے بعد بنارس کالج سے بھی فارغ التحصیل ہوچکے تھے . اس کے بعد کچھ عرصہ تک وہ انگریز آفیسرس کو ہندوستانی کا درس بھی دیتے رہے . اس لحاظ سے ۱۸۴۶ ع میں ان کی عمر بیس سال سے کم کسی طرح تجویز نہیں کی جاسکتی اس لئے کہ اعلیٰ تعلیم کے مراحل عموماً بیس پچیس سال سے کم میں طے نہیں ہوتے . اس کے علاوہ اس سے کم عمر میں سرکاری ملازمت کا ملنا بھی بعید از قیاس ہے ، اس طرح ان کی ولادت ۱۸۲۵ ع کے کچھ قبــل یا بعد قرار دی جاسکتی ہے .

سید عبد اللہ کی ابتدائی تعلیم کہاں ہوئی ؟ اس کے بارے میں کچھ کہا نہیں جاسکتا ، البتہ جبل پور کالج میں ان کا داخلہ ۱۸۳۹ ع میں ہوا ہے ، وہاں انھوں نے بہت جلد انگریزی میں غیر معمولی استعداد پیدا کرلی چنانچہ وہاں جو انگریز آفیسرس

---

۱ ـ حاشیہ میمورنڈم سرڈانلڈ فریل .

تھے وہ ان کی ذہانت اور قابلیت سے بڑے متاثر تھے، اور یہی تاثر ان کی آیندہ ترقیوں کا سبب بنا۔ جبل پور کالج میں تعلیم ختم کرنے کے بعد، ان کے والد نے ان کو تکمیل علم کی غرض سے بنارس کالج بھیج دیا، یہاں تھوڑے ہی عرصے میں وہ انگریزی کے ایک جید الاستعداد فاضل ہوگئے، اسی کے ساتھ انھوں نے اردو، فارسی اور عربی میں بھی قابل ذکر استعداد حاصل کرلی[1]۔

بنارس کالج سے تعلیم ختم کرنے کے بعد انھوں نے اسسٹنٹ اورسیری کا بھی ایک امتحان پاس کیا[2] اور کچھ عرصے بعد وہ انگریزوں کو اردو، فارسی پڑھانے پر مقرر ہوگئے۔

بنارس چھوڑنے سے قبل ۱۸۴۶ ع میں ان کا تقرر لاہور رزیڈنسی میں ٹرانسلیٹر کی جگہ پر ہوگیا جہاں وہ دو سال رہے، اس کے بعد ۱۸۴۸ ع میں اسی عہدے پر پنجاب بورڈ کو ان کا تبادلہ ہوگیا، اتفاق سے اسی زمانے میں ان کا انگلینڈ جانا ہوگیا۔ جس کا سبب یہ ہوا کہ پیر ابراہیم، برٹش ایجنٹ کی حیثیت سے نواب بھاول پور کے یہاں متعین تھا چونکہ "Multan campaigns" کے زمانے میں اس نے نمایاں خدمات انجام دی تھیں اس لئے ریاست کے ایک معتمد رکن کی حیثیت اس کو انگلینڈ بھیجا جانا طے ہوا[2]، اس موقع پر سید عبداللہ اس کی ہمراہی کے لئے بحیثیت سکریٹری اور مترجم کے چنے گئے[3]۔

قیصر التواریخ حصہ دوم میں بحوالہ اخبار کلکتہ جو عبارت درج ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ پہلے آپ سفارتخانۂ کلکتہ مین محافظ دفتر تھے، اس کے بعد لندن گئے وہاں ایک افسر فوج کی لڑکی سے شادی کرلی، جب واجد علی شاہ معزول ہوکر کلکتہ گئے تو سید عبداللہ کی ایک عرضداشت آئی تھی جس پر شاہ معزول نے «اصلاح الدولہ» کی مہر کندہ کراکے بھجوائی تھی[4]۔

یہاں سے سید عبداللہ کی زندگی کا نیا موڑ پیدا ہوتا ہے۔ انگلینڈ پہنچ کر انھوں نے ایک انگریز لڑکی سے شادی کرلی چنانچہ پیر ابراہیم کے مشن کی مدت ختم ہوجانے کے بعد بھی انھوں نے وہیں رہنا طے کرلیا، جلد ہی یہاں ان کو السنۂ مشرقیہ کی ٹیچری کی جگہ مل گئی، رفتہ رفتہ اس پیشے میں انھوں نے اتنی ترقی حاصل کی کہ

---

۱ ۔ میمورنڈم سرڈانلڈ فریل۔	۲ ۔ حاشیۂ سید عبداللہ بر میمورنڈم سرڈانلڈ فریل	۳ ۔ ایضاً۔
۴ ۔ اکابر جائس قلمی مولفہ مہر جائسی

لندن یونیورسٹی میں ہندوستانی کے پروفیسر کی حیثیت سے ان کا تقرر عمل میں آیا [۱]۔ اس جگہ پر انھوں نے سات سال کام کیا [۲]۔ اب انھوں نے ہندوستان پلٹنا چاہا لیکن اس وقت تک ان کے لئے لندن چھوڑنا ناممکن تھا جب تک ہندوستان میں ان کو کوئی اچھا عہدہ نہ مل جائے [۳]۔ سید عبد اللہ اب تک جو مقام حاصل کرچکے تھے اس کو دیکھتے ہوئے ان کے لئے یہ کوئی بڑی بات نہ تھی چنانچہ یہ معہ اپنی بیوی کے ہندوستان واپس آگئے اور یہاں آکر محکمۂ تعلیمات میں ڈپٹی ڈائریکٹر کے عہدے پر مقرر ہوگئے [۴]۔

انتقال | اکابر جائس میں ہے: دورے پر تھے کہ بمقام مٹھیاری صوبہ اڑیسہ میں انتقال کیا ، کلکٹر یا جج کے پاس ان کا سر بمہر وصیت نامہ تھا جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ میں مذہب شیعہ رکھتا ہوں ، چنانچہ ان کی تجہیز و تکفین مطابق مذہب امامیہ کے ہوئی ، ان کی بیوی نے اپنے شوہر کے انتقال کی اطلاع خاں بہادر سب جج سید غلام حیدر جائسی کو دی انھوں نے اس کے جواب میں تعزیتی خط لکھا اور اسی میں ان کے بلانے کے لئے لکھا لیکن وہ لندن واپس چلی گئیں .

سید عبد اللہ کی صرف ایک حقیقی بہن تھیں ، جن کی شادی جائس میں ہوئی تھی ، ان کی نسل جائس میں ہے خان بہادر سب جج غلام حیدر ان کے سوتیلے بھائی تھے ، جن کا انتقال ۱۹۱۱ ع میں ہوا ان کے دو لڑکے سب جج سید احمد حسین اور منصف سید وجاہت حسین قابل ذکر ہیں .

سید عبد اللہ کی اولاد کے بارے میں کوئی تفصیل نہیں مل سکی « اکابر جائس » میں صرف اس قدر ہے ان کی ایک لڑکی تھی جس کا نام « کلیرا » تھا ، اس سے اور بعض اعزاء جائس سے خط و کتابت تھی . مسٹر رکس ڈپٹی کمشنر رائے بریلی ان کے نواسے تھے ، ان کو اس وقت اس کا علم ہوا جب وہ ۵ نومبر ۱۹۱۸ ع کو اپنے عہدے سے سبکدوش ہوکر جانے لگے ،

اردو نظم و نثر کا نمونہ | سید عبد اللہ انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو ، فارسی

---

۱ ـ حاشیہ سید عبد اللہ بر میمورنڈم سرڈانلڈ فریل		۲ ـ ایضاً		۳ ـ میمورنڈم سرڈانلڈ فریل

۴ ـ اکابر جائس قلمی

اور عربی کے بھی جید الاستعداد فاضل تھے اور یورپین ممالک میں ایک عرصے تک ان ہی زبانوں کی انھوں نے تعلیم دی اس بناپر یہ ناممکن ہے کہ انھوں نے ان علوم پر کوئی کام نہ کیا ہو جبکہ ان کے دوستوں میں ای. ایچ. پامر جیسے قابل ذکر مولفین کے نام ملتے ہیں، لیکن ان کی کوئی تالیف اس وقت دستیاب نہیں، البتہ ۱۸۶۸ ع مین «اخلاق ہندی» مولفہ میر بہادر علی حسینی کا دوسرا ایڈیشن سید عبد اللہ کی تصحیح کے ساتھ شائع ہوا تھا جو آج قریب قریب بالکل نایاب ہے. مجھ کو «رضا لائبریری» کی پرانی کتابوں میں اتفاق سے اس کا ایک (Specimen) مل گیا ہے جس کے سرورق کی عبارت یہ ہے.

اخلاق ہندی، جس کی، اصل مفتی، تاج الدین کی مفرح القلوب، فارسی ہے اور میر بہادر علی حسینی، نے زبان ہندوستانی میں اس کا ترجمہ کیا اور وہ، ترجمہ ۱۸۰۳ ع کے مطابق ۱۲۱۸ ھ کے شہر کلکتہ، میں چھاپا ہوا تھا اب بعہد دولت مہد ملکہ معظمہ انگلستان و ہندوستان، کوئن وکٹوریہ دامت سلطنتہا بوزارت رایٹ آنربل سر اسٹافورڈ، نارتھ کورٹ بیرونٹ میمبر آف پارلیمنٹ سکریٹری آف، اسٹیٹ فار انڈیا بہ تصحیح خاکسار بیمقدار سید عبد اللہ بن سید محمد، خان بہادر غفران، پناہ مطبع صاحبان ذیشان ڈبلیو. ایچ. ایلن اور کمپنی، واقع نمبر ۱۳ واٹرلو پلیس ویسٹ منسٹر لندن میں، پھر مطبوع ہوا، ۱۸۶۸ ع، مطابق ۱۲۸۵ ہجری،

اس کے بعد خاتمے کی عبارت اور ایک قصیدہ ہے جس کو ذیل میں نقل کرتا ہوں، اس سے موصوف کی اردو نثر نگاری اور قوت نظم کا پورا پورا اندازہ ہو سکتا ہے.

خاتمہ

ہو الاول ہو الآخر الحمد للہ کہ اس کتاب کا اختتام ہوا اور عہد وزارت امیر کبیر سر اسٹافورڈ نارتھکوٹ صاحب بہادر بالقابہ میں نسخہ تمام ہوا اور ان کی توجہ بے غایت اور الطاف و عنایت سے نہ فقط اس کتاب کا بلکہ خود اس فدویت انتساب کا رتبہ بڑھا بقول سعدی.

سزد گر بدورش بنازم چناں		کہ سید بدوران نوشیرواں

اوصاف اس مجمع علم و کمال اور مرکز جاہ و جلال کے میری کیا جان اور قلم کی کیا زبان ہے جو بیان کروں اس کی ذات خجستہ صفات فضل حی و قیوم سے موجود ہے، میرا تعریف کرنا فضول اور بے سود ہے، مشک آنست کہ خود ببوید نہ آنکہ عطار گوید، عیاں را چہ بیان، مگر جو امر حق ہو اس کو چھپانا گویا آفتاب پر خاک ڈالنا ہے اور اپنے ولی نعمت کا شکر نہ کرنا کفر ہے من لم یحمد الناس لم یحمد اللہ اس واسطے بالکل ساکت بھی نہیں رہ سکتا:

کیا کہوں کچھ کہا نہیں جاتا ✿ چپ رہوں تو رہا نہیں جاتا

گویم مشکل و گر نہ گویم مشکل. بہرحال الفاظ چند بنظر اظہار حق نہ خوشامد سے عرض کرتا ہوں، گر قبول افتد زہے عز و شرف. حقیقت حال یہ ہے کہ جس تاریخ سے یہ امیر ابن امیر مدبر امور ہند مقرر ہوا ہر طرح سے خیال بہبود ہند اور ھندیوں کا مد نظر رہا. افضال الٰہی اور اقبال شاہی اس وزیر خوش تدبیر کی نیک نگاہی سے سارا ہندوستان آباد ہے اور ہردل انصاف پسند شاد ہے

یہ سچ ہے کہ اقلیم ہندوستان ہوئی اس کے اقبال سے بوستاں
شگفتہ ہیں گل، بلبلیں نغمہ سنج شکستہ ہیں سب خار اندوہ رنج

ایک وقت وہ تھا کہ ہندوستان میں کوئی مسافر ایک شہر سے دوسرے شہر کو بے خطر نہ جاسکتا تھا راہیں ٹھگوں اور ڈکیتیوں سے، بازار دغا بازوں اور جیب کتروں سے، دوکانیں اور گھر نقب زنوں اور چوروں سے حفاظت میں نہ تھیں اور ایک وقت یہ ہے کہ حکومت سرکاری میں راہیں خشکی اور تری کی ریل گاڑی اور دود کش کی آمد و رفت سے پر شور و غوغا ہیں، مال تجارت کڑوڑوں کا آتا جاتا ہے کوئی نہیں پوچھتا کہ موتی لئے جاتے ہو یا پوت، سونا لئے جاتے ہو یا پتھر، بازاروں میں جتنی مال و اسباب کی کثرت ہے اتنی ہی کیسہ بروں کی قلت، دوکانوں اور گھروں میں کچھ چوکی پہرے کی حاجت نہیں، رعب سیاست سرکاری ان کا پاسبان ہے، جہاں لڑائی اور خونریزی ہر روز سننے میں آتی تھی وہاں اب سنسان ہے، ہر روز علم کی ترقی اور جہل کی کمی ہے. انصاف سے ظلم کی خرابی اور برہمی ہے، جہاں گائے بیل کی قربانی منع اور آدمی کی از مباحات تھی. بچہ کشی اور ستی ہونا گویا منہ کی بات تھی وہاں مار پیٹ کا توکیا ذکر ہے

کوئی کسی کو گالی بھی اگر دے یا آدمی کے بدلے جانور کی بھی جان کو ناحق لے تو ایسی سزا پائے کہ چھٹی کا دودھ زبان پر آئے۔ بردہ فروشی اور کسب حرام حفاظت رعایا کو تھانے اور پولیس. حفاظت ملک کو فوج جرار پیادہ اور سوار، بری اور بحری ہمیشہ تیار، مخالف سرکاری زبوں، اور نشان جہازات عالم کے، سامنے رایت دولت انگلیزیہ کے سرنگوں ہوتے ہیں. یہ عزت کیا کم ہے کہ حکومت ملکہ معظمہ کی سرکوب عالم ہے، پھر وزیر ایسے پادشاہ ظفر پانگاہ کا کیوں کر ویسا نہو شعر:

وزیرے چنیں، شہریارے چناں جہاں چوں نہ گیرد قرارے چناں

ہند پر شکریہ اس کا فرض ہے کہ زیر حکومت ایسے بادشاہ معدلت پناہ کے ہے کہ جس کا وزیر آصف جاہ سلیمان سے عقل اور تدبیر میں بڑھ کر ہے. میرے اوصاف اس حکومت کے اگر کوئی شخص خوشامد پر محمول کرے تو اس کو لازم ہے کہ احوال ہند کو ایک نظر بچشم انصاف دیکھے. مدرسے، تھانے، نمایش گاہیں، دواخانے، تار برقی، ڈاک، مراکب دودی، ترقی تجارت، داد رسی مظلوماں، سرکوبی ظالماں، رئیس بے انتظام کو معزول کرنا، اور حاکم منتظم کو اختیار دینا یہ سب باتیں رفاہ کی میرے دعوی پر دلیل ہوں گی اور مخالف کی دلیلیں سب ذلیل ہوں گی، انصاف شرط ہے جو حصہ ہندوستان کا سرکار نے نہیں لیا دیکھو تو وہاں کیسی خرابی اور ویرانی ہے. حاکم وہاں کے تھپنی کے تھپنا، گوبر گنیش مائی کے طبیب، جو الف کے نام لٹھا بھی نہیں جانتے، رات دن رنڈیوں میں بسر کرتے ہیں.

صبح تو جام سے گذرتی ہے شب دل آرام سے گذرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے اب تو آرام سے گذرتی ہے

ان کا وجود کا لعدم ہے «چہ خفتہ و چہ بیدار» مگر سب حکام اور راجہ ایسے نہیں، جناب معزز خطاب مہا راجہ سرگباشی والی پٹیالہ کو دیکھئے کہ اپنے حسن انتظام اور عقل و فہم سے کیسے نیکنام رہے اور پیشگاہ ملکہ معظمہ کوئین وکٹوریہ دام ملکہا سے تغمائے عزت اور خطاب فرزند خاص، منصور زماں امیرالامراء مہا راجہ دھراجہ راجیشر مہا راجۂ راجاجگان نرندر سنگھ مہندر بہادر کا ملا اور اب فی زماننا

سری مہاراجہ ادھراج والی کپور تھلہ دام دولتہ جو سرکار انگریز کے خیر خواہ جانی رہے اور جانفشانی میں جان و مال سے دریغ نہیں کیا اور مہمات کابل اور پنجاب میں کیسے کارنمایاں کئیے خصوصاً بلوائیے ۱۸۵۷ ع میں جو شجاعتیں اور بہادریاں کیں ان کا کیا کہنا یہی کافی ہے کہ بہ جلدوئے حسن خدمات پیشگاہ ملکہ معظمہ سے خطاب فرزند دلبند راسخ الاعتقاد راجہ اندھیر سنگھ بہادر اور ستارۂ ہند کا تمغہ عطا ہوا، جاگیر بھی ملی اور امید قوی ہے کہ اور ترقی مناصب بھی ہو، یہ سب خوبیاں ان کے حسن انتظام اور سرکار کی قدر شناسی کا ثمرہ ہے، تعریف دولتِ انگریزی کا کرنا گویا توصیف ارکان دولت کی ہے، اگر وزراء ایسے نہ ہوتے تو یہ رونقِ سلطنت کہاں ہوتی؟ اگر رائٹ آنربل سراسٹا فورڈ نارتھکوٹ صاحب بہادر دام اقبالہ کی نیک نیتی، خوش نصیبی اور تدبیر رسا شریک نہ ہوتی تو یہ نیکنامی جو فتح جشن پر ان کی وزارت کے ایام میں حاصل ہوئی، کب ہوتی؟ کیا اعانت ربانی ہے کہ جتنا کام ان کے تحت میں ہے سب مزین بحسنِ انتظام و کامرانی ہے جس قدر اس امیر کبیر کے اوصاف بیان کرو تھوڑے ہی ہیں، اس نیاز مند کو خود ان کی خدمت میں نیاز ہے اس لئے جو کہتا ہوں آنکھوں دیکھی ہے فقط کانوں سنی نہیں جو خوبیاں اس مختصر میں اس عالی ہمت والا دودمان مجمع علم، منبع فیض، معدن جود و احسان کی لکھوں وہ اس سے بہت کم ہونگی جو تواریخ عالم میں ابدالآباد کو نام پر میرے ممدوح کے لکھی جائینگی، میں فقط دعا پر اپنا کلام تمام کروں گا کیونکہ اس کے اوصاف کرنا اور دریا کو کوزہ میں بھرنا میرا کام نہیں جو کچھ میں نے کہا ہے «اندکے از بسیار و مشتے نمونہ از خروارے» ہے

تازیب زباں بود بہ تقریر ٭ تا زینت کاغذ است تحریر
نامت برود بہ نیکنامی ٭ ہر خامہ کند ترا غلامی
سر چشمۂ فیض تو رواں باد ٭ اقبال چو دولتت جواں باد

اس کے بعد حسب ذیل قصیدہ ہے:

قصیدہ

گو نہیں حاصل بخوبی قوت نطق و بیاں
پر مناسب ہے کہ ہوں حمدِ خدا سے تر زباں

وہ خدائے پاک و برتر جس نے احمد کو کیا
رہنمائے جن و انساں، پیشوائے مرسلاں

وہ نبی جس نے علی کو جانشیں اپنا کیا
جانتے ہیں سب، غدیر خم کے جو ہیں راز داں

دونوں کو پہونچے درود اور دونوں کو پہنچے سلام
ان کے لائق اور کیا ہے پاس میرے ارمغاں

شکرِ خالق میں رہے مصروف خلقت، چاہئے
یعنی بندوں پر وہ اپنے ہے نہایت مہرباں

سلطنت وکٹوریہ کو کی عطا اللہ نے
ہندیوں پر ہے یہ احسانِ خداوندِ جہاں

کونسی ایسی کوئی گذری ہے نہ آگے ہوئیگی
فیض بخش و داد گستر اہل جود و امتناں

ختم اس پر ہے رعیت پروری و منصفی
ہے عجب عاجز نواز، اہل عطا و مہرباں

خلق و اکرام و مروت میں نہیں اس کا نظیر
قدر اس کی جانتے ہیں خوب جو ہیں قدر داں

پیر گردوں خم پئے تسلیم ہے اس کے حضور
عقل و بخت اس کو دئے ہیں حق تعالیٰ نے جواں

بے سخن وہ باعث افزونئی اخلاق ہے،
کیوں فدا اس پر نہ کیجئے اے دل اپنا مال و جاں

حکم اس کا ماہ سے ماہی تلک جاری ہے واہ
کیوں نہ ہو توصیف میں اس کی مرا خامہ رواں

اس کے حق میں کر رہے ہیں، اوج و حشمت کی دعا
ساکن انگلینڈ و ہر باشندۂ ہندوستاں

ہوں عدو پامالِ غم آفاق میں اس کے مدام
دوست جو دل سے ہوں اس کے وہ رہیں سب شادماں

کیسے کیسے اہل دانش ہیں امیر اس کے رفیق
ہے بجا اک اک کو گر کہئے فلاطون زماں

انتظام ملک کرتے ہیں بآئیں بہیں
بندوبست ان کا ہے بیشک باعثِ امن و اماں

منتخب ان میں سے ہے ممدوح میرا نارتھکوٹ
رائٹ آنریبل سر اسٹافورڈ، مشہور جہاں

وہ مدار کار عالم، مستقل، ذی اختیار
رائق و فائق وہی ہے ازپئے ہندوستاں

اس کے اوصاف حمیدہ سے ہے خوش وکٹوریہ
والی روئے زمین، شاہنشہ ہندوستاں

بادشہ کوئی نہ ویسا ہے نہ ایسا ہے وزیر
دونوں کو رکھے سلامت خالق کون و مکاں

کس قدر اخلاق نے پایا ہے عالم میں رواج
کبر و نخوت کا نہیں باقی رہا نام و نشاں

علم و اخلاق و ادب میں بے نظیر و بے مثال
مفتی تاج الدین کا اک نسخہ ہے مشہور جہاں

بارہ سو اٹھارہ ھجری میں ہوا تصنیف جو
تھے اٹھارہ سو اور تین از سن عیسائیاں

ترجمہ اردو زباں میں پھر کیا اک شخص نے
رکھدیا اخلاقِ ہندی نام ہو کر شادماں

اسم سامی مترجم ہے بہادر سے شروع
خاتمہ ہے نام کا اس کے علی پر بے گماں

تھی کتاب خوب و زیبا بسکہ علم خلق میں
اور سکھلاتی تھی ہر اک کو زبان ہندیاں

صاحبان عقل و دانش کو خوش آئی اس قدر
کر دیا مشروط اس کو از برائے امتحاں

میں نے جب اس پر نظر کی خوب غور و فکر سے
بیشتر اغلاط پائیں، دیکھیں کمتر خوبیاں

جس قدر ممکن ہوا، میں نے کمال جہد سے
صرف ہمت کو کیا بہر سرور دوستاں

بعد تصحیح مزید آخر اسے چھپوا دیا
دیکھ کر تا اہل دانش اس کو ہوں سب شادماں

ختم طبع اس کا ہوا مطبع میں با لطف تمام
ڈبلیو، ایچ، ایلن اینڈ کو فخر مانی ہیں جویاں

سیزدہ نمبر کے ساکن ہیں یہ واٹرلو پلیس
خاص لندن میں جونزھت بخش ہے بہر رواں

ہو اگر ادراک سال طبع، مطبوع مزاج
ہوئے گا اس بیت کے پڑھنے سے ہر اک کو عیاں

یک ہزار وہشتصد اور شصت وھشت عیسوی
یک ھزار و دو صد وھشتاد و پنج مسلماں

با وجود اہتمام صحت و غور بلیغ
کچھ بھی گر سہو و خطا کا ناظریں پاویں نشاں

لطف و الطاف بزرگانہ سے یہ امید ہے
دامن عفو و عطا میں اس کو فرمائیں نہاں

انکشاف نام کی خواھش اگر بندے کے ہو
انکسار و عجز سے دیتا ہوں میں اپنا نشاں

سید عبداللہ ہندی ، نام اس عاجز کا ہے
نام نامی باپ کا میرے ہے مشہور جہاں

حضرت سید محمد ، خاں بہادر جائسی
صاحب اعزاز و مکنت ، افتخار خاندان

ہیں امام عاشر ان کے جد امجد فخر خلق
کون بہتر ان سے ہوگا اور والا دود ماں

رحمت اللہ ان پر ہوئے تا روز قیام
جو ہوئے اس سال ھی میں داخل باغ جناں

اسی کے متصل دوسرا قصیدہ مسٹر ای ، ایچ ، پامر کا ہے ، جس میں اس نے اصل کتاب « مفرح القلوب » اور اس کے مولف « مفتی تاج الدین » نیز مترجم « میر بہادر علی حسینی » کا تذکرہ کرتے ہوئے ، آخر میں سید عبداللہ اور ان کے والد « سید محمد » کا ذکر کیا ہے اور کتاب کی تاریخ اشاعت ھجری اور عیسوی دونوں طریقے پر نظم کی ہے .

چونکہ یہ قصیدہ ایک انگریز کی تصنیف ہے اس لئے اس کا نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا . کلام کی روانی اور سلاست ، الفاظ اور تراکیب کی برجستگی کو دیکھ کر یہ نہیں سمجھا جاسکتا کہ یہ کلام ایک غیر ملکی کا ہوسکتا ہے .

قصیدہ من تصنیف مسٹر ای ، ایچ ، پامر

چونکہ ہے حمد خدا ، تاج سر نطق و بیاں
چتر نعت عیسیٰ گردوں نشیں ہو سائباں

کیا عجب ، برسائے اختر کے جواہر آسماں
کہکشاں کے جوہری بازار سے ہو شادماں

مورچھل طاؤس لائے اور کلغی خود ہما
دے زر گل کی بنا پوشاک پر زر بوستاں

بوتلیں غنچے بنیں ، گلہائے گلشن ہوں گلاس
اور گلابی ہوئے بس رنگ بہار گلستاں

شاہد ناز چمن، رقاص ہوکر آئیں پھر
دے انہیں نقد ثریا کا وہ جھومر آسماں

سب جوانان چمن گائیں بجائیں پیش گل
نغمۂ بلبل کو سن، چکر میں آئے باغباں

یوں صدا نکلے بہم مل کر بجائیں ساز جب
دھوم درپر دھوم درپر درپہ تیرے شادماں

کہکشاں تو ہو سڑک، ذرات تاباں ہوں نجوم
روشنی میں اس پہ سیاروں کی دوڑیں بگھیاں

آسماں بن جائے پل، خورشید و مہ ہوں لالٹین
اور بجائے سلسلہ تار شعاعی ہوں عیاں

چرخ بنجائے عماری، برق تاباں جھول ہو
فیل ہو ابر سیہ اور رعد ہوئے فیل باں

دھن میں مستی کی ہوا پر جب چلے وہ جھوم جھوم
موج دریا اس کی بیڑی ہو قدم کوہ کلاں

ہمرکابِ ابلق دوراں ہو یہ سارا جلوس
اور سواری میں مرے ممدوح کی ہووے رواں

کون ہے وہ صاحب اقبال و عزت نارتھ کوٹ
رائٹ آنریبل سر اسٹافورڈ ممدوح زماں

خاص خاص ملکۂ عالم، کوئن وکٹوریہ
جس کے ہے زیر قلم، انگلینڈ اور ہندوستاں

گرچہ ہے بلقیس، لیکن ہے سلیمانی اسے
زیر سایہ جس کے ہے عنقا نے ڈھونڈھا آشیاں

وہ سکندر، یہ فلاطوں، وہ سلیماں زمن
آصف عہد اس کو کہئے، بلکہ میں بھولا یہاں

وہ شنیدہ ہیں یہ دیدہ ، اس کا ہے یہ اقتدار
سر جھکائیں والی چین و ختن آکر جہاں

ہر حباب بحر سے ہے بس عیاں ان کا شمار
ہفت کشور میں بنی ہیں جتنی اس کی کوٹھیاں

شغل ہے اس کے جوانوں کا یہی روز مصاف
توپ ، زنبورک ، جزائر رھکلہ ، بندوق و بان

باد پاؤں پر لگائے پھرتے ہیں اس کے سوار
بانک ، برچھی ، تیر و شمشیر و سپر، ترکش ، کماں

اسکی وہ سنگیں ہے سنگیں ، سنگدل ہوں جسسے موم
کرچ اسکی کرچیں کرتی ہے عدو کی استخواں

ملکۂ کشور ترے سر پر رہے ظلِّ اله
خیر خواہ ہند تیرا لطف حق ہو پاسباں

عندلیب خامہ اس گلشن سے نکلا ، نغمہ سنج
اور شاخِ مدعا پر بیٹھ کر ہے سجع خواں

نسخۂ مفتی تاج الدین ، « مفرح القلوب »
در ہزار و ہشتصد ، سہ ، سن و سال عیسیاں

یک ہزار و دو صد و ہجدہ تھے سال احمدی
جسمیں ایک عالم ہوا ہندی میں اسکا ترجماں

نام نامی ہے مترجم کا بہادر یا علی
ترجمہ کا نام ہے «اخلاق ہندی» بے گماں

مطبع مطبوع طبع اہل علم و فضل میں
جسکے مالک ڈبلیو ، ایچ ، ایلن انڈ کو صاحباں

کارخانہ جن کا ہے واقع بہ واٹر لو پلیس
سیزدہ نمبر بناف شہر لندن ہے دکاں

اس کی ہر کاپی سے کانپے ہاتھ بس بہزاد کا
اس کی ہر کل سے ہے بیکل نقشۂ ارژ نگیاں

اس کو چھپوایا بصحت، میر عبداللہ نے
میرے مخدوم و مکرم، میرے مشفق مہرباں

حضرت سید محمد خاں بہادر کے پسر
نام نامی جن کا ہے ممدوح و مشہور جہاں

محسن اس احقر کے تھے وہ سید عالی مقام
داغ جن کا ہے دلوں پر خود بہ گلزار جناں

چھپ چکی جس دم کتاب انتخاب و لاجواب
تازگی بخشِ عیون اہل فطنت، نکتہ داں

اس کا ہر صفحہ خیاباں ہے، روش بین السطور
ہر ورق گلزار معنی وہ گلستاں بوستاں

جلد سالِ طبع لکھ اڈورڈ ہنری پالمر
تا کہ ہجری عیسوی، دونوں کا ثابت ہو نشاں

یک ہزار وہشت صد اور شصت وہشتِ عیسوی
یک ہزار و دو صد و ہشتاد و پنج مسلماں

آخر میں ہم «میمورنڈم سر ڈانلڈ فریل» اور اس پر سید عبداللہ کا جو حاشیہ ہے بعینہ نقل کرتے ہیں تا کہ ان کے سوانح حیات کا ایک اہم ماخذ محفوظ ہوجائے۔

فنا کر دیتے ہیں۔ مغرب زدگی کے نتائج ان کے سامنے تھے اور ان کی دور رس نگاہوں نے آنے والی تباہ کاریوں کو دیکھ لیا تھا۔

مغرب میں علم و ہنر کی روشنی بہت ہے مگر اس ظلمات میں آب حیات نہیں۔ یہ زندگی کُش امور کی تعلیم دیتا ہے عصر حاضر پر اکبر کے چار مصرعہ ملاحظہ کیجئے۔

انوار اس دور کے دل افروز ہیں کم — گویا کہ شبیں بہت ہیں اور روز ہیں کم
ہر چرب زبان نہیں ہے شمع اخلاص — جلنے والے بہت ہیں دل سوز ہیں کم[1]

اکبر چاہتے ہیں کہ بزم میں اخلاص کی شمع روشن رہے، وہ دلسوزی چاہتے ہیں، موم کا پگھلنا انہیں گوارا نہیں۔ شب کی جمع شبیں محل نظر ہے۔

مغربی علوم اور مغرب زدگی اور اس کی پرستاری نے جو گھناؤنا پن پیدا کردیا ہے وہ ظاہر ہے اس نے اخلاق کی حالت خراب کردی ہے۔

عزت کا راز نیکی میں مضمر ہے۔ تحصیل علم سے وہ باز نہیں رکھتے۔ مگر اس علم کے وہ مخالف ہیں جو عزت کا نیلام کردے۔

حاصل کرو علم طبع کو تیز کرو — باتیں جو بری ہیں ان سے پرہیز کرو
قومی عزت ہے نیکیوں سے اکبر — اس میں کیا ہے کہ نقل انگریز کرو[2]

وہ اخلاق کی صحت اور درستی پر بار بار زور دیتے ہیں۔ اخلاق کی نادرستی معاشرت میں بڑی خرابی پیدا کردیتی ہے۔ اور یہ وبا کی مانند عام ہوکر پوری زندگی کو سر تا سر معصیت آلود بنا دیتی ہے۔ عشرت کو نصیحت کرتے ہیں۔

تحصیل علوم کر کہ دولت ہے یہی — اخلاق درست کر کہ زینت ہے یہی
اکبر کی یہ بات یاد رکھ اے عشرت — محفوظ ہو معصیت سے عزت ہے یہی[3]

یہ نصیحت عشرت (فرزند اکبر) کے نام ہے۔ عام نوجوانوں کی اخلاق کی درستی کی ہدایت کرتے ہیں معصیت سے محفوظ رہنے میں عزت ہے۔

اکبر اس علم کی تحصیل پر زور دیتے ہیں جو صحت مند عناصر کی تعلیم دے۔ اقبال کی نظر میں مفید علم کونسا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

---

۱ ۔ کلیات اکبر حصہ اول صفحہ ۱۴۵
۲ ۔ کلیات اکبر حصہ اول صفحہ ۱۴۹
۳ ۔ " " " صفحہ ۱۵۰

من آن علم و فراست با پرِ کاھے نمی گیرم
کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مردِ غازی را

علم حاضر سے دین کی زبونی کے جواب میں علامہ اقبال کے پیر رومی کا ارشاد بھی ملاحظہ کیجئیے :

علم را بر تن زنی مارے بود علم را بر دل زنی یارے بود [1]

اکبر نے کہا ہے :

انسان یا بہت سے دلوں کو ملاسکے یا کوئی شے مفید خلائق بنا سکے
ہم تو اسی کو علم سمجھتے ہیں کام کا پڑھنے کومستعد ہیں جو کوئی پڑھا سکے [2]

دوسری رباعی میں کہتے ہیں :

طاقت وہ ہے با اثر جو سلطانی ہے اس جا ہے چمک جہاں زر افشانی ہے
تعلیم وہ خوب ہے جو سکھلائے ہنر اچھی ہے وہ تربیت جو روحانی ہے [3]

ضرورت اس امر کی ہے کہ تعلیم سے انسان کے دل و نظر میں نور پیدا ہوسکے بصیرت سوز علم بالکل بے کار ہے ۔

تعلیم بھی پائی سب کے پیارے بھی ہوئے دنیا کو بھی خوش کیا ہمارے بھی ہوئے
لیکن جو یہ نور طبع پایا نہ گیا پھر کیا تم عرش کے جو تارے بھی ہوئے [4]

مذکورہ اشعار سے اکبر کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہوجاتی ہے ۔ ان کے علاوہ متعدد اشعار ایسے ہیں ۔ جن میں علم کے اخلاق سوز نتائج کا ذکر ہے ۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے :

ہم ایسی کل کتابیں قابل ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں [5]

تعلیم دختران سے یہ امید ہے ضرور
ناچے «دلہن» خوشی سے خود اپنی برات میں [6]

اطفال میں بو آئے کہاں ماں باپ کے اطوار کی
دودھ تو ڈبہ کا ہے، تعلیم ہے سرکار کی

---

۱ ـ بال جبریل صفحہ ۱۸۰
۲ ـ کلیات اکبر حصہ اول صفحہ ۱۵۲
۳ ـ کلیات اکبر حصہ اول صفحہ ۱۵۶
۴ ـ " " " " صفحہ ۱۵۶
۵ ـ " " " " صفحہ ۲۴۹
۶ ـ کلیات اکبر حصہ سوم صفحہ ۳۷

گر جیب میں زر نہیں تو راحت بھی نہیں　　بازو میں سکت نہیں تو عزت بھی نہیں
گر علم نہیں تو زور و زر ہے بیکار　　مذہب جو نہیں تو آدمیت بھی نہیں [١]

معاشرت جب تک مذہب کے تابع رہتی ہے ، مذہب سے بیگانگی اسے وحشت اور بربریت کا شکار بنادیتی ہے ، مذہب سے آزاد معاشرت صرف گناہ کی تاریک پرچھائیں بن کر رہ جاتی ہے .

مذہب کا معاشرت سے ہے ربط کمال　　دونوں جو ہوں مختلف تو آرام محال
پہلے یہ مسئلہ سمجھ لیں احباب　　بعد اس کے رفارم کا کریں دلمیں خیال [٢]

مذہب قانون اور قوم کا محافظ ہے ، دونوں کو مختلف تصور کرنا کوتاہ نظری اور جہالت کی دلیل ہے .

مذہب قانون و قوم کا بانی ہے　　خالص طاعت عروجِ روحانی ہے
توہین اک دوسرے کی کرتے ہیں جو لوگ　　یہ جہل ہے یا ہوائے نفسانی ہے [٣]

اکبر کے سرتا سر مشرقی ذہن نے مذہب کے بارے میں نہایت سنجیدہ خیالات کا اظہار کیا ہے .

تری معین فقط ہے خدا کی ذات اے دوست　　خدا گواہ کہ پکی یہی ہے بات اے دوست
طلب مدد کی نہیں ان سے جو ہیں خود محتاج　　طلب مدد کی ہے بالصبر والصلوٰۃ اے دوست [٤]

دوسری جگہ کہتے ہیں :

خاطر مضبوط دل توانا رکھو　　امید اچھی خیال اچھا رکھو
ہوجائینگی مشکلیں تمہاری آسان　　اکبر اللہ پر بھروسا رکھو [٥]

نیک اعمال کی ہدایت ذیل کی رباعی میں کرتے ہیں .

اعمال کے حسن سے سنورنا سیکھو　　اللہ سے نیک امید کرنا سیکھو
مرنے سے مفر نہیں ہے جب اے اکبر　　بہتر ہے یہی خوشی سے مرنا سیکھو [٦]

اس تبلیغ میں انھوں نے لوگوں کے ہنسنے کی پرواہ نہیں کی .

---

١ ـ کلیات اکبر حصہ اول صفحہ ١٣٦
٢ ـ کلیات اکبر حصہ سوم صفحہ ١٣٨
٣ ـ 〃 〃 〃 〃 ١٥٥
٤ ـ 〃 〃 〃 اول 〃 ١٣٣
٥ ـ 〃 〃 〃 〃 ١٣٨
٦ ـ 〃 〃 〃 〃 ١٣٨

تائید وضع ملت و دیں کی کرونگا میں اہل زمانہ لاکھ ہنسیں مجھ غریب پر
ہوتا نہیں طبیب مداوا سے دست کش سچ ہے اجل تو ہنستی ہے سعی طبیب پر[۱]

قوم کی اس لا علاج بیماری پر اکبر کی ہمتِ اصلاح دیکھئے کہ اسے اجل سے تعبیر کرکے اصلاح میں مصروف ہیں۔ دوسری جگہ ڈنکے کی چوٹ کہا ہے۔

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں[۲]

دین کی پابندیاں لادینی سے ہر حالت میں بہتر ہوتی ہیں اور ان کے نتائج قوم اور سماج کے حق میں ہمیشہ مفید اور صحت مند ہوتے ہیں۔

آزاد سے دین کا گرفتار اچھا شرمندہ ہو دلمیں وہ گنہگار اچھا
ہر چند کہ زور بھی ہے ایک خصلتِ بد واللہ کہ بے حیا سے مکار اچھا[۳]

عموماً یہ خیال کر لیا گیا ہے کہ اکبر مغرب کے علوم و فنون کے مخالف تھے، حقیقت اس کے برعکس ہے ان کی دور رس نگاہوں نے ان مضرت رسانیوں کو بھانپ لیا تھا۔ وہ مختلف علوم و فنون کی تحصیل کے مانع نہ تھے، وہ چاہتے تھے کہ عوام مذہب سے بیگانگی اور بیزاری نہ اختیار کرلیں۔

کچھ منع نہیں ہر اک کی تحریر پڑھو لیکن قرآن کی بڑی تفسیر پڑھو
عظمت دنیا کی جب دبائے دل کو خالق کا کرو خیال تکبیر پڑھو[۴]

وہ نہیں چاہتے تھے کہ عوام اپنی بیش بہا میراث کی طرف سے آنکھیں بند کرکے کورانہ تقلید کریں۔

رسوا وہ ہوا جو مستِ پیمانہ ہوا لپکا جو سائے پر وہ دیوانہ ہوا
انگلینڈ سے اپنا دل جو لایا نہ درست محروم ادھر ادھر سے بیگانہ ہوا[۵]

سطور ذیل میں اکبر کے تعلیم کے متعلق کیا خیالات تھے۔ بیان کئے گئے ہیں۔

اکبر اور تعلیم اکبر کے اشعار کے مطالعہ سے عموماً عامی کو یہ گمان ہوتا ہے کہ وہ مغربی تعلیم کے مخالف تھے۔ وہ تحصیل علم کے خلاف نہ تھے، وہ مغربی تعلیم کے ان اثرات سے ڈر رہے تھے جو مشرقی اقدار کی اعلیٰ روح کو

۱۔ کلیات کبر حصہ اول صفحہ ۱۴۱
۲۔ کلیات اکبر حصہ اول صفحہ ۲۴
۳۔ کلیات اکبر حصہ اول صفحہ ۱۴۲
۴۔ " " " " صفحہ ۱۴۹
۵۔ کلیات اکبر حصہ اول صفحہ ۱۴۲

فنا کر دیتے ہیں۔ مغرب زدگی کے نتائج ان کے سامنے تھے اور ان کی دور رس نگاہوں نے آنے والی تباہ کاریوں کو دیکھ لیا تھا۔

مغرب میں علم و ہنر کی روشنی بہت ہے مگر اس ظلمات میں آب حیات نہیں۔ یہ زندگی کُش امور کی تعلیم دیتا ہے عصر حاضر پر اکبر کے چار مصرعہ ملاحظہ کیجئے۔

انوار اس دور کے دل افروز ہیں کم گویا کہ شبیں بہت ہیں اور روز ہیں کم
ہر چرب زبان نہیں ہے شمع اخلاص جلنے والے بہت ہیں دل سوز ہیں کم [1]

اکبر چاہتے ہیں کہ بزم میں اخلاص کی شمع روشن رہے، وہ دلسوزی چاہتے ہیں، موم کا پگھلنا انہیں گوارا نہیں۔ شب کی جمع شبیں محل نظر ہے۔

مغربی علوم اور مغرب زدگی اور اس کی پرستاری نے جو گھناؤنا پن پیدا کردیا ہے وہ ظاہر ہے اس نے اخلاق کی حالت خراب کردی ہے۔

عزت کا راز نیکی میں مضمر ہے۔ تحصیل علم سے وہ باز نہیں رکھتے۔ مگر اس علم کے وہ مخالف ہیں جو عزت کا نیلام کردے۔

حاصل کرو علم طبع کو تیز کرو باتیں جو بری ہیں ان سے پرہیز کرو
قومی عزت ہے نیکیوں سے اکبر اس میں کیا ہے کہ نقل انگریز کرو [2]

وہ اخلاق کی صحت اور درستی پر بار بار زور دیتے ہیں۔ اخلاق کی نادرستی معاشرت میں بڑی خرابی پیدا کردیتی ہے۔ اور یہ وبا کی مانند عام ہوکر پوری زندگی کو سر تا سر معصیت آلود بنا دیتی ہے۔ عشرت کو نصیحت کرتے ہیں۔

تحصیل علوم کر کہ دولت ہے یہی اخلاق درست کر کہ زینت ہے یہی
اکبر کی یہ بات یاد رکھ اے عشرت محفوظ ہو معصیت سے عزت ہے یہی [3]

یہ نصیحت عشرت (فرزند اکبر) کے نام ہے۔ عام نوجوانوں کی اخلاق کی درستی کی ہدایت کرتے ہیں معصیت سے محفوظ رہنے میں عزت ہے۔

اکبر اس علم کی تحصیل پر زور دیتے ہیں جو صحت مند عناصر کی تعلیم دے۔ اقبال کی نظر میں مفید علم کونسا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

---

۱ ۔ کلیات اکبر حصہ اول صفحہ ۱۴۵
۲ ۔ کلیات اکبر حصہ اول صفحہ ۱۴۹
۳ ۔ " " " " صفحہ ۱۵۰

من آن علم و فراست با پرِ کاهے نمی گیرم
که از تیغ و سپر بیگانـه سازد مردِ غازی را

علم حاضر سے دین کی زبونی کے جواب میں علامـہ اقبال کے پیر رومی کا ارشاد بھی ملاحظہ کیجئے :

علم را بر تن زنی مارے بود علم را بر دل زنی یارے بود [1]

اکبر نے کہا ہے :

انسان یا بہت سے دلوں کو ملاسکے یا کوئی شے مفید خلائق بنا سکے
ہم تو اسی کو علم سمجھتے ہیں کام کا پڑھنے کو مستعد ہیں جو کوئی پڑھا سکے [2]

دوسری رباعی میں کہتے ہیں :

طاقت وہ ہے با اثر جو سلطانی ہے اس جا ہے چمک جہاں زر افشانی ہے
تعلیم وہ خوب ہے جو سکھلائے ہنر اچھی ہے وہ تربیت جو روحانی ہے [3]

ضرورت اس امر کی ہے کہ تعلیم سے انسان کے دل و نظر میں نور پیدا ہو سکے بصیرت سوز علم بالکل بے کار ہے ۔

تعلیم بھی پائی سب کے پیارے بھی ہوئے دنیا کو بھی خوش کیا ہمارے بھی ہوئے
لیکن جو یـہ نور طبع پایا نہ گیا پھر کیا تم عرش کے جو تارے بھی ہوئے [4]

مذکورہ اشعار سے اکبر کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہوجاتی ہے ۔ ان کے علاوہ متعدد اشعار ایسے ہیں ۔ جن میں علم کے اخلاق سوز نتائج کا ذکر ہے ۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے :

ہم ایسی کل کتابیں قابل ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں [5]

تعلیم دختران سے یـہ امید ہے ضرور
ناچے « دلہن » خوشی سے خود اپنی برات میں [6]

اطفـال میں بو آئے کہاں ماں باپ کے اطوار کی
دودھ تو ڈبہ کا ہے ، تعلیم ہے سرکار کی

---

١ ـ بال جبریل صفحہ ١٨٠
٢ ـ کلیات اکبر حصہ اول صفحہ ١٥٢
٣ ـ کلیات اکبر حصہ اول صفحہ ١٥٦
٤ ـ " " " " صفحہ ١٥٦
٥ ـ " " " " صفحہ ٢٤٩
٦ ـ کلیات اکبر حصہ سوم صفحہ ٣٧

مختصر یہ کہ اکبر کے کلام کے غائر مطالعہ کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اس کے کلام میں ایک دور اندیش فنکار کا پختہ شعور ملتا ہے ۔ اس شعور سے اس نے نہایت چابکدستی سے فائدہ اٹھایا ہے ۔ اس کی گہری تہوں میں آپ کو شاعر کا خلوص پنہاں ملے گا ۔ اس خلوص کے ساتھ فن قدرت بیان کے بے پناہ عبور اور اختیار نے حسن بیان کو نکھار دیا ہے ۔

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

اکبر کو دل پر بجا طور پر ناز ہے ۔ جو باتیں اس کے دل پر گذری ہیں ان کو اس کے معجز بیان قلم نے اس خوبصورتی سے ادا کیا کہ اس پہ کشف و کرامات کا شبہ ہونے لگتا ہے ۔ اس نے اپنے مواد اور فن میں دلکش ہم آہنگی پیدا کر کے اور الفاظ کو معنی کا تابع بنا کر اچھوتے اور گوارا انداز میں نہایت کڑوی کڑوی باتیں بیان کی ہیں ۔ طرز بیان کی اس ندرت میں اس کی عظمت اور مقبولیت کا راز مضمر ہے ۔ اکبر اردو کا تنہا شاعر ہے جس نے ہماری سیاسی، تمدنی، اخلاقی زندگی کے احساسات کو شعر کے حسین پیکر میں پیش کیا ہے ۔

اقبال نے ذیل کے شعروں میں اکبر کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے ۔

سر ذروۂ طور معنی کلیمے به بت خانۂ دورِ حاضر خلیلے
گہے گریۂ او چو ابر بہارے گہے خندۂ او چو تیغ اصیلے [1]

---

۱ ۔ تنقیدی اشارے آل احمد سرور صفحہ ۳۱

* ڈاکٹر گیان چند

اردو ٹائپ میں تلفظ کا مسئلہ

یکم فروری ۱۹۶۲ ع کے ہماری زبان میں جناب احسن اللہ بی۔ اے کا مضمون شائع ہوا جس میں انہوں نے اردو کو رومن حروف میں لیکن اردو اعراب کے ساتھ لکھنے کا مشورہ دیا۔ جنوری ۱۹۶۲ ع کے نوائے ادب میں جنا بسید شہاب الدین دسنوی کا فاضلانہ مضمون « اردو ٹائپ میں تلفظ کا مسئلہ: ایک نئی تجویز »، شائع ہوا ہے جس میں موصوف نے لغات میں تلفظ کی وضاحت اور ٹائپ کی حد تک سفارش کی ہے کہ تمام حروف منقطع لکھے جائیں جن میں مصمتے (حرفِ صحیح) اردو کے اور مصوتے (حرفِ علت) بین الاقوامی صوتیاتی انجمن I. P. A کے ہوں۔ موخرالذکر رسم الخط رومن رسم الخط ہی پر مبنی ہے۔ میں دونوں تجاویز پر محوحیرت ہوں۔ اگر رومن حروف کا ایک جزو ٹائپ کے لئے موزوں تر سمجھا گیا ہے تو انہیں کلیتاً اختیار کیجئے ورنہ اپنے رسم الخط ہی کی اصلاح کیجئے کھچڑی رسم الخط خسرو کے انمل سے کم نہیں۔ جو قارئین رومن ہی نہیں بین الاقوامی صوتیاتی مصوتے شناخت کرنے پر قادر ہوں گے وہ رومن مصمتے بھی پڑھنے کے اہل ہوں گے ر e ڈ ـ ا i ن، ڈ i، ا ɔ ن قسم کی معجون مرکب نہ اردو ہے نہ رومن۔ یہ دونوں رسومِ خط کے ساتھ تشدد ہے۔

آج کل اردو رسم الخط کی اصلاح کے بارے میں مختلف مضامین نظر سے گزرتے رہتے ہیں۔ ان میں اکثر مروجہ رسم الخط ہی میں چند اصلاحیں یہاں اور چند ترمیمیں وہاں ہوا کرتی ہیں۔ ان مضامین کو پڑھ کر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اعراب میں کچھ اضافہ کرلیا جائے تو اردو رسم الخط ہمارے تمام الفاظ کا تلفظ بالکل صحت کے ساتھ ادا کرسکتا ہے لیکن وہ ٹائپ کے لئے اتنا مفید نہیں جتنا منقطع الحروف رسم الخط۔

اردو ہندی میں عام طور سے دس مصوتے فرض کئے جاتے تھے۔ راقم الحروف نے اپنے مفصل مضمون « اردو مصوّتوں کی صحیح تعداد » شائع شدہ نیا دور بابت ستمبر ۶۱ ع میں تین نئے مصوّتوں کی نشان دہی کی اور اس طرح اردو میں ۱۳ مصوّتے

* ڈاکٹر گیان چند ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی پروفیسر اردو حمیدیہ کالج بھوپال

قرار دئے۔ مجھے خوشی ہے کہ محترم دسنوی صاحب نے بھی اپنے طور پر ان تین مصوتوں کی طرف توجہ دلائی اور انھیں اِ (اوسط)۔ آ ے (اوسط)۔ اُ (اوسط) کا نام دیا۔ میری رائے میں ان تینوں کا نام بالترتیب خفیف اِے یا زیر معروف۔ خفیف اَے یا زبرِ امالہ دار، خفیف اُو یا پیش معروف ہوسکتا ہے۔ دسنوی صاحب نے نمبر ۱۴ پر جس آواز کا ذکر کیا ہے میں اس کو صحیح نہیں پڑھ سکا لیکن اگر یہ آواز [اَئے] ہے تو یہ مفرد مصوّتہ نہیں جڑواں مصوّتہ (Diphthong) ہے۔ اس کو اردو کے مصوّتوں میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔

صوتیاتی رسم الخط کے دو چارٹ مشہور ہیں I. P. A. اور امریکی چارٹ دسنوی صاحب کی بیشتر علامات کسی بھی چارٹ کے مطابق نہیں۔ میری رائے میں دس معروف مصوّتوں کو (I. P. A.) چارٹ کے مطابق لکھا جائے اور بقیہ تین نو دریافت مصوّتوں کو امریکی چارٹ کے مطابق کیونکہ (I. P. A.) میں ان کے لئے کوئی علامت نہیں۔ اس طرح اردو کے ۱۳ مصوّتوں کی شرح یہ ہوگی۔

نمبر شمار	اردو نام	اردو علامت	صوتیاتی علامت
۱	یائے معروف	اِی	i:
۲	زیرِ معروف	ـِـ	i
۳	یائے مجہول	اِے	e
۴	زیرِ مجہول	ے	E
۵	یائے لین	اَے	ɛ
٦	زبر امالہ دار	ے	æ
۷	زبر سادہ	ـَـ	ɔ
۸	الف ممدودہ	آ	a
۹	واو لین	اَو	ɔ
۱۰	پیش مجہول	ـُـ	∩
۱۱	واؤ مجہول	اُو	o
۱۲	پیش معرف	اُ	u
۱۳	واؤ معروف	اُو	u:

ان میں تین نو دریافت خفیف مصوّتوں کے لئے زبر. زیر اور پیش کے آخری حصے کو خفیف سا داہنے ہاتھ موڑ دیا گیا ہے.

دسنوی صاحب کی دو اور تجاویز سے مجھے اتفاق نہیں. آپ چاہتے ہیں کہ رکن تہجّی کو علیحدہ کرنے کے لئے (،) استعمال کیا جائے. صورت یہ ہے صوتیات میں رکن کی تعین ایسی ٹیڑھی کھیر ہے کہ بعض اوقات علما بھی شش و پنچ میں پڑجاتے ہیں. عام لکھنے پڑھنے والوں کے لئے اس کی شناخت ناممکن ہے چنانچہ خود دسنوی صاحب سے بھی دو مقامات پر سہو ہوا ہے مثلاً آپ نے کیا (استفہامیہ. ص۵۸ کالم ۲) اور براقی (ص ۶۰) دونوں میں ۲ رکن ظاہر کئے ہیں جب کہ واقعتاً کیا میں ایک رکن اور براقی میں تین رکن ہیں [۱]. در اصل صوتیاتی رکن اردو تلفظ کے لئے کسی مصرف کا ہے بھی نہیں. عام تصور میں «قلم» میں ایک اور «تبصرہ» میں دو رکن ہیں حالانکہ صوتی اعتبار سے اول الذکر دو اور مرخر الذکر تین ارکان پر مشتمل ہے. اس لئے رکن کی تقسیم سے چشم پوشی کرجانے ہی میں عافیت ہے.

دسنوی صاحب کی دوسری تجویز ہے کہ آدھی آواز کے آگے [:] لگایا جائے. مجھے ہزار عاجزی کے ساتھ اس سے بھی اختلاف ہے. صوتیات میں [:] نشان مصوّتے کو طویل اور مصمّتے کو مشدد دکھانے کے لئے استعمال ہوتا ہے لیکن اس سے قطع نظر جن آوازوں کو دسنوی صاحب نے نصف فرض کرلیا ہے وہ نصف ہیں ہی کہاں. کیا (سوالیہ)، پیار، سواگت، کی اصل یہ ہے کہ ان الفاظ کی ابتدا میں دو مصمّتے ہیں جن کے درمیان کوئی مصوّتہ نہیں اس کی وجہ سے یہ مصمّتے ملاکر ادا کئے جاتے ہیں. ان میں سے پہلا مصمّتہ ساکن ہے اور دوسرا متحرک. دسنوی صاحب کے مجوزہ قاعدوں کے مطابق ان الفاظ کا صحیح صوتیاتی املا یوں ہوگا.

کیا ـ ک ے a ; پیار ـ پ ے a ر ; سواگت ـ س و a گ ə ت

ان الفاظ میں پہلے مصمّتے کے بعد کسی مصوّتہ کا شائبہ نہیں.

۱ـ اس سے پہلے کا لفظ «براق» صحیح لکھا گیا ہے براقی میں حرف ر اور a کے بعد (ا) چھپنے سے رہ گیا تھا (ادارہ)

لیکن ہمارے تلفظ میں محض مصوّتوں ہی میں التباس کا اندیشہ نہیں اور بھی کئی مشابہ اصوات ہیں جن میں ہمارا رسم‌الخط امتیاز نہیں کرپاتا. ان پر غور کئے بغیر بحث تشنہ رہ جاتی ہے مثلاً ذیل کے الفاظ میں [ن] کی مختلف آوازیں ملاحظہ ہوں.

۱　گنوار ، پانچ
۲　ڈھنڈھورا ، گونڈا
۳　رنج ، رنگ
۴　رندا ، ڈنکا
۵　انقلاب ، تنکا ، کان پور

ان میں سے اگر ۳ اور ۴ کو بھی ہم ایک فرض کرلیں تب بھی ن کی غنائیت کے کم از کم چار درجے ظاہر ہوتے ہیں. اسی طرح انگریزی لفظ pen کے حرف علت کو صحت سے پیش کرنے پر اصرار ہے تو love, call, lord اور ہندی لفظ माधव, अवतार کے صحیح تلفظ پر بھی توجہ کیجئے. اعراب کی مدد سے مروجہ رسم خط میں تلفظ کی یہ تمام نزاکتیں کما حقہ واضح کی جاسکتی ہیں چنانچہ راقم‌الحروف کی اس نوع کی تجاویز ہماری زبان اور ماہ نو کراچی میں زیر اشاعت ہیں جو ان سطور کی اشاعت تک غالباً سامنے آچکی ہونگی لیکن ٹائپ کے سلسلے میں ان پر وہی اعتراض کیا جاسکتا ہے جو موجودہ رسم‌الخط پر ہے.

خالص اردو ہجا سے بھی ایسا منقطع الحروف رسم‌الخط تیار کیا جاسکتا ہے جو صوتیاتی بھی ہو اور اعراب کا استعمال کم سے کم کرے لیکن رسم‌الخط کے معاملے میں زمانہ کسی انقلابی ترمیم پر صاد نہیں کرسکتا اس لئے فی‌الوقت محض خفیف سی اصلاحوں ہی پر قناعت کرنی پڑتی ہے.

[« اردو ٹائپ اور تلفظ کا مسئلہ » کے عنوان پر « نوائے ادب » کے پچھلے شمارے میں فاضل مضمون نگار نے جو تجویز پیش کی تھی وہ محدود مقصد لئے ہوئے تھی. یہ بات عام طور سے تسلیم کی جاتی ہے کہ اردو میں تلفظ کی مروجہ علامتیں نا کافی ہیں اس لئے ان میں اضافہ ہونا چاہئے. کن کن حرکتوں کے لئے علامتیں مقرر ہونی چاہئیں اس پر بھی تقریباً اتفاق ہے. اس کے بعد بحث کا دائرہ صرف

دو نکتوں پر مشتمل رہ جاتا ہے. اولاً تو یہ کہ حرکتوں کی نشانیوں کی شکل کیا ہو، دوم یہ کہ یہ نشانیاں کس طرح لگائی جائیں یا کہاں رکھی جائیں جن سے تلفظ کی ادائگی میں آسانی ہو؟ دسنوی صاحب نے اپنی تجویز کو ٹائپ کی طباعت میں لغت نویسی اور لغت کے مضامین تک ہی محدود رکھا ہے. ان کی تجویز ایک ٹکنکل دقت کا حل پیش کرتی ہے اور اس میں مذکورہ بالا دونوں نکتوں کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے. جہاں تک علامتوں کی شکل کا تعلق ہے، ان میں مناسب ردّو بدل ممکن ہے. اصل مسئلہ ان کے مجوزہ اصولوں کا ہے.

گیان چند صاحب کا اعتراض کہ اردو رسم خط میں IPA کی علامتوں سے کھچڑی کا مزہ پیدا ہوگا، زیادہ وقیع نہیں، اولاً تو یہی محل نظر ہے کہ IPA کی علامتیں کس حد تک رومن رسم خط کے حروف مانی جا سکتی ہیں، دوسرے یہ کہ ہم اردو میں رومن حروف کا استعمال بڑی آزادی کے ساتھ علم کیمیا کی کتابوں میں کرتے رہے ہیں اور کسی نے اب تک اس کے خلاف نہ تو آواز اٹھائی ہے نہ نعم البدل تجویز کیا ہے. کیمسٹری کے symbol اور equations رومن حروف اور ہندسوں میں لکھے جاتے ہیں. جس طرح وہ طریقہ محدود مقصد کی خاطر استعمال کیا جاتا ہے اسی طرح دسنوی صاحب کی تجویز کا دائرہ بھی محدود ہے. عام طریقہ تحریر کے لئے نہ صرف لیتھو بلکہ ٹائپ میں بھی مروجہ اعراب ہی قائم رہینگے کیونکہ یہ کہیں کہیں صرف اشارے کے لئے استعمال ہوتے ہیں.

دسنوی صاحب نے لغت کا جو نمونہ اپنی تجویز کے مطابق شائع کرایا ہے اس میں کوئی خرابی نظر نہیں آتی ہے. عام طور سے انگریزی ڈکشنری میں ہر صفحے کی نچلی سطر میں مخصوص علامتیں نمونوں کے ساتھ درج ہوتی ہیں جو تلفظ کے لئے استعمال کی جاتی ہیں. اسی طرح اردو ڈکشنری میں بھی یہ التزام قائم رکھا جا سکتا ہے. اس طریقے سے ڈکشنری کی طباعت میں جو سہولتیں میسر ہونگی ان کا ذکر دسنوی صاحب اپنے مضمون میں کرچکے ہیں.

رکن تہجی کے بارے میں گیان چند صاحب کا مشورہ ایک طرح سے فراریت کی دعوت دیتا ہے. انگریزی سے زیادہ بے اصول شاید ہی کوئی اور زبان ہوگی نہ ہجا کا اصول برتا جاتا ہے نہ تلفظ کا، پھر بھی انگریزوں نے ساری

ولی کو معیاری بناکر صحیح طریقے سے اپنی زبان سیکھنے کا سامان مہیا
ہے. ہم بھی اپنے الفاظ کے رکن تہجی (syllable) کو چاہیں تو معیاری
تے ہیں اور اس کام میں خود گیان چند صاحب جیسے محققین کافی مدد
سکتے ہیں.

یہ سارا مسئلہ اہم ہے، ضرورت ہے کہ دوسرے ماہرین بھی اس طرف توجہ
. چونکہ یہ بحث اردو ترقی بورڈ کی محسوس کی ہوئی ایک دقت سے شروع
ے اس لئے ہم اس بورڈ کے ارکان سے بھی امید کرتے ہیں کہ وہ تجویز
تراض پر روشنی ڈالیں. ادارہ]

ہندوستانی سلکشن

نوائے ادب بابت اکتوبر سنہ ۱۹۶۱ ع میں مندرجہ بالا عنوان سے ایک
ن شائع ہوا تھا اس میں صفحہ ۳۷ پر ایک غلطی رہ گئی ہے. اس کی
جناب محمد خان صاحب نے توجہ دلائی ہے.

صفحہ ۳۷ میں ایک بیان یہ ہے کہ:

« جمع «ون» کی جگہ «ان» سے اور اکثر ایسی جمعیں مونث کی جگہ مذکر
ہیں.»

یہ بیان نا مکمل اور گمراہ کن ہے. اصل عبارت یہ ہونا چاہئے کہ بعض
«ون» یا «ین» کی جگہ «ان» سے بنائی گئی ہیں. اور اگرچہ واحد میں یہ
لفاظ مونث ہیں لیکن جمع بن جانے کے بعد ان کو مذکر کی طرح استعمال
یا ہے.

(ادارہ)

تبصرے

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں)

ابن ماجہ اور علم حدیث

از مولانا محمد عبدالرشید نعمانی،
ناشر: نور محمد مالک اصح المطابع، آرام باغ، کراچی،
کتابت، طباعت اور کاغذ عمدہ تقطیع کلاں، کل صفحات ۳۶۰
قیمت: مجلد مع گرد پوش آٹھ روپیے.

ابتدا میں دو صفحات پر اجمالی فہرست مضامین ہے، پھر چھ صفحات پر تفصیلی فہرست ہے، پھر صفحہ ایک سے ۲۴۸ تک اصل کتاب ہے، اس کے بعد صفحہ ۲۵۱ سے صفحہ ۳۵۳ تک اشاریہ ہے جس میں اسماء رجال، اسماء اماکن اسماء قبائل و جماعات اور اسماء کتب کی فہرستیں ہیں، آخر میں دو نقشے مشرق وسطی سے متعلق ہیں اور ایک نقشہ خاص رسول‌اللہ صلی‌اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کے زمانہ سنہ ۱ ہجری سے سنہ ۴۰ ہجری تک کے احوال و مقامات پر مشتمل ہے، اور تین صفحات میں غلط نامہ درج ہے.

احادیث کی کتابوں میں صحاح ستہ مشہور مجموعۂ احادیث ہے جسے مسلمانوں نے تیسری اور چوتھی صدی ہجری سے لیکر آج تک نہایت اہم شمار کیا ہے، اس مجموعہ میں ایک کتاب سنن ابن ماجہ رحمۃاللہ علیہ کے نام سے ہے یہ کتاب ان ہی امام ماجہ رح کے احوال میں ہے بلکہ کہنا چاہئے کہ تیسری صدی ہجری کے مسلمانوں کی محدثانہ سرگرمیوں کی نہایت معتبر و مستند اور مفصل تاریخ ہے. اس کتاب کے لئے یہ تعارف کافی ہے کہ:

«کہنے کو یہ امام ابن ماجہ رح کی سوانح عمری ہے، لیکن در حقیقت تدوین حدیث کی تفصیلی تاریخ ہے، اور مسلمانوں کی ان جانفشانیوں کا مرقع ہے جو انھوں نے محمد رسول‌اللہ صلی‌اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے ایک ایک حرف کو محفوظ کرنے کے لئے اٹھائی ہیں تا کہ امانت وحی کی ذمہ داری میں جو اس

امت کے سپرد کی گئی تھی، کسی قسم کا رخنہ نہ آنے پائیے، اور اللہ کی حجت تمام اہل ملل و ادیان پر تمام ہوجائے» مصنف بجا طور پر اپنی تلاش و جستجو میں کامیاب ہیں، اور اردو زبان میں علم حدیث اور تاریخ حدیث پر جو کچھ لکھا گیا ہے یا لکھا جارہا ہے یہ کتاب اس میں بیش بہا اضافہ ہے. چونکہ مصنف کے سامنے منکرین حدیث کا منظر اور پس منظر ہے اس لئے کتاب میں بغیر کسی تصریح کے ان کی ہفوات و مزعومات کا پردہ بھی چاک ہوگیا ہے. امام اعظم رح اور ان کے تلامذہ کی حدیث دانی پر مصنف نے جو ضمنی روشنی ڈالی ہے، وہ بھی اس کتاب کا قابل قدر حصہ ہے. فٹ نوٹ کی کثرت اگرچہ بظاہر ذوق پر گراں گزرتی ہے مگر مطالعہ کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کیسی کیسی نادر باتیں ہیں، ضرورت ہے کہ اس طرح کی خالص علمی اور دینی ٹھوس کتابیں لکھی جائیں تا کہ اوچھے ذہن و فکر کے لوگ دینی احکام و قوانین خصوصاً احادیث رسول کے بارے میں اپنی بے بضاعتی کے با وجود غلط راہ نہ پیدا کرسکیں، اللہ تعالی مصنف اور ناشر کو جزائے خیر دے وہ اس طرح کے کام کرکے اسلام کی خدمت کر رہے ہیں.

ملفوظات شاہ عبدالعزیز رح

مترجمین مولوی محمد علی لطفی اور مفتی انتظام اللہ شہابی،
ناشر: پاکستان ایجوکیشنل پبلشرز لمیٹیڈ، ۱۲ میری روڈ، کراچی ۳
کتابت و طباعت اور کاغذ متوسط تقطیع کلاں قیمت غیر مجلد سات روپے بارہ آنے.

یہ کتاب شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رح کے سوانح حیات، ملفوظات، کمالات اور تجربات پر مشتمل ہے، پیش لفظ ڈاکٹر سید معین الحق جنرل سکریٹری پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی نے لکھا ہے، انہوں نے لکھا ہے کہ:

« شاہ عبدالعزیز صاحب کے ملفوظات بھی اس طرح آپ کے ایک مرید نے جمع کئے، جو دہلی سے باہر کے رہنے والے تھے، افسوس کہ جامع کا نام نہ معلوم ہوسکا.... مولوی سراج الدین نے مولوی عظمت الہی بن مولوی محمد ہاشم سے ملفوظات کا اردو ترجمہ کراکے طبع و شائع کیا، اس میں ترجمہ کی بیشمار غلطیاں ہیں اور اکثر عبارتیں ترجمے سے چھوٹ گئی ہیں. مدت سے یہ کتاب نایاب

تھی » ص ۷ . کمالات عزیزی اور مجربات عزیزی کے بارے میں یہ نوٹ ہے :
« کمالات و مجربات کا متن دستیاب نہ ہوسکا، اس لئے سابق ترجمہ کے آخر میں جیسا موجود تھا بعینہ نقل کردیا گیا ہے ص» ۲۲۵. سابق ترجمہ کی غلطیوں اور عبارتوں کے چھوٹنے ہی پر بات موقوف نہیں بلکہ مترجمین نے یہ لکھا ہے کہ :
« بعض مقالات قابل توجہ ہیں، کہیں کہیں موضوع اور ضعیف روایات سے استدلال کیا گیا ہے، شاہ صاحب کی ممتاز شخصیت اور علمی حیثیت بالخصوص علم حدیث پر عبور اور مہارت کے پیش نظر یہ باور نہیں کیا جاسکتا کہ یہ شاہ صاحب کے ملفوظات کا جزو ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جامع ملفوظات نے مکمل احتیاط سے کام نہیں لیا، یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کسی قول کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکا، بہر حال ہم نے چند عبارتوں کو یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ کسی طرح بھی ملفوظات کا جزو نہیں ہوسکتیں ترجمہ کرنے میں حذف کردیا ہے » ص ۴.
کتاب کے مترجمین اور محققین کی ان عبارتوں کو دیکھ کر ہی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس کتاب کا معیار علم و تحقیق کی دنیا میں کیا ہوگا ؟ افسوس کہ مترجمین مصححین نے ترجمہ پر نظر ثانی کے باوجود کتاب کو تقریباً پرانی ہی زبان میں باقی رکھا ہے .

اس کتاب میں حقائق کے مقابلہ میں عجائب و غرائب زیادہ معلوم ہوتے ہیں، ضرورت ہے کہ سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی رح کی سوانح اور ان کے علوم و فنون پر کوئی صاحب ذمہ دارانہ کام کرکے، ایک اہم قرضہ کو ادا کردیں، افسوس کہ حضرت شاہ صاحب اپنے والد بزرگوار حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے بعد اس خاندان میں سب سے زیادہ صاحب تصانیف ہونے اور علم و فضل میں ان کی جامعیت و مرکزیت کے باوجود آج تک ان کی کوئی جامع سوانح عمری نہیں لکھی جاسکی، ان تمام باتوں کے باوجود اس کتاب میں اہل علم و اہل نظر کے لئے بہت سی باتیں کام کی ہیں .
(ق - ا - م)

تبسم

از ادیب مالیگانوی
ملنے کا پتا : قصر الادب ، مالے گاؤں ، ضلع ناسک
قیمت : پانچ رُپے .

« تبسم » ادیب مالیگانوی کی غزلوں کا مجموعہ ہے . ادیب کے کلام میں غزل کی تقریباً تمام پاکیزہ و شستہ روایات پائی جاتی ہیں . انھوں نے جذبات عشق و واردات قلبی کی اچھی عکاسی کی ہے . ان کے یہاں حسن کی نیرنگی ، عشق کی تڑپ اور عاشق کی نیاز مندی کے خوشگوار مرقع ملتے ہیں . ان کے کلام کی ایک نمایاں خصوصیت ان کی رجائیت ہے . ان کو آنسوؤں میں بھی تبسم نظر آتا ہے . اگرچہ ان کا کلام زبانوں کی غلطیوں سے پاک نہیں لیکن مجموعی حیثیت سے ان کا اسلوب بیان اچھا ہے . اس میں شگفتگی ہے ، متانت ہے ، نرمی ہے . ان کی متانت نے ان کے کلام کو وقار اور وزن بخشا ہے . ان کے نرم لہجہ نے اسے موثر بنا دیا ہے . مندرجۂ ذیل اشعار میں ان خصوصیات میں سے بعض کو دیکھا جاسکتا ہے :

رکھ کے سر تیرے آستانے پر　　عشق ہنستا رہا زمانے پر
اڑ گئے ہوش سامنے ان کے　　دور پہنچے قریب جانے پر
میں سناتا تو ہوں روداد محبت لیکن　　درمیاں میں جو تیرا نام نہ آنے پائے
ویرانیاں دیار محبت میں ہیں وہی　　تم غیرت بہار ہوئے بھی تو کیا ہوئے

مجھے تو چین نہیں ہے کشا کش غم سے　　وہ شے ہے کیا جو تمھیں بیقرار کرتی ہے
اب جو کچھ راز محبت کو سمجھتا ہوں ادیب　　لوگ کہتے ہیں کہ دیوانہ ہوا جاتا ہے

ادیب اگرچہ غزل کے شاعر ہیں اور ان کا کلام جیسا کہ اوپر کہا گیا بہ حیثیت مجموعی عشق کی نیرنگیوں اور کیفیتوں کی عکاسی تک محدود ہے . لیکن وہ صرف تصور جاناں ہی کئے ہوئے نہیں بیٹھے رہتے . وہ رفتار زمانہ اور حوادث

عالم پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ مگر انھوں نے اپنی شاعری کو پروپگنڈا نہیں بنایا۔ ان کے اس قسم کے اشعار میں بھی شعریت برقرار ہے۔ ان کے یہاں چیخ پکار اور نالہ و شیون نہیں، اضطراب ہے۔ اضطراب کے ساتھ ولولہ ہے، عمل کا پیغام ہے، انقلاب کی امید ہے۔ مثلاً مندرجۂ ذیل اشعار پڑھئے:

نشاط زیست سے معمور کوئی افسانہ ۔۔۔ یہ آنسوؤں سے بھری واردات ختم کرو
نظر کش ہیں جن کے پسینوں سے خرمن ۔۔۔ وہ کیوں تنگ ہوں دانے دانے کی خاطر
شور تو یہ ہے کہ تقدیر چمن جاگ اٹھی ۔۔۔ پھول کیوں شاخ پہ خنداں نہیں ہونے پاتے
ظلمت شب میں دیکھتا ہوں ادیب ۔۔۔ اہتمام اک نئے چراغاں کا

کتاب صوری حیثیت سے بھی اچھی ہے۔ کتابت نہایت عمدہ ہے۔ جلد بھی دلآویز ہے۔

(ع۔ ر۔ ق)

مقالـــه نمـا

مرتب :

حامد اللہ ندوی

معـاونین :

سید مجاہد حسین حسینی

عبد الستار دلوی

علاؤ الدین جینابڑے

فہرست عنوانات

۱	مذہبیات	۱
۲	تذکرہ و سیرت نگاری	۳
۳	تاریخ و سیاسیات	۴
۴	تنقید، ادب، لسانیات	۵
۵	متفرقات	۱۲

مذہبیات

۱ آر. اے نہرا
اسلام اور اجتماعی زندگی
(الفرقان لکھنؤ۔ جمادی الاول ۸۱ ھ ص ۶؍ـ۵۱)
ایک ہندو وکیل کے مقالے کا اردو ترجمہ ہے۔

۲ ابو الاعلیٰ مودودی
ایک اسلامی یونیورسٹی کا نقشہ
(ترجمان القران لاہور ۶۱ نومبر)

۳ ابوالاعلیٰ مودودی
سنت کی آئینی حیثیت ــ ایک اہم مراسلت
(ترجمان القران لاہور منصب رسالت نمبر ۶۱ ستمبر)
اس میں وہ مراسلت درج ہے جو ڈاکٹر عبدالودود اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے درمیان سنت کو اسلامی آئین کی بنیاد ماننے کے مسئلہ پر ہوئی تھی۔

۴ ابوالاعلیٰ مودودی
عدالت عالیہ مغربی پاکستان کا ایک اہم فیصلہ
(ترجمان القرآن لاہور منصب رسالت نمبر ۶۱ ستمبر)
اسلامی قانون کے بعض بنیادی مسائل پر جسٹس محمد شفیع کے دیے ہوئے فیصلہ کا ترجمہ اور اس پر مولانا مودودی کا تفصیلی تبصرہ۔

۵ امام الدین ابو محمد
نظریہ اوتار اور عقیدۂ رسالت
(زندگی رامپور ۶۱ نومبر دسمبر)
مذکورہ مضمون کی تیرھویں اور چودھویں قسط

۶ امین احسن اصلاحی
حروف مقطعات
(جامعہ ۶۱ نومبر۔ ص ۱۵ـ۱۹)
حروف مقطعات قرآنی پر مولانا حمید الدین فراہی کے نقاط نظر کی روشنی میں بحث کی گئی ہے۔

۷ امین عفیفی عبدالالہ
(معارف اعظم گڈھ ۶۱ نومبر)
اسلام اور دور جدید کے اقتصادی مذاہب

۸ رحمانی عبدالروف
جب اسلام کارفرما تھا
(تجلی دیوبند ۶۱ اکتوبر نومبر دسمبر)
اسوۂ رسول و صحابہ کا تجزیہ قسط ۲ ـ ۳

۹ رشید احمد سید
اسلام کا نظام زکوٰۃ
(فاران کراچی ۶۱ اکتوبر ۱۵ـ۲۸)

۱۰ سمپورنانند
مسلمان اور ہندوستانی پوروج
(الفرقان لکھنؤ جمادی الثانی ۱۸ ھ ص ۱۰ـ۵۲)
مولانا ابوالحسن ندوی کے مضمون کا جواب اور مدیر الفرقان کی طرف سے جواب الجواب ہے۔

۱۱ شاہ محمد جعفر
صوفیا اور تطہیر رقص
(ثقافت لاہور ۶۱ اکتوبر ۴۷-۵۵)
رقص کی تعریف اور اس کے تعمیری پہلوؤں کا تجزیر

۱۲ صدیقی عبدالحمید
نبوت کی ضرورت
(ترجمان القرآن لاہور ۶۱ دسمبر)

۱۳ ظفر احمد عثمانی
اسلام میں عورت کا عائلی مقام
(فاران کراچی ۶۱ نومبر ۵-۴۴)
ممتاز جہاں بیگم کی کتاب «عورت کا عائلی مقام» پر ایک تفصیلی بحث

۱۴ عامر عثمانی
پرویزیات
(تجلی دیوبند ۶۱ اکتوبر نومبر)
منکرین حدیث کے ان نگارشات کا تجزیہ جو اجتہاد کے نام سے مسلمانوں کے سامنے پیش کی جارہی ہیں.

۱۵ عبداللہ خان
نماز بوقت خطبہ پر محققانہ بحث
(برہان دہلی ۶۱ اکتوبر، نومبر، دسمبر)
مذکورہ مضمون کی چوتھی پانچویں اور چھٹی قسط

۱۶ عمری جلال الدین
رسول کی پہچان
(زندگی رامپور ۶۱ اکتوبر)
ان خصوصیات کی تفصیل جو ایک رسول کو عام آدمی سے الگ کرتی ہیں

۱۷ قمر عثمانی
اسلام کی اخلاقی تعلیمات
(فاران کراچی ۶۱ دسمبر ۱۷-۲۴)

۱۸ ندوی ابوالجلال
ہمارا قانون میراث
(نیا راہی کراچی. ۶۱ دسمبر ص ۱۲-۱۶)
قرآن مجید کی روشنی میں اسلامی تقسیم میراث کی تشریح کی گئی ہے.

۱۹ ندوی ابوالحسن علی
مسلمان اور ہندوستانی پوروج
(الفرقان لکھنؤ. جمادی الاولی ۸۱ ھ ص ۵-۱۳)
مسلمانوں کے ہندوستانی اسلاف کا پتہ لگایا گیا ہے.

۲۰ ندوی شاہ معین الدین
دین رحمت
(معارف اعظم گڈھ ۶۱ اکتوبر، نومبر، دسمبر)
اسلام کا تعارف دین رحمت کی حیثیت سے پہلی دوسری اور تیسری قسط

۲۱ ندوی محمد حنیف
غزالی اور آداب معاشرت
(ثقافت لاہور ۶۱ اکتوبر، نومبر)
غزالی کے بیان کردہ آداب معاشرت کی تفصیل دو قسطوں میں

۲۲ نعیم صدیقی
مطلق العنان اقتدار کے تحت محدود مذہبی مناصب
(ترجمان القرآن لاہور ۶۱ نومبر، دسمبر)

مذکورہ مضمون کی چوتھی اور پانچویں
قسط

۲۳ ہاشم امیر علی
قرآن مجید کے حروف مقطعات
(جامعہ . ٦١ نومبر ص ۳-۱۴)
خدا نے اپنے رسول کو انفرادی
طور پر جن طریقوں سے مخاطب کیا ہے
ان کی وضاحت کی ہے .

۲۴ یعقوب شاہ
مسئلہ سود
(ثقافت لاہور ٦١ دسمبر ۳۳-۴۲)

تذکرہ و سیرت نگاری

۲۵ خالدی ابونصر محمد
ہندوستان کے متعلق جاحظ کے
اجمالی معلومات کا تفصیلی مطالعہ
(برہان دہلی ٦١ اکتوبر ، نومبر دسمبر)
مذکوزہ مضمون کی چوتھی پانچویں اور
چھٹی قسط .

۲٦ دردانی معین الدین
حضرت نجم الدین کبری فردوسی
(معارف اعظم گڈھ ٦١ دسمبر)
حضرت فردوسی اور سلسلہ فردوسیہ
کا تعارف .

۲۷ سروری عبدالقادر
حافظ عبدالرحمان احسان
(آجکل ٦١ نومبر ۱۷-۲۴)
شاہ عالم ثانی کے عہد کے ممتاز استاد
حافظ عبدالرحمان احسان کا تعارف پیش
کیا ہے .

۲۸ ضیاء الحسن فاروقی
جمال الدین افغانی
(جامعہ دہلی ٦١ دسمبر ص ۵۹-٦۸)
انیسویں صدی کے ایک اسلامی مفکر
و عالم کا تذکرہ ہے .

۲۹ غلام مرتضی
حکیم سنائی کا سال وفات
(معارف اعظم گڈھ ٦١ اکتوبر)

۳۰ غوری شبیر احمد خان
شیخ بو علی سینا کی عبقریت
(معارف اعظم گڈھ ٦١ اکتوبر ، نومبر)
مذکورہ مضمون کی دوسری اور
تیسری قسط .

۳۱ مسعود احمد
شیخ احمد سرہندی - مسلسل
(الفرقان لکھنؤ ربیع الثانی ۸۱ ھ ص ۲۰-۴۱)
مجدد الف ثانی کے حالات زندگی
تاریخ کی روشنی میں پیش کئے ہیں .

۳۲ مسعود احمد
شیخ احمد سرہندی - مسلسل
(الفرقان لکھنؤ جمادی الاول ۸۱ ھ ص ۱۴-۲۱)
مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کے
حالات زندگی بیان کئے ہیں .

۳۳ مسعود احمد

شیخ مجدد کے اصلاحی کارنامے
مسلسل
(الفرقان لکھنؤ جمادی الثانی ۸۱ ھ ص ۲۵-۳۸)
مذہب و شریعت کے میدان میں شیخ مجدد الف سرہندی کے اصلاحات کا تذکرہ ہے۔

۳۴ مسعود احمد
شیخ مجدد کے اصلاحی کارنامے
(معارف اعظم گڈھ ۶۱ اکتوبر، نومبر، دسمبر)
مذکورہ مضمون کی پانچویں چھٹی اور ساتویں قسط۔

۳۵ مظہر امام
مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی
(صبح نو پٹنہ ۶۱ اکتوبر ص ۱۵-۱۹)
مشہور صحافی اور مصنف مولانا ملیح آبادی کی زندگی کا جائزہ ہے۔

۳۶ ملا واحدی
شاہ ولی اللہ صاحب رح
(فیض الاسلام راولپنڈی ۶۱ اکتوبر ۲۵-۳۱)
شاہ ولی اللہ کی مختصر سوانح عمری پیش کی ہے۔

۳۷ مہدی نواز جنگ
مہاراجہ کشن پرشاد
(صبح امید - گجرات نمبر ۲ ص ۷۷-۸۰)
حیدرآباد کے سابق مدارالمہام سر کشن پرشاد کے بارے میں تاثراتی ریڈیو تقریر ہے۔

تاریخ و سیاسیات

۳۸ بوہیرے عبدالحمید
گجرات کی سیر
(صبح امید بمبئی - گجرات نمبر ۲ ص ۹۹-۱۰۷)
مدیر صبح امید کا رپورتاژ ہے۔

۳۹ پشکر چندر واکر
کھمبایت میں مسلم عہد کی تعمیرات
(صبح امید - گجرات نمبر ۲ ص ۴۹-۶۴)
مسلمانوں کے فن تعمیر پر ایک مضمون کا ترجمہ ہے۔

۴۰ شفیع الرحمان
ہندوستان میں چینی سیاح
(جامعہ دہلی ۶۱ دسمبر ص ۷۳-۸۱)
چین کے کئی ایسے سیاحوں کا ذکر ہے جو ہندوستان آتے رہے۔

۴۱ شفیق عہدی پوری
مزدک اور مزدکیت
(ثقافت لاہور ۶۱ اکتوبر ۳۱-۳۷)
مزدک کی تعلیمات کا تعارف۔

۴۲ فارق خورشید احمد
حضرت عثمان کے سرکاری خطوط
(برہان دہلی ۶۱ نومبر)
مضمون کی تیسری قسط۔

۴۳ محبوب اللہ مجیب

گیارہویں اور بارہویں صدی میں ہندوستان کی تہذیبی اور سماجی حالت
(آجکل ۶۱ نومبر ۳۴_۳۷)

۴۴ مسلم ضیائی
اسباب سرکشی ہند (سر سید)
(اردو نامہ کراچی ۶۱ اکتوبر تا دسمبر ۲۶_۳۵)
سر سید کی تصنیف اسباب سرکشی ہند کا بصراحت تعارف پیش کیا ہے۔

۴۵ نیاز فتحپوری
حکومت اسلام کا محکمۂ برید
(نگار ۶۱ دسمبر ۱۸_۲۰)

تنقید، ادب، لسانیات

۴۶ احتشام حسین
ٹیگور کا اثر اردو ادب پر
(صبح نو پٹنہ ۶۱ اکتوبر ۱۲_۱۶)
رابندر ناتھ ٹیگور کے اردو ادب پر اثرات کیا ہوئے ـ ایک سنجیدہ تجزیہ ہے۔

۴۷ احرار عظیم آبادی
ادب فرائڈ اور مارکس
(شاعر ۶۱ اکتوبر ۱۲_۱۷)

۴۸ اختر حسن
تابع مہمل
(اردو نامہ کراچی ۶۱ اکتوبر تا دسمبر ۹۵_۱۰۰)
تابع مہمل الفاظ کی تشکیل اور ان کے استعمال کے نمونے پیش کئے ہیں۔

۴۹ اکبر الدین صدیقی
رسم الخط کا مسئلہ
(اردو نامہ کراچی ۶۱ اکتوبر تا دسمبر ۷۵_۷۷)
اردو ٹائپ سے متعلق تجویزیں پیش کی ہیں۔

۵۰ اکبر حسین قریشی
اقبال کی بعض نظموں کے مآخذ
(اردو نامہ کراچی ۶۱ جولائی تا ستمبر ۲۲_۲۸)
مغربی ادب کی بعض تخلیقات اقبال کی بعض نظموں کے مآخذ ہیں۔

۵۱ امجد نجمی
شاعری میں انا کا اظہار
(آج کل ۶۱ دسمبر ۱۰_۱۷)

۵۲ اُم حبیبہ
پرویز شاہدی رقص حیات کے آئینہ میں
(صبح نو پٹنہ ۶۱ نومبر ص ۱۲_۳۲)
پرویز شاہدی کے کلام پر تبصرہ ہے

۵۳ انتظار حسین
سرشار کی الف لیلہ
(ماہ نو ۶۱ نومبر ۶_۷)
سرشار کی الف لیلہ پر تبصرہ کیا ہے

۵۴ انجم اعظمی
نئی غزل
(ہندوستانی ادب حیدرآباد ۶۱ اکتوبر، نومبر)
نئی غزل کیا ہے اور اس کے عناصر ترکیب کیا ہیں اس کی تشریح

۵۵ انجم فاطمی

جگر ــــ ایک تأثر

(صبح نو پٹنہ ۶۱ اکتوبر ص ۲۰-۲۱)

جگر کی غزلوں کے چند پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے

۵۶ اولیا محمد ایوب

(مہر نیمروز کراچی ۶۱ دسمبر ۲۱-۳۴)

سودا بحیثیت غزل گو

۵۷ بیدار عابد رضا

حسرت

(برہان دہلی ۶۱ اکتوبر ، نومبر ، دسمبر)

حسرت پر سودا، اردوے معلی کی تفصیلات چوتھی پانچویں اور چھٹی قسط

۵۸ تحسین سروری

غالب کی ایک غیر مطبوعہ تحریر

(اردو نامہ ، کراچی ۶۱ جولائی تا ستمبر ۹-۱۲)

عبدالقادر سروری کے ذاتی کتب خانہ میں فن تاریخ گوئی سے متعلق ایک مخطوطہ ہے جس کے آخر میں غالب کی تحریر ہے مضمون نگار نے کتاب و تحریر دونوں کا تعارف کرایا ہے

۵۹ تمکین کاظمی

پرورش علی سخی

(صبح امید بمبئی ۶۱ نومبر ص ۲۳-۲۶)

الہ آباد کے رہنے والے ایک غیر معروف شاعر پرورش علی المتخلص بہ سخی کا تذکرہ ہے۔

۶۰ جاوید عقال

اردو کا ایک بنگالی ادیب

(شاعر بمبئی ۶۱ نومبر ۲۳-۲۶)

اردو کے ایک بنگالی ادیب راجہ جنم جئے متر ارمان کا تعارف

۶۱ جوش ملیح آبادی

لغوی تشریح اور قواعد

(اردو نامہ کراچی ۶۱ جولائی تا ستمبر ۵۲-۵۵)

امالہ کی لغوی تشریح کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اردو کے کون سے الفاظ امالہ قبول کرتے ہیں اور کون سے نہیں کرتے

۶۲ حنیف نقوی

منشی عبدالعزیز اعجاز

(آج کل ۶۱ دسمبر ۲۷-۳۲)

نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ کے عہد حکومت کے ایک شاعر عبدالعزیز اعجاز کا تعارف پیش کیا ہے

۶۳ خورشید عاصم

نیاز کے افسانے

(نگار ۶۱ نومبر ۶-۱۷)

۶۴ رخشاں ابدالی

عروج بہار

(مہر نیمروز کراچی ۶۱ دسمبر ۲۶-۳۰)

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کی ابتدا میں شائع ہونے والے بعض گلدستوں کا تعارف

۶۵ رشید حسن خان

قاموس الاغلاط پر ایک نظر

(اردو ادب ۶۱ ص ۹۱-۱۷۵)

۶۶ روش صدیقی
محروم وادئ غزل میں
(جامعہ دہلی ۶۱ دسمبر ص ۶۹-۷۱)
تلوک چند محروم کی غزل گوئی پر ایک نشریہ ہے

۶۷ رئیس مینائی
حضرت نفیس بنگلوری کے ادبی استفسارات
(نگار ۶۱ دسمبر ۱۴-۱۷)

۶۸ زور محی الدین
اردو کی علمی ترقی کا ایک باب
(اردو نامہ کراچی ۶۱ اکتوبر دسمبر ۴۳-۵۶)
اردو کی علمی ترقی سے متعلق ان خدمات کا سرسری جائزہ لیا ہے جو حیدرآباد میں کی گئیں

۶۹ سلام مچھلی شہری
نغمۂ ٹیگور
(جامعہ ۶۱ نومبر ص ۳۶-۴۱)
ٹیگور کی شاعری کے مختلف رخ پیش کئے ہیں

۷۰ سلیم خاں گمی
آزاد کشمیر کے پہاڑی لوک گیت
(ماہ نو ۶۱ نومبر ۳۸-۴۴)

۷۱ سیدہ جعفر
حسن نظامی کی انشائیہ نگاری
(آج کل ۶۱ دسمبر ۳۸-۴۴)
حسن نظامی کی انشائیہ نگاری پر اظہار خیال کیا ہے

۷۲ ش. اختر
آگ کا دریا اور قرۃ العین حیدر
(شاعر بمبئی ۶۱ اکتوبر ۸-۱۱)

۷۳ شاہد احمد
مولوی نذیر احمد دہلوی
(ہندوستانی ادب حیدرآباد ۶۱ اکتوبر نومبر)
نذیر احمد کے حالات زندگی ذاتی مشاہدات کی روشنی میں

۷۴ شاہد حمید الدین
حضرات امجد حیدرآبادی
(اردو نامہ کراچی ۶۱ جولائی تا ستمبر ۱۳-۲۱)
امجد نے اپنے کلام کو کبھی تصوف اخلاق اور انسانیت کے معیار سے گرنے نہیں دیا

۷۵ شفیع منصور
عربی رسم الخط کا تجزیہ
(اردو نامہ کراچی ۶۱ اکتوبر تا دسمبر ۳۶-۴۲)
صوت نگاری کی تصریح کرتے ہوئے صوتیات اور صوت نگاری کی روشنی میں عربی رسم الخط کا تجزیہ کیا ہے

۷۶ شفیق النساء بیگم
نظیر اکبر آبادی
(ادیب علی گڑھ ۶۱ اکتوبر، نومبر ص ۲۳-۳۰)
نظیر کی شخصیت اور شاعری پر تبصرہ ہے۔

۷۷ شکیل الرحمان
پریم چند کا ایک افسانہ
(سب رس حیدر آباد ۶۱ نومبر ۳-۶)

پریم چند کے ایک کردار « مس پدما »
کا نفسیاتی مطالعہ.

۷۸ شمس الرحمان فاروقی
غالب کی محرومیاں
(ادیب علی گڑھ ۶۱ اکتوبر، نومبر ص ۷-۱۱)
غالب کو مرکزی حیثیت دیتے ہوئے
ثابت کیا ہے کہ جملہ انسانوں کی طرح
وہ بھی اپنا مقصد تخلیق پورا کرنے سے
مجبور تھا.

۷۹ شمس بمن گرامی
شعر ، شعریت اور شاعر
(صبح نو پٹنہ ۶۱ نومبر ص ۱۷-۲۰)
شعر کی تعریف ، شعریت کی اہمیت
اور شاعر کی حیثیت کو اجاگر کیا گیا ہے .

۸۰ شوکت سبزواری
اردو کی ترقی کے مسائل
(اردو نامہ کراچی ۶۱ جولائی تا ستمبر ۲۹-۳۲)
اردو قواعد کی موجودہ ترتیب کو ناقص
بتاتے ہوئے علمی بنیاد پر نئی ترتیب کی
نشاندہی کی ہے .

۸۱ شہاب برنی
آغا حشر کے منظوم ڈرامے
(اردو ادب ، ۶۱ع ۹-۴۵)

۸۲ شہاب مہر محمد خان
اقبال اور اس کا عہد
(شاعر بمبئی ۶۱ اکتوبر ۱۸-۲۳)
جگن ناتھ آزاد کی کتاب اقبال اور
اس کا عہد پر تبصرہ.

۸۳ صابر شاہ آبادی
مقالات تلہری
(شاعر بمبئی ۶۱ نومبر ۹-۲۲)
اختر علی تلہری کے تیسرے مجموعہ
مقالات تلہری پر ایک تفصیلی تبصرہ .

۸۴ صدر الدین
جوہری کا بارہ ماسہ
(نوائے ادب بمبئی ۶۱ اکتوبر ۴۰-۵۶)
بارہویں صدی کے ایک بہاری صوفی
حضرت آئت اللہ جوہری کے بارہ ماسہ کا
تنقیدی جائزہ لیا ہے .

۸۵ صفدر آہ
امیر خسرو بحیثیت ہندی شاعر
(نوائے ادب بمبئی ۶۱ اکتوبر ۵-۲۴)
امیر خسرو کے ہندی کلام سے متعلق
تحقیقی مقالہ ہے .

۸۶ این. ال. کے. طالب
سرمایۂ کلام غالب
(نوائے ادب بمبئی ۶۱ اکتوبر ۲۵-۲۹)
مرزا غالب کی شاعری سے متعلق اہل
ادب کے متضاد نظریوں کا جائزہ لیا ہے .

۸۷ ظفر قریشی
اردو اور افغان
(ماہ نو ۶۱ دسمبر ۱۱-۱۸)

۸۸ عالم خوندمیری
حالی - ایک مناجات
(صبا ۶۱ نومبر ۳۲-۳۴)

۸۹ عبد الستار
املا و تلفظ
(اردو نامہ کراچی ۶۱ جولائی تا ستمبر ۲۳۔۴۵)
عربی کے بعض الفاظ ایسے ہیں جن کی اردو املا عربی سے مختلف ہے مضمون نگار کے خیال میں انہیں عربی کے اعتبار سے صحیح لکھنے کی کوشش کرنا چاہئے۔

۹۰ عصمت اللہ جاوید
ملک محمد جائسی کی پدماوت
(نگار ۶۱ دسمبر ۶۔۱۳)
ملک محمد جائسی کی پدماوت پر اظہار خیال کیا ہے۔

۹۱ عین الحق
وادی سندھ میں دراوڑی زبان کی باقیات
(اردو نامہ کراچی ۶۱ اکتوبر تا دسمبر ۷۔۲۵)
اس نظریے پر زور دیا ہے کہ شمالی ہند کی زبانیں براہ راست سنسکرت کے بجائے ان پراکرتوں سے نکلی ہیں جو سنسکرت سے متاثر تھیں۔

۹۲ غبار یاور
ابو العلا احمد المعری
(تعمیر انسانیت لاہور ۶۱ اکتوبر)
المعری کے افکار کا تجزیہ، دوسری قسط۔

۹۳ غبار یاور
غالب کا نظریۂ شاعری
(جام نو کراچی ۶۱ نومبر ص ۱۵۔۲۳)
مرزا غالب کے اشعار کی روشنی میں ان کے شعری نظریات کا ذکر ہے۔

۹۴ غلام حسین ذو الفقار
اکبر اور اردو غزل
(اردو نامہ کراچی ۶۱ اکتوبر تا دسمبر ۴۳۔۵۲)
اکبر نے غزل کی زبان میں وسعت پیدا کی اور اسے عصری میلانات سے ہم آہنگ کیا۔

۹۵ غلام ربانی
اردو ہندی ڈکشنری
(صبا ۶۱ نومبر ۵۷۔۶۱)
اردو ہندی ڈکشنری مرتبہ انجمن ترقی اردو ہند پر تبصرہ کیا ہے۔

۹۶ غلام رسول
اردو املاء کے مسائل کا حل
(اردو نامہ کراچی ۶۱ اکتوبر تا دسمبر ۶۴۔۷۵)
اردو املاء سے متعلق بعض مسائل کا حل پیش کیا ہے۔

۹۷ فاروقی محمد احسن
جدید ناول کا فن
(مہر نیمروز کراچی ۶۱ اکتوبر ۱۳۔۱۵)
جدید ناول کے فن سے متعلق ہنری جیمس کے نظریات کی تشریح۔

۹۸ فاروقی محمد احسن
ناول نگاری میں خواتین کا حصہ
(خاتون پاکستان کراچی ۶۱ اکتوبر، نومبر ۱۱۔۱۵)
ناول اور صنف نازک کے تعلق کو واضح کیا گیا ہے۔

۹۹ فرمان فتحپوری
غالب کا نفسیاتی مطالعہ
(نگار ۶۱ نومبر ۲۰-۲۶)

۱۰۰ فضیل جعفری
تلامذۂ میر
(شاعر بمبئی ۶۱ نومبر ۲۷-۳۲)
میر کے بارہ تلامذہ کا تعارف۔

۱۰۱ فکر تونسوی
کنہیا لال کپور
(ہندوستانی ادب حیدر آباد ۶۱ دسمبر)
کپور کا تعارف ذاتی مشاہدات کی روشنی میں۔

۱۰۲ فیض الرحمان اعظمی
جگر کی شاعری
(ادیب علی گڑھ ۶۱ اکتوبر نومبر ۱۲-۱۶)
جگر کی شاعری کے مختلف رخوں پر روشنی ڈالی ہے۔

۱۰۳ قاسم شبیر نقوی
ساحر نجمی اور ان کا فن
(صبح نو پٹنہ ۶۱ نومبر ۱۴-۱۶)
ابھرتے ہوئے ترقی پسند شاعر ساحر نجمی فتحپوری کی شاعری پر تبصرہ ہے۔

۱۰۴ قدوس صدیقی
آصف بنارسی
(جام نو کراچی ۶۱ نومبر ۳۱-۳۳)
علامہ عبد الرحمان آصف بنارسی کا تذکرہ ہے۔

۱۰۵ قریشی اکبر حسین
تلمیحات اقبال کا ایک جائزہ
(برہان دہلی ۶۱ دسمبر)

۱۰۶ کبیر احمد جائسی
ذکر عبدالسلام
(ادیب علی گڑھ ۶۱ دسمبر ۴-۵۲)
مولانا عبدالسلام ندوی کے سوانح و علمی کارناموں کا تفصیلی تذکرہ ہے

۱۰۷ گوہر حسین
فیاض علی خان فیاض اور ان کی شاعری
(مہر نیمروز کراچی ۶۱ اکتوبر ۲۹-۳۲)

۱۰۸ گیان چند
اردو کے جڑواں مصوتے
(آج کل ۶۱ نومبر ۶-۱۲)

۱۰۹ گیان چند
واسوختِ امانت
(نگار ۶۱ نومبر ۳۴-۴۰)
امانت کے واسوخت پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے

۱۱۰ ل. احمد اکبر آبادی
صناعت ادب
(اردو ادب ۶۱ ص ۲۶-۶۶)
لاسلی کرامبے کی کتاب «ادبی تنقید کے اصول» Principles of Literary Criticism کے پہلے باب کا ترجمہ

۱۱۱ ماہر القادری
نگار کا جگر نمبر
(فروغ اردو لکھنؤ ۶۱ دسمبر ۰-۵۹)
نگار جگر نمبر بابت جولائی ۶۱ پر

تفصیلی تبصرہ اور نیاز کے اعتراضات کے جوابات

۱۱۲ محمد احمد صدیقی
اقبال کا ساقی نامہ
(جام کراچی ۶۱ نومبر ۲۵-۳۰)
اقبال کے ساقی نامہ پر تبصرہ ہے

۱۱۳ محمد حسنین سید
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا
(مہر نیمروز کراچی ۶۱ دسمبر ۱۱-۲۵)
علی عباس حسینی نے کلیم الدین احمد اور مصنف گل نغمہ ڈاکٹر عظیم الدین احمد مرحوم پر اپنے ایک مضمون میں تنقید کی ہے۔ اس میں اسے تنقید کا جائزہ لیا گیا ہے

۱۱۴ محمد حسین
مختصر تاریخ حروف تہجی
(صبح امید بمبئی ۶۱ دسمبر ۱۵-۱۶)
عربی و فارسی حروف تہجی کی مختصر کی مختصر تاریخ ہے

۱۱۵ محمود علی خاں
جگر کی نظریاتی شاعری (مسلسل)
(جامعہ ۶۱ نومبر ص ۲۱-۳۵)
جگر کی شاعری کے دور سوم یعنی ۱۹۳۰ع سے ۴۰ع تک کا تذکرہ ہے

۱۱۶ مدنی ظہیر الدین
غالب کے گجراتی احباب و تلامذہ
(صبح امید بمبئی گجرات نمبر ۲ ص ۶۷-۷۵)
منشی میاں داد خاں سیاح، نواب غلام بابا خاں اور حکیم احمد حسن قنوجی وغیرہ کا تذکرہ ہے

۱۱۷ معتصم حکیم رشید احمد
جگر اور دیپ سائکالوجی
(برہان دہلی ۶۱ اکتوبر)

۱۱۸ مفتوں کوٹوی
مولانا ابوالکلام آزاد
(ادیب علی گڑھ ۶۱ اکتوبر نومبر ۱۷-۲۲)
غبار خاطر کے دھندلکوں میں ابوالکلام کی شخصیت کو تلاش کیا ہے

۱۱۹ میکش اکبر آبادی
فانی بدایونی
(اردو ادب ۶۱ ص ۶۷-۹۰)

۱۲۰ نادم سیتا پوری
کچھ آسودگان خواب کے بارے میں
(نگار ۶۱ نومبر ۲۷-۳۳)
میر ناسخ اور آتش کے مدفن سے متلق اظہار خیال کیا ہے

۱۲۱ نثار احمد فاروقی
تذکرۂ بہار بے خزاں
(اردو نامہ کراچی ۶۱ اکتوبر تا دسمبر ۵۵-۶۳)
غلام مینا ساحر کاکوروی کے تذکرۂ بہار بے خزاں کے ایک خطی نسخے کا تعارف کرایا ہے

۱۲۲ ندوی احتشام احمد
فن موازنہ (چوتھی قسط)
(ادیب علی گڑھ ۶۱ اکتوبر نومبر ۳۵-۴۰)

فن موازنہ کے ایک پہلو «شعری تصویریں» پر روشنی ڈالی ہے

۱۲۳ ندوی عبدالسلام

اردو شاعری اور فن تنقید

(معارف اعظم گڑھ ۶۱ اکتوبر نومبر دسمبر)

مذکورہ مضمون کی پانچویں چھٹی اور ساتویں قسط

۱۲۴ ندوی نجیب اشرف

ہندوستانی سلیکشن

(نوائے ادب بمبئی ۶۱ اکتوبر ۳۰-۳۹)

غلام حسین بحیلمی کی ایک کتاب ہندوستانی سلیکشن کا تعارف پیش کیا ہے

۱۲۵ نذیر محمد خان

شاہد صدیقی

(شاعر ۶۱ اکتوبر ۲۰-۳۰)

شاہد صدیقی کی شاعرانہ خصوصیات کا تجزیہ

۱۲۶ نسیم امروہوی

سچل کی اردو اور فارسی شاعری

(اردو نامہ کراچی ۶۱ جولائی تا ستمبر ۱-۸)

اٹھارویں صدی عیسوی کے ایک سندھی شاعر عبدالوہاب سچل کی اردو اور فارسی شاعری کا تعارف کرایا ہے

۱۲۷ نسیم علوی

مولوی عبدالحق اور تنقید

(فروغ اردو لکھنؤ ۶۱ دسمبر ۶۱-۶۵)

عبدالحق کی تنقید نگاری کا تجزیہ

۱۲۸ یوسف سرمست

جدید نفسیاتی ناول

(صبا ۶۱ نومبر ۳۵-۴۱)

متفرقات

۱۲۹ ڈار بشیر احمد

چینی تصوف

(ثقافت لاہور ۶۱ نومبر ۲۱-۵۴)

چینی تصوف کے آغاز اور اس کے نشو و نما کی تفصیلات

۱۳۰ محمود الحسن

جدید ترکی ادب میں معاشرتی موضوعات

(برہان دہلی ۶۱ دسمبر)

۱۳۱ یوسف مرزا

عربوں کے علم الہیئت پر ہندو جوتش کا اثر

(آج کل ۶۱ دسمبر ۴۰-۴۴)

ایڈیٹر : نجیب اشرف ندوی

پرنٹر پبلشر حامد اللہ ندوی نے ادبی پرنٹنگ پریس ، ۸ شیفرڈ روڈ ، بمبئی ۸ میں چھپوا کر انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی ۱ سے شائع کیا .

نوائے ادب بمبئی

جلد ۱۳ | جولائی ۱۹۶۲ ع | شمارہ ۳

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	شذرات	پروفیسر نجیب اشرف ندوی	۲
۲	تلامذۂ میرزا مظہر	عبد الرزاق قریشی	۵
۳	امثال و اقوال	ایم . اے . حفیظ	۱۹
۴	مولانا فضل حق خیرآبادی کا ایک غیر مطبوعہ خط	نثار احمد فاروقی	۴۰
۵	نسیم میسوری اور تذکرۂ ساقی	ڈاکٹر حبیب النساء بیگم	۴۷
۶	ریختہ ثناء گجراتی بزبان ہیکلی	سخاوت مرزا	۶۶
۷	ادبی نقوش (تبصرہ)	محمد شعیب اعظمی	۷۲
۸	تبصرے		۷۶
۹	مقالہ نما (ضمیمہ)	ڈاکٹر عالی جعفری و دیگر مرتبین	۱-۱۴

شذرات

گذشتہ شذرات میں ہم نے اس بات پر اظہار مسرت کیا تھا کہ ہماری یونیورسٹیوں کے اساتذہ و طلبہ نے اردو کی علمی و تعلیمی ترقی کی طرف نئے جوش و ولولہ کے ساتھ قدم اٹھایا ہے اور یہ اردو زبان و ادب کے لئے ایک نیک فال ہے۔ اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی وہ علمی، تحقیقی، ادبی اور تنقیدی رسالے ہیں جو متعدد جامعوں کی طرف سے نکلنا شروع ہوئے ہیں۔ ان میں مسلم یونیورسٹی کے ادارۂ علوم اسلامیہ کا ششماہی «مجلہ علوم اسلامیہ» ہے۔ اس وقت تک اس کے چار شمارے نکل چکے ہیں اور ان کے مطالعہ کے بعد بیقین کیساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ایسا رسالہ کسی بھی ادارہ کے لئے قابل فخر ہوسکتا ہے۔ اسی طرح جامعہ دہلی کا ششماہی رسالہ اردوے معلیٰ بھی اردو ادب سے متعلق مضامین شائع کرنے ہی میں ممتاز نہیں ہے بلکہ اس نے لسانیات نمبر شائع کرکے ہماری تحقیقی عمارت کے ایک بڑے اہم و وسیع گوشہ کو منور کرنے کی کوشش کی ہے، ادھر چند برسوں سے پونہ کا ادارۂ لسانیات ہند ملک کے مختلف علاقوں میں لسانیات کی تعلیم و مطالعہ سے متعلق سہولتیں مہیا کرکے اردو زبان کے اس شعبہ کے مخلص و پر جوش اصحاب کی توجہ بھی اس طرف منعطف کرارہا ہے، قریب کے چند برسوں میں لسانیات صوتیات وغیرہ سے متعلق جو کتابیں اور مضامین شائع ہوئے ہیں وہ بڑی حد تک اسی کے رہین منت ہیں، اردوے معلیٰ کے اس شمارہ میں اس موضوع پر مختلف زاویوں سے نظر ڈالی گئی ہے۔ اسی جامعہ کے لائق استاد ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے لسانیات ہی سے متعلق ایک کتاب انگریزی میں اردوے دہلی کی کرخنداری بولی (Kor Khandari Dialect of Delhi Urdu) کے نام سے لکھی ہے، اور یہ در اصل اردو کے دوسرے مرکزوں کے ارباب تحقیق کو دعوت ہے کہ وہ اس طرف متوجہ ہوں، ان کا رسالہ اردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو پر ایک وقیع اضافہ ہے۔

ڈاکٹر زور نے جو ہمارے یہاں اردو لسانیات سے متعلق کام کرنے والوں کی صف اوّل میں ہیں اس ذوق کو دکن سے لیجا کر کشمیر تک پہنچا دیا ہے اور وہاں بھی نہ صرف اردو بلکہ کشمیری زبان سے متعلق بھی یہ رجحان پیدا ہوگیا ہے، اس کا ثبوت وہاں کی اکیڈمی آف آرٹس، کلچر اینڈ لینگویجز (Acedami of Culture and Languages) کے اس وقیع رسالہ، شیرازہ سے ہوتا ہے جو حال میں اس اکیڈمی کی طرف سے شائع ہوا ہے. اسی جموں و کشمیر کی یونیورسٹی نے اپنے شعبہ اردو کی طرف سے نیا شعور شائع کرکے اپنے اساتذہ و طلبہ کو ٹھوس کام کرنے کی طرف متوجہ ہونے کا موقع پیدا کردیا ہے.

اس کے ساتھ مختلف کالج بھی اپنے ذریعوں اور حوصلوں کے مطابق اپنے ششماہی یا سالانہ رسالے شائع کرتے رہتے ہیں. بھوپال کے نوخیز سیفیہ ڈگری کالج کا نو نہال رسالہ مجلۂ سیفیہ جس کو اس کے نوجوان اساتذہ و طلبہ نے سلیقے سے مرتب کیا ہے ایک امید بخش اضافہ ہے. ضرورت یہ ہے کہ دوسری یونیورسٹیاں، کالج اور علمی ادارے بھی جنہوں نے اب تک اس طرف قدم نہیں بڑھایا ہے متوجہ ہوں، تاکہ ہماری زبان کی علمی و تعلیمی تعمیر میں وہ بھی صرف شریک ہی نہ ہوں بلکہ شریک غالب ہوں.

لیکن اس سارے علمی و ادبی چکاچوند میں ہم کو اردو کے عوامی و تعلیمی مسائل کی طرف سے بےخبر نہیں ہونا چاہئیے کیونکہ اردو کو ایک عام اور علمی زبان کی حیثیت سے مستقبل میں باقی رکھنے کی طرف اگر توجہ اور قوت منعطف نہیں کی گئی تو ملک کے مختلف گوشوں میں جو حالات پیدا ہورہے ہیں اس کی روشنی میں درد بھرے تیقن کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اردو اپنا موجودہ مقام بھی کھو بیٹھے گی اور اس ملک کی پالی، مگدھی، پراکتوں اور اپر بھنشاؤں کی طرح وہ بلند پایہ علمی تحقیقات کا موضوع تو بن جائیگی لیکن عوام کی زبان اور خیالات کی ترجمان نہیں رہے گی.

موجودہ اتر پردیش حکومت نے جس سے بہت سی توقعات قائم کرلی گئی تھیں، اس سلسلے میں جو رویہ اختیار کر رکھا ہے اور سہ لسانی نسخہ میں جو اجزا پیش کئے جارہے ہیں ان کا اثر مریض اردو پر یقیناً مہلک ثابت ہوگا. اس حکومت نے بڑی سنگدلی کے ساتھ یہ طے کرلیا ہے کہ ہندی کی مخالفت کے دیو کا جو

سیلاب بلا جنوب سے بڑھتا آتا ہے اسے اردو کی قربانی دیکر بچالیا جاسکتا ہے اور اس طرح ایک طرف اس دیوتا کی تسکین ہوجائیگی ، اور دوسری طرف نہایت آسانی اور خاموشی سے اردو خود اپنی موت مرجائے گی . یہ اس وقت ہورہا ہے جب کہ سارے ملک کو یکجہتی کی تعلیم دیجارہی ہے ، اس کے علاوہ جنوبی سیلاب کو روکنے کی کیا تدبیر اختیار کی جائیگی . پھر ایک گروہ وہ بھی ہے جو سنسکرت کو یہاں کی سرکاری اور تعلیمی زبان بنانا چاہتا ہے ، اس گروہ میں بڑے بڑے ارباب علم و اصحاب اثر شریک ہیں اس کا پتہ اس خطبۂ صدرات سے چل سکتا ہے جو حال ہی میں ہندوستانی زبانوں کے ادیبوں اور مصنفوں کی کانفرنس میں بمبئی کے بھارتیہ ودیابھون میں دیا گیا تھا .

اگر ہم کو اردو کو ایک زندۂ زبان کی حیثیت سے زندہ رکھنا ہے تو ہمکو اس اہم مسئلہ کی طرف متوجہ ہونا چاہئیے کہ کس طرح وہ ایک تعلیمی زبان کی حیثیت سے باقی رکھی جاسکتی ہے . ہر ریاست کے حالات مختلف ہیں ، اس لئے ضرورت ہے کہ کل ہند انجمن ترقی اردو جلد از جلد پورے عزم و قوت کیساتھ اس طرف ہمہ تن عملاً متوجہ ہوجائے ، ورنہ ڈر ہے کہ ہندوستان میں اردو کی کتابیں پڑھنے والے بھی نہیں رہ جائیں گے .

بابائے اردو کی موت نے انجمن ترقی اردو پاکستان کو جو حالت نزع میں تھی ایک نئی زندگی بخش دی ہے اور جو لوگ بابائے اردو کی علمی و عملی خدمات ، ایثار و قربانی اور ان کے اردو کے عشق اور اس کی اہمیت و تاثیر سے واقف تھے ایک مرتبہ پھر انھوں نے عملاً یہ ثبوت پیش کردیا ہے کہ وہ اس مینارۂ نور و ہدایت کو درخشاں سے درخشاں کریں گے کہ اردوستان کے سارے گوشے اس سے منور و روشن ہوجائیں . رسالۂ اردو اور قومی زبان کے متعدد شمارے نکل چکے ہیں ، کتابیں شائع ہو رہی ہیں اور منزل مقصود کی طرف پہنچنے کے لئے قدم بڑھائے جارہے ہیں ، اردو یونیورسٹی کا استقلال و استحکام بھی انجمن کا ایک اہم کام ہونا چاہئیے کہ اس طرح اردو کا خزانہ بہت زیادہ مالا مال کیا جاسکتا ہے .

* عبدالرزاق قریشی

تلامذۂ میرزا مظہرؒ

میرزا مظہرؒ ایک بلند مرتبہ صوفی اور نغز گو شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک دقیقہ رس، سخن سنج و نکتہ شناس استاد بھی تھے. اس زاویۂ نگاہ سے ان کی عظمت و رفعت کا اندازہ عشقی عظیم آبادی کے اس بیان سے لگایا جاسکتا ہے کہ میرزا رفیع سودا اور میر تقی میر جیسے با کمالوں نے ان سے استفادہ کیا اور شعر و سخن کے نکات سیکھے. خود عشقی کے الفاظ یہ ہیں:

«اکثری از سخنوران آن عہد مثل میرزا رفیع سودا و میر تقی میر باریاب صحبتش می گردیدند و دقائق فنون شعر و سخن بطریقِ استفادہ می پرسیدند.» [۱]

سراج الدین علی خان آرزو کے مرتبہ کے عالم اور رموز شعر و سخن اور زبان کے ماہر ہندوستان نے کم پیدا کئے. وہ میرزا مظہر کی سخن سنجی و نکتہ شناسی کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

«در دقت فہم و ذکای طبع یکتای لیل و نہار بلکہ بی مثل روزگار است. حدت طبع و جودت بمرتبہ دارد کہ بمصداق این مصرع است:
کہ سخن نگفتہ باشی بسخن رسیدہ باشد.» [۲]

آزاد بلگرامی کا شمار بھی ممتاز رجال ہند میں ہوتا ہے. ان کی علمیت و فضیات زبان دانی و نکتہ رسی مسلم ہے. وہ لکھتے ہیں کہ

---

* عبدالرزاق قریشی، رفیق انجمن اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، بمبئی ۱۔

۱　شیخ وجیہ الدین عشقی عظیم آبادی، تذکرۂ عشقی، قلمی، بوڈلین لائبریری (آکسفورڈ)

۲　خان آرزو، مجمع النفائس، قلمی اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنا

« میرزا جامع فقر و فضلیت و سخن گستری است و باقتضای اسم خود روح الروح معنی پروری. » [۱]

قائم چاند پوری کہتے ہیں کہ

« (میرزا مظہر) سر آمد ارباب تحقیق و پیش رو اہل تدقیق است. » [۲]

یہی وجہ ہے کہ بزم مظہر میں اگر ایک طرف روحانی تربیت کا سامان تھا تو دوسری طرف ذوق سخن کی بھی تربیت ہوتی رہتی تھی. اس بزم سے اگر قاضی ثنا اللہ پانی پتی، مولوی ثناء اللہ سنبھلی، شاہ غلام علی، مولوی غلام یحییٰ بہاری وغیرہ نے روحانی تربیت پاکر حقائق و عرفان کی روشنی پھیلائی تو انعام اللہ خاں یقین، خواجہ احسن اللہ بیان، محمد فقیہہ درد مند، ہیبت قلی خاں حسرت وغیرہ جیسے نغز گو شاعر بھی اٹھے اور اپنے سوز جگر سے دلوں کو گرمایا اور قلوب کو تڑپایا.

بھگوان داس ہندی میرزا صاحب کے ہم عصر تھے. ان کا بیان ہے کہ « شاگردان او بسیار بودند. » [۳] لیکن عام طور پر ان کے ان « شاگردان بسیار » کے حالات تو الگ رہے نام بھی تذکروں میں نہیں ملتے. متعدد تذکروں کی ورق گردانی کے بعد ہمیں مندرجۂ ذیل نام ملے ہیں:

۱ شرف الدین مضمون
۲ مصطفےٰ خاں یکرنگ
۳ انعام اللہ خاں یقین
۴ خواجہ احسن اللہ بیان
۵ محمد فقیہہ درد مند
۶ ہیبت قلی خاں حسرت
۷ محمد باقر حزیں
۸ شاہ قدرت اللہ قدرت
۹ غلام احمد منشی
۱۰ شاہ قلندر
۱۱ میر ناصر سامان
۱۲ سنگم لال عزت
۱۳ محمد خاں ظاہر
۱۴ کشن چند مجروح
۱۵ حمید بیگ اظہر
۱۶ بساون رائے بیدار
۱۷ منعم
۱۸ ملال

---

۱ میر غلام علی آزاد بلگرامی، سرو آزاد (لاہور ۱۹۱۳ ع) ص ۲۳۱
۲ قیام الدین قائم چاند پوری مخزن نکات (اورنگ آباد ۱۹۲۹ ع) ص ۳۴
۳ بھگوان داس، سفینۂ ہندی (پٹنا) ص ۱۸۸

ان شعرا میں بعض صاحب دیوان ہیں اور استادی کا درجہ رکھتے ہیں لیکن زیادہ تر ایسے ہیں جن کا صرف نام اور چند اشعار تذکروں میں محفوظ رہ گئے ہیں۔ ان میں ایسے بھی ہیں جن کی متاع سخن صرف دو چار شعر تک محدود ہے. اس مضمون میں ہم ان کا سرسری تذکرہ کریں گے لیکن جو صاحب دیوان ہیں ان کے حالات کسی قدر تفصیل سے لکھنے کی کوشش کریں گے. یہ سلسلہ بڑی حد تک شاگردوں کی زندگی کی تاریخی حیثیت سے مرتب ہوگا.

(۱)

شرف الدین مضمون

شیخ شرف الدین مضمون حضرت شیخ فرید الدین شکر گنج کی اولاد میں سے تھے. [۱] اپنے سلسلۂ نسب کی طرف خود انھوں نے اس شاعرانہ شوخی کے ساتھ اشارہ کیا ہے:

کریں کیوں نہ شکر لبوں کو مرید کہ دادا ہمارا ہے بابا فرید [۲]

لب شیریں سے دے مضمون کو میٹھا کہ ہے فرزند وہ گنج شکر کا [۳]

ان کا سال پیدائش کسی تذکرہ میں ہمارے نظر سے نہیں گذرا.

ان کی وطنیت سے متعلق مختلف تذکرہ نگاروں کے مندرجۂ ذیل بیانات ملتے ہیں:

میر تقی میر:

« متوطن جاجمؤ کہ قصبہ ایست متصل اکبر آباد. » [۴]

حمید اورنگ آبادی:

« متوطن احمد آباد. » [۵]

---

۱ میر تقی میر، نکات الشعراء طبع ثانی (اورنگ آباد ۱۹۳۵ ع) ص ۱۵

۲ ایضاً

۳ لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی، چمنستان شعرا (اورنگ آباد ۱۹۲۸ ع) ص ۲۵۳

۴ میر، نکات الشعرا ص ۱۵

۵ خواجہ خان حمید اورنگ آبادی، گلشن گفتار (حیدرآباد) ص ۱۹

قائم چاند پوری :

« مولدش جای است در نواح گوالیار که اورا جاجیومی گویند [۱]

میر حسن :

« متوطن جاجو که قصبه ایست متصل اکبر آباد . » [۲]

قدرت الله شوق :

« متوطن قصبه جاجیو متصل اکبر آباد . » [۳]

میرزا کاظم مبتلا لکھنوی . »

« وطنش ۰۰۰۰ [۴] از قصبات اکبر آباد . » [۵]

عشقی عظیم آبادی :

« متوطن جاجمؤ که قصبه ایست از مضافات اکبر آباد . » [۶]

امیر احمد :

« وطن اصلی وی جاجمؤ که قصبه ایست متصل اکبر آباد . » [۷]

قدرت اله قاسم :

« اصلش از نواح مستقر دارالخلافۂ اکبر آباد است . » [۸]

اکثر تذکروں میں مضمون کا وطن جاجمؤ بتایا گیا ہے . یہ در اصل کتابت کی غلطی ہے . جاجمؤ اکبرآباد میں نہیں بلکہ کان پور میں ہے . یو پی ڈسٹرکٹ گزیٹیر (ضلع کانپور) کے مرتب نے لکھا ہے کہ جاجمؤ گنگا ندی کے کنارے کان پور چھاؤنی سے مشرق جانب واقع ہے . اب اس جگہ کو بازید پور کہتے ہیں . لیکن عام زبانوں پر اب بھی جاجمؤ ہے . [۹] اکبرآباد میں جاجو نام کی بستی

---

۱ قائم مخزن نکات ص ۲۱

۲ میر حسن ، تذکرۂ شعرائے اردو (دہلی ۱۹۴۰ ع) ص ۱۴۶

۳ قدرت اله شوق ، سنبھلی طبقات الشعرا تلخیص (علی گڑھ) ص ۱۷

۴ لفظ پڑھا نہیں گیا .

۵ مبتلا لکھنوی ، گلشن سخن ، قلمی ، رضا لائبریری (رام پور)

۶ عشقی ، تذکرۂ عشقی ، قلمی

۷ ابوالحسن امیر احمد ، مسرت افزا بحوالۂ معاصر (پٹنا) نمبر ۸ ص ۱۹۷

۸ میر قدرت الله قاسم ، مجموعۂ نغز حصه دوم (لاہور ۱۹۳۳ ع) ص ۱۹۷

۹ ایچ ، آر ، نیول ، یو ، پی ڈسٹرکٹ گزیٹیر ، کان پور (الہ آباد ۱۹۰۹ع) ص ۲۹۹

ہے. گزیٹیر کا مرتب لکھتا ہے کہ جاجو اُتن گن ندی کے بائیں کنارے پر اس راستہ کے قریب جو آگرہ سے دھول پور کو جاتا ہے، واقع ہے. یہ ایک بہت پرانی ہندو بستی ہے. لیکن تاریخ میں اس کا نام پہلی بار ۱۷۰۷ع میں آتا ہے جب اعظم و معظم کی فوجیں یہاں صف‌آرا ہوئی تھیں. اس معرکہ میں اعظم مارا گیا اور معظم بہادر شاہ کے لقب سے ہندوستان کے تخت پر بیٹھا. اس نے اپنی اس فتح کی یادگار کے طور پر ایک بڑی سرائے بنوائی جو راستہ کے مغرب جانب ندی کے کنارے واقع ہے.[1]

مخزن نکات اور طبقات‌الشعرا میں بھی جاجیو غلط طبع ہوا ہے. میر حسن کے صاف بیان کے علاوہ کہ مضمون جاجو کے رہنے والے تھے تقریباً تمام تذکرہ نگار اس بات پر متفق ہیں کہ مضمون کا مولد یا وطن «متصل اکبرآباد» تھا اور اکبرآباد میں جاجو نام کا قریہ ہے نہ کہ جاجمؤ. اس لئے یہ قطعی ہے مضمون کا وطن جاجو تھا.

قائم نے «نواح گوالیار» لکھا ہے. اس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ اکبرآباد اور گوالیار میں زیادہ فاصلہ نہیں ہے اس لئے قائم نے بجائے اکبرآباد کے «نواح گوالیار» لکھ دیا ہوگا. دوسرے یہ کہ متعدد تذکرہ نگاروں کے بیان کے مقابلہ میں ایک قائم کے بیان کو ترجیح نہیں دی جاسکتی. اسی طرح صاحب گلشن گفتار کے بیان کے متعلق بھی یہی کہا جائے گا کہ بجائے اکبرآباد کے احمدآباد غلط چھپ گیا ہے. یہ غلطی اس قدر نمایاں ہے کہ اس کے متعلق کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں.

مضمون ابتدائے جوانی میں شاہ جہان‌آباد گئے.[2] میر حسن نے انہیں «نوکری پیشہ»[3] اور قدرت‌الله قاسم نے «سپاہی پیشہ»[4] لکھا ہے. قائم چاند پوری کہتے ہیں کہ جب ان کا سن چالیس سال سے متجاوز ہوگیا تو وہ علائق دنیا سے کنارہ کش ہوگئے اور زینت‌المساجد میں جو لب دریا واقع ہے اپنا مسکن بنایا

---

۱ نیول، یو، پی گزیٹیر، آگرہ (الہ‌آباد ۱۹۰۵ع) ص ۲۹۵ و ۲۹۶

۲ میر، نکات الشعرا ص ۱۵

۳ حسن، تذکرۂ شعرائے اردو ص ۱۴۶

۴ قائم مجموعۂ نغز، حصۂ دوم ص ۱۹۷

اور توکل کی زندگی گذارنے لگے. چوں کہ خوش مزاج و خوش صحبت تھے شہر کے اکثر شرفا شام کے وقت ان کے حلقۂ مجلس میں شریک ہوتے تھے. آخر وقت موعود آپہنچا اور وہ دنیا سے رخصت ہوگئے. [1] میر حسن، عشقی اور لطف کا بیان ہے کہ مضمون ابتدائے جوانی میں اکبرآباد سے شاہ جہاں‌آباد آئے اور زینت‌المساجد میں قیام کیا. چوں کہ قائم مضمون کے معاصر تھے اور دہلی میں رہ چکے تھے اس لئے ان کے بیان کو میر حسن، عشقی اور لطف کے بیان پر مقدم رکھنا ہوگا. اسی طرح صاحب مسرت‌افزا لکھتے ہیں کہ مضمون نے ایک مدت تک اکبرآباد میں زینت‌المساجد میں قیام کیا. اس بیان کی غلطی بھی اس قدر نمایاں ہے کہ اس پر کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں.

نزلہ کے سبب سے مضمون کے دانت گرگئے تھے اس لئے سراج‌الدین علی خاں آرزو از راہ مزاح انہیں «شاعر بے دانہ» کہا کرتے تھے. [2]

صاحب مسرت‌افزا لکھتے ہیں کہ کہا جاتا ہے کہ انتقال کے روز ان کے دوست احباب ان کے گرد جمع تھے اور ہر ایک کسی نہ کسی تقریب سے شدائد قیامت کا ذکر کررہا تھا. مضمون نے مندرجۂ ذیل شعر پڑھا اور علائق دنیا سے چھٹکارا پالیا.

شور محشر سیتی واعظ نہ ڈرا مضمون کو ہجر کے صدمے اٹھایا ہے قیامت کیا ہے [3]

ہمارا خیال ہے کہ مندرجہ بالا واقعہ محض زیب داستان کے لئے گھڑا گیا ہے. کسی کے حالت نزع کے وقت شدائد قیامت کا ذکر کرنا خلاف قیاس و تجربہ ہے.

گارسان دتاسی نے مضمون کا سال وفات ۱۱۵۸ھ / ۴۶-۱۷۴۵ع لکھا ہے. [4] اسپرنگر نے بھی اس کی تائید کی ہے. [5] اسپرنگر نے یہ بھی لکھا ہے کہ قائم مضمون سے زینت‌المساجد میں دو تین بار ملے تھے. [6] لیکن خود قائم کے تذکرہ میں اس قسم کا کوئی بیان نہیں ملتا.

---

۱ قائم، مخزن نکات ص ۲۱
۲ میر، نکات‌الشعرا ص ۱۵
۳ امیر احمد، مسرت افزا، بحوالۂ معاصر (پٹنا) نمبر ۸ ص ۱۹۷
۴ گارسان دتاسی، تاریخ ادبیات ہندوستانی (پیرس ۱۸۷۰ع) جلد دوم ص ۳۰۱
۵ طفیل احمد (مترجمہ) یادگار شعرا (الٰہ‌آباد ۱۹۴۳ع) ص ۱۸۹
۶ ایضاً

تقریباً تمام ہم عصر تذکرہ نگاروں نے مضمون کے حسن اخلاق اور خوش مزاجی کی تعریف کی ہے. مثلاً میر تقی میر لکھتے ہیں کہ

«حریف ظریف، بشاش بشاش، ہنگامہ گرم کن مجلسہا.» [1]

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں:

«فقیر زماں آخر اورا دریافتہ بودم. بسیار گرم اختلاط اگر چہ برودت پیری غلبہ داشت.» [2]

گردیزی کا بیان ہے کہ

«با وصف برودت پیری و فرط ضعف و ناتوانائی‌ها مردی بود بغایت گرم جوش و چسپاں اختلاط.» [3]

قائم چاند پوری ان کے صفات و حسنات کی ان الفاظ میں مدح کرتے ہیں:

«بہ جمیع صفات موصوف و ہمہ حسنات معروف بود.» [4]

پھر آگے چل کر تحریر کرتے ہیں کہ

«بسکہ ملاین و خوش صحبت بود اکثر مردم نجبا آخر روز بطریق سیر در حلقۂ مجلس وارد می شدند.» [5]

کہا جاتا ہے کہ ایک بار مضمون نے نواب عمدۃالملک سے اپنے کسی ملنے والے کی سفارش ملازمت کے لئے کی. نواب نے اسے ملازم رکھ لیا. انہوں نے سمجھا کہ اسے تنخواہ مل رہی ہے اور اس «نوکر کم زبان» نے سمجھا کہ میں نوکر ہوگیا ہوں. جب دس مہینے گذر گئے اور اسے تنخواہ نہ ملی تو اس نے صورت حال کا ذکر مضمون سے کیا. مضمون نے فی‌البدیہہ یہ شعر کہا اور نواب عمدۃالملک کی خدمت میں بھیجا:

عرض حال اپنی سے ہیں اہل شرافت بے نصیب
نہیں سخن رکھتے زباں کے بیچ گویا یہ نجیب

---

۱ میر، نکات‌الشعرا ص ۱۵
۲ ایضاً
۳ سید فتح علی حسینی گردیزی، تذکرۂ ریختہ گویاں (اورنگ‌آباد ۱۹۳۳ع) ص ۱۳۵
۴ قائم، مخزن نکات ص ۲۱
۵ ایضاً

نواب قدر شناس نے اس شخص کی تنخواہ پوری مدت ملازمت کی اسی وقت دلا دی۔[۱]

مضمون کے مزاج میں قناعت تھی۔ اوپر ہم قائم کا بیان پڑھ آئے ہیں کہ مضمون نے ترک دنیا کرکے زینت المساجد میں اپنا مسکن بنایا اور توکل کی زندگی بسر کرنے لگے۔ حمید اورنگ آبادی انھیں «شاعر متوکل» کہتے ہیں۔[۲] خود انھوں نے بھی اپنی اس افتاد طبع کی طرف اشارہ کیا ہے:

یک قرص ناں کی خاطر کیوں تو پھرے ہے بھٹکا

میر تقی میر مضمون کو سراج الدین علی خان آرزو کا شاگرد بتاتے ہیں۔ خود ان کے الفاظ یہ ہیں:

«شاگرد خان صاحب آرزو۔»[۳]

لیکن گردیزی کا بیان ہے کہ

«مشق سخن از میرزا مظہر و خان آرزو کردہ۔»[۴]

میر صاحب کے بیان کی تائید میر حسن، شوق اور عشقی کرتے ہیں اور گردیزی کی تائید میں شفیق، شورش اور ابو الحسن امیر احمد ہیں۔

گردیزی کا تذکرہ نکات الشعرا کے بعد ترتیب پاتا ہے اور جیسا کہ مولوی عبد الحق نے اس کے مقدمہ میں لکھا ہے نکات الشعرا گردیزی کی نظر سے گذر چکا تھا۔[۵] اور «دیباچہ میں جو اس نے تذکرہ نویسوں کے خلاف زہر اگلا ہے اس کا ہدف نکات الشعرا ہے۔»[۶] اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ گردیزی نے میرصاحب کے بیان کو درست تسلیم نہیں کیا اور صحیح بات اپنے تذکرہ میں درج کردی۔ گویا گردیزی کے بیان کو میر کے بیان کی تصحیح کہنا چاہئے۔ شاید اسی لئے شفیق نے گردیزی کے بیان کو ترجیح دی۔ اس کے سامنے نکات الشعرا

---

۱ حسن، تذکرۂ شعرائے اردو ص ۱۴۶
۲ حمید گلشن گفتار ص ۱۹
۳ میر، نکات الشعرا ص ۱۵
۴ گردیزی، تذکرۂ ریختہ گویان ص ۱۳۴
۵ گردیزی، تذکرۂ ریختہ گویان (مقدمہ) ص ۱۱ و ۱۳
۶ ایضاً ص ۱۱

اور تذکرۂ ریختہ گویاں دونوں تھے۔ گردیزی کا بیان یوں بھی زیادہ قابل قبول ہے کہ وہ اور مضمون ہم مشرب تھے اس لئے میر کے مقابلہ میں ان کے تعلقات زیادہ گہرے رہے ہوں گے۔ بہرحال جب تک اس کی تردید کسی معاصر ذریعہ سے نہ ہوجائے ہم مضمون کو تلامذۂ میرزا مظہر میں شمار کریں گے۔

مختلف تذکرہ نویسوں کے بیانات سے پتا چلتا ہے کہ مضمون کو ذوق شعر گوئی ضرور تھا لیکن وہ بہت کم کہتے تھے۔ مثلاً میر تقی میر لکھتے ہیں کہ

«کم گو بود۔» [1]

شفیق کہتے ہیں:

«گاہی بتفنن گوہر سخن بسلک نظم می سفت۔» [2]

اپنی کم گوئی کی طرف خود مضمون نے بھی اشارہ کیا ہے:

درد دل سے جس طرح بیمار اٹھتا ہے کراہ
اس طرح ایک شعر مضموں بھی کہے ہے گاہ گاہ [3]

یہی وجہ ہے کہ بقول میر ان کا دیوان صرف دو سو اشعار پر مشتمل تھا۔ [4] شفیق نے تین سو اشعار کا مجموعہ بتایا ہے۔ [5] لیکن تین سو اشعار کا مجموعہ بھی مختصر ہی کہلائے گا۔ افسوس کہ یہ مختصر مجموعہ بھی نایاب ہے۔

مضمون ان شعرا میں سے ہیں جنھوں نے صنعت ایہام کو اردو شاعری میں رواج دینے میں پہل اور کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ حمید اورنگ آبادی انہیں «موجد ایہام ریختہ» کہتے ہیں۔» [6] مصحفی نے اس بات کو ذرا کھل کر کہا ہے۔ حاتم کے ذکر میں وہ لکھتے ہیں کہ

«روزی پیش فقیر نقل می کرد کہ در سن دویم فردوس آرام گاہ دیوان ولی در شاہ جہان آباد آمدہ و اشعارش بر زبان خورد و بزرگ جاری گشتہ

---

۱ میر، نکات الشعرا ص ۱۵
۲ شفیق، چمنستان شعرا ص ۲۵۴
۳ ایضاً
۴ میر، نکات الشعرا ص ۱۵
۵ شفیق، چمنستان شعرا ص ۲۵۴
۶ گلشن گفتار ص ۱۹

ما دو سہ کس کہ مراد از ناجی و مضمون و آبرو باشد بنای شعر ہندی را بہ ایہام گوئی نہادہ داد معنی یابی و تلاش مضمون تازہ می دادیم۔» [۱]

خود مضمون نے بھی اپنی اس کوشش پر فخر کا اظہار کیا ہے:

ہوا جگ میں ترا مضمون شہرہ طرح ایہام کی جب سیں نکالی

لیکن مضمون کا جو کلام مختلف تذکروں میں پایا جاتا ہے اس سے اندازہ ہوتا کہ وہ محض ایہام گو نہ تھے۔ ان کا کلام شستہ و لطیف اشعار سے خالی نہیں۔ ان کا دیوان میر کی نظر سے گذرا تھا۔ وہ صنعت ایہام کو نا پسند کرتے تھے اور اسی لئے انھوں نے حاتم، ناجی وغیرہ کی، جو صنعت ایہام کے علم بردار تھے، مذمت کی ہے۔ مثلاً ناجی کے متعلق وہ لکھتے ہیں:

«مزاجش بیشتر مائل بہ ہزل بود۔» [۲]

مگر مضمون کے متعلق ان کی یہ رائے ہے:

«کم گو بود لیکن بسیار خوش فکر و تلاش لفظ تازہ زیاد۔» [۳]

شفیق کی نظر سے بھی ان کا دیوان گذرا تھا۔ وہ اس کے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ

«شاعریست زود رس و سخن پروریست معنی رس۔ مضمون شیرینش شرف برنبات می دارد و کلام شکرینش مذاق جان را لذت خاص می بخشد۔» [۴]

اگرچہ گردیزی نے اپنے تذکرہ میں اظہار نہیں کیا لیکن بہت ممکن ہے کہ ان کی نظر سے بھی مضمون کا دیوان گذرا ہو۔ بہر حال ان کی رائے مضمون کے متعلق یہ ہے:

«از شعرای قرارداده ریختہ۔» [۵]

اگر مضمون صرف ایہام گو ہوتے تو گردیزی ان کے لئے یہ الفاظ استعمال نہ کرتے۔ پھر وہ آگے چل کر لکھتے ہیں:

---

۱ شیخ غلام ہمدانی مصحفی، تذکرۂ ہندی (دہلی ۱۹۳۳ ع) ص ۸۰

۲ میر، نکات الشعرا ص ۱۵

۳ ایضاً

۴ شفیق، چمنستان شعرا ص ۲۰۳ و ۲۵۴

۵ گردیزی، تذکرۂ ریختہ گویان ص ۱۳۴

«شعرش خالی از نزاکت نیست.» [1]

قائم چاند پوری نے ان کی شاعری کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:

شعر ریختہ را بتلاش الفاظ و معنی تازہ می گفت.» [2]

میر حسن نے ان کے متعلق یہ رائے دی ہے.»

«ہر چند کم گو بود لیکن خوش گو» [3]

میر حسن کی یہ رائے حقیقت میں میر تقی میر کی صدائے بازگشت ہے.

قدرت اللہ قاسم کہتے ہیں کہ

«در جرگہ اساتذۂ [4] آن وقت محسوب و شعرش دلخواہ مردم آن عہد مرغوب است.» [5]

یہاں سودا کا ایک شعر نقل کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے. اس سے مضمون کے متعلق ان کے تأثرات کا بھی اظہار ہوتا ہے اور مضمون کے کمال شاعری کا اعتراف بھی.

بنائیں اٹھ گئیں یارو غزل کے خوب کہنے کی
گیا مضمون دنیا سے، رہا سودا سو دیوانہ

خود مضمون کو بھی اپنی استادی کا احساس تھا. فرماتے ہیں:

نہیں چلا افسوں کسی کا جن اُپر ریختہ اس کو ہوا جادو میرا

کہاں صائب جو کرتا تھا وہ تب ریز سنے آہنگ کے طوطی کی اب ریز

مندرجہ بالا تذکرہ نگاروں نے مضمون کے کلام سے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس میں کسی قدر مبالغہ ہے. صنعت ایہام کے استعمال کی وجہ سے ان کا کلام ایسے اشعار سے خالی نہیں جو متانت و تہذیب سے گرے ہوئے ہیں. لیکن ایسے اشعار کی تعداد یقیناً کم ہے. مجموعی حیثیت سے ان کا کلام اچھا ہے. ذیل میں

---

۱ گردیزی تذکرۂ ریختہ گویاں ص ۱۳۵

۲ قائم مخزن نکات ص ۲۱

۳ حسن، تذکرۂ شعرائے اردو ص ۱۴۶

۴ بعض تذکروں میں مضمون کے شاگردوں کے نام ملتے ہیں، مثلاً مجموعۂ نغز میں میر افضل علی دانا (حصہ اول ص ۲۳۹)، گلشن ہند میں عارف اکبرآبادی (ص ۱۶۷)، تذکرۂ شورش میں سید حاتم علی حاتم (ص ۲۳۷) اور داؤد بیگ داؤد دہلوی (ص ۲۷۹) وغیرہ کے نام ملتے ہیں.

۵ قاسم، مجموعۂ نغز، حصۂ دوم ص ۱۹۷

ہم ان کے چند اشعار نقل کرتے ہیں جن میں انہوں نے صنعت ایہام برتی ہے ۔ یہ اشعار صرف یہی نہیں کہ تہذیب و متانت کا دامن سنبھالے ہوئے ہیں بلکہ لطافت خیال و شگفتگئی بیان سے بھی خالی نہیں ۔

کرے ہے دار بھی کامل کو سرتاج ہوا منصور سے نکتہ یہ حل آج

گر حرف حق زبان سے ہماری کبھو سنے احوال اپنا دیکھ کے حلاج سر دھنے

چلا کشتی میں آگے سے جو وہ محبوب جاتا ہے
کبھی آنکھیں بھر آتی ہیں کبھی جی ڈوب جاتا ہے

کیا ہوا جو خط میرا پڑھتا نہیں جانتا ہے خوب وہ مضمون کو

مرا دل تھا ترے گلشن کا مالی محبت اس سیتی تو کیوں نہ ڈالی

شرم سیں پانی ہوجاویں سب رقیب گر مرا یوسف ملے آ چاہ سیں

کرو یا مت کرو اب باغباں گلزار کا در وا
پھنسے ہم دام میں صیاد کے رکھتے نہیں پروا

اس دہاں بیچ سخن رکھتا ہوں جب کہ اس بات کو اثبات کرو

جب سے چاہا ہے ترا چاہ ذقن آب چشموں سے مرے جاری ہے

ترا مکھ ہے سر چشمۂ آفتاب نہ لاوے ترے حسن کی ماہ تاب

مضمون ، جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں ، ترک دنیا کرکے تصوف و درویشی کی طرف مائل ہوگئے تھے ۔ اس لئے ان کے کلام میں کیفیات عشق اور واردات قلبی کی اچھی عکاسی پائی جاتی ہے ۔ مندرجہ بالا اشعار میں سے اکثر میں یہ

خصوصیت پائی جاتی ہے۔ ان کا اسلوب بیان بھی ان کے عہد کی روش کے مطابق صاف اور سلجھا ہوا ہے۔ واردات قلبی کی عکاسی اور اسلوب بیان کی عمدگی نے ان کے کلام میں درد و تاثیر پیدا کردی ہے۔ دتاسی نے لکھا ہے کہ ان کے کلام میں استعارات کی بہتات ہے۔[1] لیکن جو اشعار ہمارے سامنے ہیں وہ دتاسی کی اس رائے کی تصدیق نہیں کرتے۔ ذیل میں ہم مضمون کے چند اور اشعار نقل کرتے ہیں جو مندرجہ بالا خصوصیات کے حامل ہیں۔

جو دو پیالہ سحر کو بھر کے اور دو شام کو لے گا
وہ تحت اپنے میں جوں خورشید چاروں جام کو لے گا

تجھے خورشید رو کرتے ہیں سجدہ اگر ثانی ہے یوسف کا تو توں ہے

کیا سمجھ باندھا ہے بلبل نے چمن میں آشیاں
ایک تو گل بے وفا ہے تس پہ جور باغباں

میرا پیغام وصل اے قاصد کہو، سب سے اسے جدا کر کر

بلبلو شور چمن میں نہ کرو کون سنتا ہے تمہاری فریاد

کرنا تھا نقش روی زمیں پر ہمیں مراد قالی نہیں تو نہیں بوریا تو ہے

سجن یہ خوبرو تجھ سے چراویں کیوں نہ پھر آنکھیں
جو کوئی خورشید کو دیکھے سو ہو محجوب جاتا ہے
کہو کیوں کر زلیخا کی نہ ہو آنکھوں کا گھر روشن
جہاں یوسف سا نور دیدۂ یعقوب جاتا ہے
میرا یہ اشک قاصد کی طرح ایک دم نہیں تھمتا
کسی بیتاب کا گویا لئے مکتوب جاتا ہے

---

۱ دتاسی، تاریخ ادبیات ہندستانی، جلد دوم ص ۳۰۱

ہم نے کیا کیا نہ ترے غم میں اے محبوب کیا
صبر ایوب کیا، گریۂ یعقوب کیا [۱]

اس عہد کے دوسرے شعرا کی طرح مضمون کے یہاں بھی اس دور کی لسانی خصوصیات موجود ہیں۔ کدھی، سیتی، سوں، کبھو، آگو وغیرہ ان کے یہاں استعمال ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ مخصوص دکنی انداز بھی ان کے یہاں پایا جاتا ہے۔ مثلاً

مگر ان طفل نے اب سدھ سنبھال کیا ہے یاد مجکوں بعد مدت
سجن جب سے تم لال جیرا سجا بہت گلرخاں کا ہوا رنگ زرد

بعض ساکن الفاظ کو متحرک استعمال کیا ہے۔ مثلاً

دراز اس زلف کی ہوئے عمر یارب کدھی ہووے نہ اس کا بال بیکا

مولانا محمد حسین آزاد نے اس شعر سے متعلق آب حیات میں مندرجہ ذیل دلچسپ لطیفہ لکھا ہے:

"استاد مرحوم نے ایک دن فرمایا کہ شیخ مضمون کے زمانہ میں کوئی امیر باہر سے محل میں آئے اور پلنگ پر لیٹ گئے۔ ایک بڑھیا ماما نئی نوکر ہوئی تھی۔ وہ حقہ بھر کر لائی اور سامنے رکھا۔ نواب صاحب کی زبان پر اس وقت مضمون کا یہ شعر تھا:

ہم نے کیا کیا نہ ترے عشق میں محبوب کیا صبر ایوب کیا، گریۂ یعقوب کیا

ماما سن کر بولی، الٰہی تیری امان! اس گھر میں تو آپ ہی پیغمبری وقت پڑرہا ہے۔ بیچارے نوکروں پر کیا گذرےگی۔ چلو بابا یہاں سے۔" (مولانا محمد حسین آزاد، "آب حیات" طبع ہفتم [لاہور ۱۹۰۷ع] ص ۹۶)۔

حاشیہ میں مولانا لکھتے ہیں

"دلی میں غریب، مفلس، فقیر کسی سے سوال کیا کرتے تھے تو کہا کرتے تھے کہ عیالدار ہیں، مفلس ہیں، ہم پر پیغمبری وقت پڑا ہے۔ اللہ کچھ دو۔ اصل اس کی یہ تھی کہ جس پر سخت مصیبت پڑتی ہے وہ زیادہ خدا کا پیارا ہوتا ہے اور چوں کہ پیغمبر سب سے زیادہ خدا کے پیارے ہیں اس لئے ان پر زیادہ مصیبتیں پڑتی ہیں، جو مصیبتیں پیغمبروں پر پڑی ہیں وہ دوسروں پر نہیں پڑیں۔ رفتہ رفتہ پیغمبری وقت اور پیغمبری مصیبت کے معنی سخت مصیبت کے ہوگئے۔" (آب حیات ص ۹۷ حاشیہ)

* ایم . اے . حفیظ

امثال و اقوال

امثال ، قصے ، کہانیاں اور اقوال انسانی طبع کی مرغوب چیزیں ہیں . دنیائے ادب میں اول مقام ان اصناف سخن کو حاصل ہے جن میں بہادری کے قصے ، عشق و عاشقی کی حکایتیں ، انمول کارناموں کی داستانیں ، مشرقیوں میں بہت مقبول ہوئیں . ان کہانیوں میں اشخاص کے ذاتی کردار سے زیادہ عجیب و غریب واقعات کی آمیزش ہوتی تھی اور ان کے بیان کرنے کے ڈھنگ و انداز مختلف اور مرغوب طبع تھے . کبھی تو چرند اور پرند کی زبان میں قصے و حکایات بیان کی جاتی تھیں ، کبھی عورتوں کی زبان کا سہارا لیا جاتا تھا ، کبھی بہادر اپنے تجربے نخریہ انداز میں بیان کرتے تھے جن سے « امثال و اقوال » اخذ ہوتے تھے .

امثال و اقوال یہ ایسے اصناف سخن ہیں جو انسان کی عقل و فہم سے خطاب کرتے ہیں اور نہایت آسانی کے ساتھ یاد رہتے ہیں برخلاف اس کے منطقی استدلال سے طبعیت اکتا جاتی ہے اور وہ جلد بھول بھی جاتے ہیں . ہندوستان کے قدیم ادب میں ان کا درجہ بڑا رہا ہے ، اس قسم کی تصنیفات میں ہندوؤں اور عربوں نے بڑی شہرت حاصل کی تھی .

بھارت کے لٹریچر میں « پنچ تنتر » ایک ایسا مشہور و معروف مجموعہ ہے جس کے بارے میں بعض محققین کی یہ رائے ہے کہ یورپ کے ایسا اپ [1] نے اپنی تصنیفات میں اس مجموعہ سے اقتباس کیا ہے لیکن « پنچ تنتر » کے مختلف حصے مختلف زمانوں میں جمع کئے گئے ہیں کیونکہ اس میں ایک مہندس کا نام آیا ہے جس کا زمانہ چھٹی صدی مسیحی کا تھا . اس صدی کے نصف اول میں

---

* جناب ایم . اے . حفیظ . دارالشفا ، حیدرآباد ۲ (دکن)

۱ یہ شخص ان مشہور و معروف حکایات ، امثال اور اقوال کا لکھنے والا ہے جو اس کے نام سے آج تک معروف ہیں . کہا جاتا ہے کہ یہ غلام تھا اور آزاد ہونے کے بعد کریشس لائی ڈیا کے بادشاہ نے اس کی بڑی قدر کی جس کی سال پیدائش ۶۱۹ قبل مسیح اور سال وفات ۵۶۴ قبل مسیح تھا .

نیتی لٹریچر کا شہرہ ایران تک پہنچا تھا اور ساسانی خاندان کے خسرو نوشیرواں نے جس کا زمانہ حکومت ۵۳۱ ع سے ۵۷۹ ع تک رہا ہے اپنے دربار کے ایک ہر دل عزیز حکیم باردوئی کو ہندوستان بھیجا تھا اور اسے خاص طور پر ہدایت دی تھی کہ وہ بھارت سے «آب حیات» ساتھ لائے . حکیم ہندوستان آیا اور شہنشاہ کے حکم کی تعمیل میں «آب حیات» کو بہت تلاش کیا لیکن اسے یہ امرت نہ مل سکا . جب وہ اپنے ملک کو مایوس واپس ہونے لگا تو کسی نے «پنچ تنتر» کا ایک نسخہ حوالہ کیا اور کہا کہ اپنے شہنشاہ کے لئے «آب حیات» لے جاؤ . حکیم باردوئی اس کی اہمیت اور حقیقت کو نہ سمجھ سکا اور لا علمی میں اس نے اس نسخہ کو ڈرتے ڈرتے شہنشاہ خسرو کے حضور میں پیش کیا . نوشیرواں اس نسخہ کو دیکھ کر بہت خوش ہوا اور اس کا ترجمہ پہلوی زبان میں کروایا اور ایران کے شاہی کتب خانہ میں اس کا ترجمہ ۶۵۲ ع تک رہا اور لوگ نسلاً بعد نسلِ «پنچ تنتر» کے حکیمانہ اقول و امثال سے فائدے اٹھاتے رہے . اس کے بعد عرب ایران پر قابض ہوئے جن کے زمانے میں امثال و اقوال بکثرت لکھے گئے . اندلس اور یورپ والوں نے ان کے بہت سے امثال و اقوال کو اخذ کیا اور ایک بہت بڑا حصہ ان حکیمانہ اقوال و امثال کا جو سینکوپین زا [1] کی زبان سے بیان کیا گیا ہے یہ عربوں سے ماخوذ ہے

اس کے سو برس بعد المنصور کو اس پہلوی ترجمہ کا ایک نسخہ مل گیا تھا جو خردبرد زمانے سے بچ گیا تھا اور اس نے اس کا ترجمہ عربی زبان میں کرایا اور دن بدن یہ مجموعہ ساری دنیا میں مشہور ہوتا چلا گیا . دسویں صدی میں اس کا ترجمہ فارسی نظم میں ہونے کے بعد سلطان سلیمان کے دورِ حکومت میں اس کا ترجمہ ترکی نظم میں بھی ہوا .

گیارھویں صدی میں اس کا ترجمہ یونانی میں بھی ہوا . جہاں کا وہ خیالی شخص لقمان جو اقوال و امثال اور حکایات لکھنے میں سب میں مشہور ہے اور جس کی

---

۱ اسپینی زبان میں ایک نہایت مشہور قصہ ,, ڈان کونک زوٹ ،، کا ہے جو زمانہ متوسط کا ایک سردار ہے جس کی بہادریوں کے بیان میں یہ کتاب لکھی گئی ہے . ,, سینکوپین زا ،، اس سردار کا نوکر تھا جو گدھے پر سواری کرتا تھا اور ہر وقت اس کی زبان سے مثلیں اور حکیمانہ اقوال نکلتے تھے .

عقلمندی کی مثال قرآن پاک میں بھی دی گئی ہے۔ اس کے حکیمانہ امثال و اقوال دنیا میں مشہور ہیں اور آج بھی ہمارے لئے مشعل راہ ہیں۔ اس کے بعد تیرھویں صدی میں عبرانی اور اسپانی میں اس کے ترجمے شائع ہوئے۔ چودھویں صدی میں جرمن ترجمہ ہوا اور اسی صدی میں «ریمان دے بے زئے» نے اسپانی ترجمہ سے جوکہ خود عربی سے نوار کی شہزادی ژین زوجہ فلپ کے لئے ترجمہ ہوا تھا، لاطینی میں ترجمہ کیا۔ غرض اس بے بہا مجموعہ کا ترجمہ تقریباً ہر زبان میں ہوا اور زمانہ متوسط کے ادب میں ان ترجموں کا بہت بڑا اثر پڑا۔ یورپ کی کہانیوں اور امثال کا بہت بڑا حصہ جس میں خود لافانٹینس شامل ہے ان ہی ہندو حکایات سے ماخوذ ہے۔

اس سلسلے کی ایک اور کڑی «ہتوپدیش» کے نام سے مشہور و معروف ہے جو «پنچ تنتر» کے بہت بعد کی ہے جس میں قصے، کہانیاں، حکایتیں اور امثال و اقوال مذہبی و تاریخی پیرائے میں درج کئے گئے ہیں۔ ہندوستان کے اس قدیم ادب میں انسانی جذبات کو اس عمدگی اور سچائی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ اس سے خواہ مخواہ طبیعت کو فرحت ہوتی ہے اور یہ ایک ایسی ندی کی مثال ہے جس کی ریتی میں سونے کے ریزے ملے ہوئے ہیں، جب تک کہ اس سے لت پت کیچڑ دھوکر صاف نہ کی جائے یہ قیمتی ریزے ہمیں نہیں ملتے۔ ان تمثیلوں قصوں اور کہاوتوں کے بارے میں کسی نے سچ کہا ہے کہ ہر ایک قوم کی مثالیں اس قوم کے تحریروں کا لب لباب ہیں۔ چونکہ بھارت کا قدیم لٹریچر قصوں اور حکایتوں سے بھرا ہوا ہے جس کے ہر قصہ اور کہانی میں جا بجا امثال و اقوال سے کام لیا گیا ہے اور جو اقوام کے تجرباتی نچوڑ سے مالا مال ہے وہ اشتباہ معنی اور عدم تحقیق والی بات ان امثال و اقوال میں نہیں پائی جاتی ہیں کیونکہ ان کے معنی صاف اور صریح ہیں جو عوام کے خیالات کا خاکہ ہیں اور ان کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں۔

قصص اور حکایات کی کتابوں میں سب سے زیادہ عجیب اور مشہور الف لیلہ و لیلہ ہے۔ جو مختلف زمانوں میں لکھے گئے قصوں اور کہانیوں کا مجموعہ ہے کیونکہ اس کے بعض حصے دسویں صدی کے ما قبل کے ہیں۔ اس میں ہندی

اور ایرانی الاصل کہانیاں بھی ہیں لیکن اس کا ایک بڑا حصہ تیرہویں اور پندرہویں صدی عیسوی میں مصر کے عربوں نے لکھ کر جمع کیا. موسیو وائل جو ہای ڈل برگ میں مشرقی السنہ کے استاد تھے اپنے جرمن ترجمہ الف لیلہ و لیلہ کے مقدمہ میں جو انہوں نے اصل عربی سے کیا ہے لکھتے ہیں کہ بلا شک و شبہ الف لیلہ کی زیادہ تر حکایات عربی ہیں اور یہ حکایات ان سے بالکل علحدہ ہیں جو اوائل سنین اسلام میں ایران و ہندوستان کی کہانیوں سے جمع کی گئی تھیں.

الف لیلیٰ اپنے زمانوں کی معاشرت و طرز زندگی اور اوضاع و اطوار کا خاصا ذخیرہ رکھتی ہے اس میں غیر ضروری اجزاء کے ساتھ ساتھ کام کی زرین باتیں کچھ اِس طرح گھل مل گئی ہیں کہ ان میں اس زمانوں کے نقش و نگار نمایاں صورت میں ابھر آتے ہیں اور اس میں مشترک امثال و اقوال جو عملی زندگی کے تجربات میں ڈوبی ہوئی ہیں ان سے اس زمانے کے ہر رخ کی تصویر کا نقشہ کھینچ جاتا ہے اور جب یہ چھن کر ہمارے سامنے آجاتے ہیں تو « مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید » والی بات بن جاتی ہے اور ان کے الفاظ مختصر مگر با معنی اور برمحل ہوکر انسان کے لئے مرغوب طبع بن جاتے ہیں جس کا لطف نیکی اور بدی کی کشمکش میں چٹخارہ دار بن جاتا ہے.

ذیل میں ان امثال و اقوال کے چند انتخابات دئے جاتے ہیں جن سے زندگی کے مختلف مسائل و مراحل اور عملیات اخلاقی و سچائی اصول پر روشنی پڑتی ہے. ان میں قسمت کے عقیدے کو مرکزی حیثیت حاصل ہے.

ممالک مشرق میں ایک خاص خطۂ زمین کے لوگوں میں قسمت کا زبردست اعتقاد پایا جاتا ہے. ان اقوام میں بلا لحاظ مذہب و ملت یہ ایقان موجود ہے کہ جو کچھ قسمت میں لکھا ہے وہ ہوکر رہے گا. قسمت کے آگے کسی کی کچھ نہیں چلتی. اس اعتقاد میں روسی، عیسائی اور ہندوستانی سبھی شامل ہیں جو اس مرزبوم میں رہتے ہیں. انسان کو اپنے ارادوں میں جب ناکامی ہوتی ہے اور اپنے « ناخن تدبیر » سے ان مسائل کو حل نہیں کرسکتا جو اس کے لئے باعث الجھن بن جاتے ہیں تو ایسی صورت میں اپنے آپ کو تسلی دینے کے لئے وہ قسمت کا سہارا لیتا ہے تاکہ صبر و سکون سے ان مشکلات پر سے گذر جائے. مشرقی اقوام میں اس رواج کی اہمیت اس لئے بڑھ گئی ہے کہ بالعموم کاہلی و سستی ان کی

فطرت کا ایک جز ہوگیا ہے اور ان ممالک میں روزی کا مسئلہ آسانی سے حل ہوجاتا ہے کیونکہ یہ زرعی ممالک ہیں اس لئے «کھاؤ، پیو اور خوش رہو» کے مقولہ پر عمل کرتے ہیں. چونکہ یہ ممالک بالعموم گرم ہیں اس لئے زیادہ دوڑ دھوپ ان کے بس کی بات نہیں اور چونکہ جو کچھ مل جاتا ہے اسی کو قسمت کا لکھا سمجھا جاتا ہے. یہ لوگ چونکہ قدیم روایات کے حامل ہیں اس لئے نئی نئی چیزوں کی دریافت اور فطرت کے رموز حل کرنے کی جستجو ان میں نہیں پائی جاتی جس کی وجہ سے مادیت سے زیارہ روحانیت کے قائل ہوگئے ہیں اور جب اس کا جواز ان کو مذہبی کتابوں سے مل جاتا ہے تو اسی پر اکتفاء کرنا کافی سمجھتے ہیں. چنانچہ مسلمانوں میں تسلیم و رضا کے مسئلہ نے اس کو بڑی حد تک سہارا ہے اور ہندوؤں میں مذہبی کتابوں نے اقوال و امثال کے ذریعہ اس رجحان کی پشت پناہی کی ہے. ذیل میں چند نمونے دئے جاتے ہیں.

قسمت

«قسمت نے ہماری پیشانی پر ایک سطر چند حرفوں کی لکھی ہے. جس کو ہمارا عالم سے عالم شخص اپنے علم سے مٹا نہیں سکتا.» [پنچ تنتر دوسرا منتر شعر ۱۷۲]

«جو نہیں ہونے والا وہ ہرگز نہیں ہوتا ہے اور جو ہونے والا ہے اس کے خلاف کبھی نہیں ہوتا یہ فکر کے زہر کا تریاق ہے بس ہمیں کیوں نہ کام میں لائیں.» [ہتوپدیش باب اول شعر ۲۷]

«جو سمندر میں ڈوب جائے یا پہاڑ پر سے گرے یا آگ میں گرجائے یا اسے سانپ ڈسے اگر اس کی زندگی ہے تو وہ سلامت رہے گا.» [ہتوپدیش باب دوم ۱۶]

«اس دنیا کے کل کام قسمت پر ہی ہیں اور انسان کی کوشش پر بھی، لیکن ان دونوں میں قسمت کو کوئی نہیں جانتا کہ کیا ہے لیکن انسانی کوشش سے کام لیا جاسکتا.» [منوشاستر[1] ساتواں باب ۲۰۵]

---

۱ منوشاستر: ہندو قوانین کا مجموعہ جس میں جائداد کی تقسیم، راجہ اور رعایا کے فرائض. چار ذات (برہمن، کشتری، ویس اور شودر) کے فرائض. انسانی زندگی کے مختلف حصوں یعنی چار آشرموں (برہم چریہ، گرہست، بان پرستھ اور سنیاس) کے متعلق تفصیلی ہدایات مندرج ہیں جس کو منوسمرتی کی تصنیف کہا جاتا ہے جو ہندوؤں کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا واضع قوانین تھا، اس کا قانون علی العموم انصافی اصول پر مبنی تھا. اس کی تالیف کے بارے میں مختلف بیانات ملتے ہیں. سر ولیم جونس نے اس کو آٹھ سو سال قبل مسیح قرار دیا تھا اور بعض دوسرے محققین نے پانچ سو سال قبل مسیح لکھا ہے لیکن جدید تحقیقاتوں میں اس کا زمانہ دو تین سو سال قبل مسیح ثابت کیا گیا ہے

« انسان کو چاہئے کہ قسمت کا خیال رکھتے ہوئے بھی اپنی کوشش نہ چھوڑے بلکہ بلاکوشش کے کوئی سرسوں سے تیل نہیں نکال سکتا ۔ » [ہتوپدیش دیباچہ ۳۰]

لیکن یہ چیز فکر و عمل کی راہوں کو بند کردیتی ہے ۔ چنانچہ مغرب ایک زمانہ میں مشرق سے بہت پیچھے تھا لیکن اپنی دوڑ دھوپ ، تگ و دو اور جستجو و کوشش میں آج آگے بڑھ گیا ہے ، اس پر فطرت کے کئی راز منکشف ہوچکے ہیں اور وہ قسمت کے لکیروں کو میٹ رہا ہے پھر :

« روشنی تدبیر کی تقدیر کو چمکائے گی »

والی بات پر عمل کررہا ہے ۔ انسانی زندگی کے ارتقاء میں فکر و عمل کی راہوں نے کئی نئے باب کھول دئے ہیں اور آج کا انسان ایک مہماتی انسان بن گیا ہے جو پرانی قدروں کی نفی کرتے ہوئے اور آگے کی جستجو میں چلا جارہا ہے ۔ ممکن ہے کہ اسے اپنے اس ارتقائی سفر میں کئی نئی نئی منزلیں ملتی جائیں ۔ پتہ نہیں کہ اس کی آخری منزل کہاں ہوگی ؟

ماہرین نفسیات نے انسان کی « جبلتوں » کو واضح طور پر بیان کرنے کی کوشش کی ہے ۔ ان کا کہنا ہے کہ « جبلتیں » وراثۃً ملتی ہیں اور وہ کبھی مر نہیں سکتیں ۔ البتہ تعلیم و تربیت ان کا رخ موڑ سکتی ہے اور ان کو نشیب سے فراز کی طرف لے جاسکتی ہے ۔ جس طرح پانی کی سیال خاصیت کی وجہ سے ہم اس کو گندی نالی کی طرف لے جاسکتے ہیں اور اس کا رخ گلاب کی باڑ کی طرف بھی موڑ سکتے ہیں ۔ بالکل یہی حال انسان کی « جبلتوں » کا ہے ۔ شاید اسی کو عام زبان میں انسان کا ظرف کہا گیا ہے جو اپنی جگہ اٹل ہوتا ہے ۔ ذیل میں چند امثال و اقوال درج کئے جاتے ہیں جن سے ان کی اہمیت پر روشنی پڑے گی ۔

جبلتیں

« جبلت نصیحت سے نہیں بدلتی ۔ پانی کتنا ہی گرم کیا جائے آخر جل کر ٹھنڈا ہوجاتا ہے ۔ » [پنچ تنتر پہلا منتر شلوک ۲۵۷]

« اگر آگ ٹھنڈی ہوتی یا چاند میں جلانے کی خاصیت ہوتی تب البتہ اس دنیا میں بھی انسان کی جبلت بدل سکتی ہے ۔ » [پنچ تنتر باب اول شعر ۲۸۸]

« ہر شخص کے جبلت ہی کا امتحان ہونا چاہئے اور خصائص کا امتحان

ضروری نہیں. کل خصلتوں میں جبلت سب سے اوپر چڑھ کر بیٹھتی ہے.»
[ہتوپدیش تیسرا باب ۵۸]

«انسان اپنی جبلت کو بہ مشکل بدل سکتا ہے اگر کتے کو پادشاہ بنا دو تب بھی وہ جوتے چبانا نہیں چھوڑے گا.» [ہتوپدیش باب سوم ۶۱]

«جس شخص کے اخلاق ایسے ہوں جو آریوں کے شایاں نہیں یعنی اس میں سختی، بے رحمی اور ہمیشہ اپنے فرائض کی طرف سے غفلت ہو تو وہ شخص کم نسل ہے.» [منوشاستر دسواں باب ۵۸]

«کم نسل شخص اخلاق میں یا تو اپنے باپ سے مشابہ ہے یا اپنی ماں یا دونوں سے. وہ کبھی اپنی جبلت کو چھپا نہیں سکتا.» [منوشاستر دسواں باب ۵۸]

لیکن ان اقوال و امثال میں جو کڑے پن (Rigidity) کا عمل پایا جاتا ہے اس پر انسان کی تدبیریں اور کوششیں دیر پا اور گہرے اثرات بھی پیدا کرسکتی ہیں، جب تعلیم اچھے اور برے کی تمیز پیدا کرتی ہے تو ان جبلتوں کا رخ مڑ جاتا ہے. مثال کے طور پر ایک انسان فطرتاً ضدی واقع ہوا ہے، اگر اس کی صحیح تعلیم و تربیت کی جائے تو وہ بجائے خود پرست (Self Centred) ہونے کے ایک بہترین بیرسٹر بن سکتا ہے. جو اپنے خیالات پر سختی سے اڑ کر اپنی بات منوا سکتا ہے. مختصر یہ کہ جبلتوں کی تبدیلی کا نام تعلیم ہے.

ہزارہا خطرات کے باوجود بھی خدا کی دی ہوئی نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت زندگی ہے عقلمندوں نے حدود کے اندر رہ کر زندگی سے حظ اٹھانے کی دعوت دی ہے. اسی لئے شادی بیاہ آل و اولاد، بیوی بچے، عزیز و اقاریب ہمسایہ سب کے حقوق مقرر کردئے ہیں اور سب سے متمتع ہونے کی تاقین کی ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ انسانوں کو چاہئے کہ وہ زندگی کی خوشیوں کے ساتھ ساتھ بڑھاپے کی تلخیاں اور موت کی مایوسی کو نہ بھولیں کیونکہ انسان جب بوڑھا ہوجاتا ہے اور موت سے گلے ملتا ہے اس وقت اس کو اپنی کوتاہیاں نظر آتی ہیں اور غلطیوں پر نادم ہوتا ہے لیکن اس وقت تیر کمان سے چھوٹ جاتا ہے اور تلافی نا ممکنات سے ہوجاتی ہے. عقلمندوں کے چند مقولے و مثالیں اس سلسلے میں درج ذیل ہیں.

زندگی بڑھاپا اور موت

۱ « جو کوئی بے مقصد کی زندگی بسر کرتا اور کچھ امیدیں نہیں رکھتا اس نے سب کچھ پڑھا اور سب کچھ سیکھا ہے اور وہ کچھ کرچکا ہے ۔ »
[ہتوپدیش باب اول ۳۳]

۲ « جو کوئی مصیبت میں رنج نہیں کرتا ۔ فلاح پر خوش نہیں ہوتا ۔ اور لڑائی کے وقت نہیں ڈرتا ۔ وہ دنیا میں تلک ہے ۔ بہت کم مائیں ہیں جو ایسے پوت جنتی ہیں ۔ » [ہتوپدیش باب اول ۳۳]

۳ « جوانی ، حسن ، زندگی ، دولت اور حکومت اور پیاروں کا ساتھ ، یہ وہ چیزیں ہیں جو ہمیشہ نہیں رہتیں عقلمند کو ان کی فکر میں نہیں پڑنا چاہئیے ۔ »
[ہتوپدیش باب چہارم ۷۱]

۴ « عقلمند علم اور دولت حاصل کرتے وقت نہ بڑھاپے کا خیال کرے نہ موت کا ۔ لیکن نیکی کرتے وقت وہ یہی خیال کرے کہ موت اسے بال پکڑ کر کھینچ رہی ہے ۔ » [ہتوپدیش دیباچہ ۳۸]

۵ وہ کون شخص ہے جو اپنے سے نیچے طبقے کے لوگوں کو دیکھے اور اس کو اپنی بڑائی نہ معلوم ہو ۔ جب اپنے سے اوپر کے لوگوں پر نظر ڈالے تب اپنی کمی معلوم ہوتی ہے ۔ » [ہتوپدیش کتاب دوم ۲]

۶ « سانپ ہوا پی کر رہتے ہیں اور پھر کمزور نہیں ہوتے ۔ جنگلی ہاتھی سوکھی جھاڑیاں کھا کر مضبوط ہوتے ہیں ۔ ریاضت کرنے والے راہب (جو بہت کم کھاتے ہیں) زندہ رہتے ہیں ۔ اصل میں قناعت انسان کے لئے سب سے بڑی دولت ہے ۔ » [پنچ تنتر باب دوم شعر ۲۰]

۷ « جو شخص اپنے مال کو نہ اپنی ذات پر خرچ کرتا ہے نہ کسی دوسرے کو دیتا ہے اس کی زندگی مثل لوہار کی دھوکنی کی ہے جو سانس لیتی ہے لیکن زندہ نہیں ہے ۔ » [ہتوپدیش کتاب اول ۱۶۸]

۸ « دہرم کیا چیز ہے ؟ کل ذی روح پر رحم کرنا ۔ آسودگی کیا چیز ہے ؟ ہر ایک مخلوق کے لئے صحت ۔ محبت کیا چیز ہے ؟ نیک طبیعت ۔ علم کیا چیز ہے ؟ برے بھلے میں امتیاز ۔ » [ہتوپدیش باب اول ۱۵۶]

۹ «عقلمند کبھی ان چیزوں پر افسوس نہیں کرتے جو تلف ہوگئی اور نہ مردے پر یا کھوئی ہوئی چیز پر روتے ہیں کہ عقلمند اور بے عقل میں یہی فرق ہے۔»
[پنچ تنتر]

۱۰ «انسان کو چاہئے کہ خاندان کی خاطر سے کسی فرد خاندان کو چھوڑدے۔ گاؤں کی خاطر سے خاندان کو چھوڑے۔ ملک کی خاطر سے گاؤں کو۔ اور خود اپنے فائدہ کے لئے دنیا جہاں کو۔» [پنچ تنتر تیسرا منتر ۸۱]

۱۱ «عقلمند کو چاہئے کہ اپنی جان کو بیٹے اور بی بی کی جانیں کھو کر بھی بچائے۔ جس وقت خود انسان زندہ رہا تو اس کو سب کچھ مل سکتا ہے۔»
[پنچ تنتر]

۱۲ «جب ہمارا یہ جسم جو پانچ عناصر سے بنا ہے مرنے کے بعد اپنے اصلی اجزاً میں مل جاتا ہے تو افسوس کس بات کا کیا جائے۔» [پنچ تنتر]

ان مقولوں اور مثلوں میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے ان میں بھرپور صداقت موجود ہے کیونکہ انسان اس زندگی میں ایک مسافر ہے جس کا سفر انجانے طور پر نامعلوم کب ختم ہوتا ہے اس لئے اس کو چاہئے کہ زادِ راہ ہمیشہ ساتھ رکھے اور یہی اس کا عمل ہے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے (اقبال)

انسانی افعال و محرکات میں قدیم زمانے کے دانشمندوں نے خوف کو اول جگہ دی ہے ان کا کہنا یہ ہے کہ ضبط و تنظیم اور کارکردگی کے لئے سزا ضروری اور لازمی ہے کیونکہ تمدن کا مدار ضبط و تنظیم پر منحصر ہے اور یہی ایک چیز ہے جو انسان کو اپنے ادائی فرض پر قائم رکھتی ہے اور گمراہی سے روکتی ہے۔ خوف اور سزا کے بارے میں چند اقوال درج ذیل ہیں۔

افعال و محرکات

۱ سزا تمام بنی آدم کو راہ پر لاتی ہے کیونکہ ایسا شخص جو خلقةً نیک چلن ہو مشکل سے ملتا ہے۔ سزا ہی کا ڈر وہ چیز ہے جو دنیا کے لوگوں کو ان نعمتوں کا مزا اٹھانے دیتا ہے جو ان کو عطا کی گئی ہیں۔ [منو شاستر]

۲ بنا ڈر کے یا لالچ کے یا کسی خاص غرض کے انسان نہ کسی کے ساتھ خلق سے پیش آتا ہے نہ کسی کی آؤ بھگت کرتا ہے۔ [پنچ تنتر]

۳ پیڑ کا پھل جب ہوچکتا ہے تو چڑیاں اسے چھوڑ دیتی ہیں۔ سوکھے تالاب سے بگلے اڑ جاتے ہیں۔ جلے جنگل کے کنارہ سے ہرن چمپت ہوجاتے ہیں۔ کنچنیاں مفلسی سے کوسوں بھاگتی ہیں۔ اور نوکر چاکر تباہ راجہ سے۔ ہر شخص اپنے فائدہ کی تلاش سب سے مقدم سمجھتا ہے۔ [پنچ تنتر]

۴ آگ جو جنگل کو جلا دیتی ہے ہوا اس کا ساتھ دیتی ہے پر چراغ کو گل کردیتی ہے۔ کمزور کا کون دوست؟ [پنچ تنتر]

۵ جب تک کچھ خدمت نہ کی جائے کوئی کسی سے کسی قسم کی محبت نہیں کرتا۔ دیوتا بھی منت تب پوری کرتے ہیں جب کوئی چڑھاوا ان پر چڑھایا جائے۔ [پنچ تنتر]

۶ محبت کا وجود دنیا میں اسی وقت تک پایا جاتا ہے کہ جب تک اس کا کوئی صلہ ملے۔ گائے کا بچھیڑا جب دیکھتا کہ تھن میں دودھ نہ رہا تو ماں سے جدا ہوجاتا ہے۔ [پنچ تنتر]

۷ آدمی، آدمی کا نوکر نہیں ہوتا بلکہ روپیہ کا۔ آبرودار اور معتبر ہونا یا بے حقیقت ہونا اس پر موقوف ہے کہ انسان دولت مند ہے یا مفلس۔ [ہتو پدیش]

۸ اگر کوئی جھوٹ بولتا ہے یا ایسے کی تعظیم کرتا ہے جو تعظیم کا مستحق نہ ہو یا غیر ملکوں کا سفر کرتا ہے تو اپنا پیٹ پالنے کے لئے۔ [پنچ تنتر]

۹ دنیا میں مرد اپنے ہر فعل کا مختار ہوتا ہے تا وقتیکہ کسی عورت کی بکواس آنکس اسے رام نہ کردے۔ [پنچ تنتر]

۱۰ مرد کیسا ہی عاقل کیوں نہ ہو لڑائی کے میدان میں کیسا ہی سورما بیر کیوں نہ ہو عورت کے سامنے بہت ہی ذلیل و خوار بن جایا کرتا ہے۔ [پنچ تنتر]

۱۱ جو مرد عورت کی بات پر چلتا ہے وہ غیر ممکن کو ممکن، نا دستیاب کو دستیاب، اور نا خوردنی شے کو کھانے کے قابل سمجھتا ہے۔ [پنچ تنتر]

لیکن ان اقوال و امثال میں سزا کو جو بنیادی حیثیت دیگئی ہے تجربات اس کی نفی کرتے ہیں کیونکہ کسی انسان کی اصلاح اس کے خیالات میں پاکیزگی آنے سے کی جا سکتی ہے نہ کہ بیرونی دباؤ و ڈر اور خوف سے، تاریخ شاہد

ہے کہ سزا نے رد عمل کا جذبہ پیدا کیا، ڈر اور خوف سے جو کام ہوا اس میں خلوص و نیک نیتی کو ذرا بھی دخل نہ رہا۔ یہاں تک کہ جسمانی سزا نے بڑے بڑے جرائم کی بھی روک تھام نہ کی بلکہ «جتنا بھی دباؤ تم اتنا ہی ابھرے گا» والی بات ہوجاتی ہے اس لئے یہ افعال افراط و تفریط سے گلے ملتے ہیں۔ گو ان میں بڑی حد تک صداقت ہے لیکن ان میں تحدید نہیں ہے۔

بھارت میں عورت کا جو درجہ قائم کیا گیا ہے اس میں اسے ایک «ادنیٰ حسین مخلوق» سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس کی بے وفائی کو لاعلاج تصور کیا گیا ہے اس کو مرد کا جز زندگی سمجھ کر وہ ایک ملکیت قرار دیگئی ہے۔ بحیثیت ایک انسانی فرد کے اسے کسی قسم کی آزادی نصیب نہیں۔ منو سمرتی جیسا موجد قوانین اس بارے میں یک طرفہ رائے رکھتا ہے۔ ذیل کے اقوال اس زمانے کے دانشمندوں کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں۔

عورت

۱ نلو کی تقسیم کے مطابق عورتوں کا خاص حصہ یہ ہے۔ پلنگ سے محبت، بیٹھنے کی چوکی سے محبت، زیور کا شوق، شہوت پرستی، غصہ، برے کی طرف میلان، اذیت رسانی سے رغبت اور ضدی پنا۔ [منو شاستر]

۲ عورت کی طبیعت کا تلون جیسے سمندر کی موجیں، اس کے جذبات بالکل بے ثبات، جیسے شفق کے بادلوں کی صفیں۔ جب اس کی ہوس پوری ہوجاتی ہے اور مرد اس کے کام کا نہیں رہتا تو اس سے کنارہ کش ہوجاتی ہے جیسے کوئی اس لاکھ کو پھینک دیتا ہے جس پر چھاپہ ہوچکا ہو۔ [پنچ تنتر]

۳ ایک سے باتیں کرتی ہے تو دوسرے کی طرف اضطراب کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور دھیان اس کا ہوتا ہے تیسرے کی طرف جس کو وہ دل ہی دل میں رہنے دیتی ہے۔ فی الحقیقت وہ کون ہے جس کو عورت دل سے چاہتی ہے۔ [پنچ تنتر]

۴ عورتیں ہمیشہ بے وفا ہوا کرتی ہیں حتیٰ کہ یوگ کہتے ہیں دیوتاؤں کی استریوں کا بھی یہی حال ہے خوشا حال ان مردوں کا جن کے عورتوں کی پوری حفاظت کی جاتی ہے اگر کوئی عورت پاک دامن ہے تو اس کی وجہہ یہ

نہیں کہ اس میں حیا ہے یا حجاب یا طبیعی نیک خصلتی یا خوف بلکہ صرف یہی کہ اس سے کوئی کسی عنایت کا طلبگار نہیں ہوا۔ [ہتو پدیش]

۵ پاگل، کیکڑا، نیل، تلوار اور استری چمٹتے سب برابر ہیں۔ [پنچ تنتر]

۶ عورت کو کوئی نہ جبر سے زیر کرسکتا ہے نہ نصیحت سے یہ ایک ایسی کائنات ہے کبھی مغلوب ہی نہیں ہوتی۔ [پنچ تنتر]

۷ عورت کا حال گائے کا سا ہے جو جنگل میں نت نئی ہریلی گھانس کے کھوج میں رہتی ہے۔ عورت بھی سدا نئے نئے کی چاہت میں رہتی ہے۔ [ہتو پدیش]

۸ عورت کی محبت بجلی کی چمک سے بھی جلد مٹ جاتی ہے۔ دھن اس کو کسی اور کی ہو پر بناوٹ سے پیار تم کو کرے۔ گلے تم کو لگائے اور ٹھنڈی سانس تمھارے کسی رقیب کے لئے بھرے۔ طبیعت کے برخلاف چال چلنے کا کوئی کیوں ارادہ کرے۔ کنول کا پھول پہاڑیوں کی چوٹیوں پر نہیں پھولتا۔ خچر کا بوجھا اور ہوتا ہے گھوڑے کا اور۔ جو کے دانہ سے دہان نہیں اگتا۔ عورت کی روح میں پارسائی کا وجود ڈھونڈھے نہیں ملتا۔

۹ شہوت ناک عورت کو جسے ہمیشہ کسی مرد سے لگاؤ رہتا ہے خاندان کی ذلت، دنیـــا کی ملامت، حتیٰ کہ اسیری اور جان کا خطرہ سب کچھ منظور ہوتا ہے۔ [پنچ تنتر]

۱۰ جو بات عورت کے دل میں ہوتی ہے وہ اس کے زبان پر نہیں آتی۔ جو زبان پر آتی ہے وہ منھ سے باہر نہیں نکلتی اور جو باہر نکلتی ہے اس پر وہ عمل نہیں کرتی۔ [پنچ تنتر]

۱۱ جہاں استری راج ہو۔ جہاں کوئی جواری ہو اور جہاں بچہ مالک ہو اس گھر کا ستیاناس ہوجاتا ہے۔ [پنچ تنتر]

۱۲ محبت سے بالکل پرہیز کرنا مناسب ہے اور اگر نہ ہوسکے تو اپنی ہی اہلیہ سے محبت کرے کیونکہ وہی اس کا شافی علاج کرسکتی ہے۔ [ہتو پدیش]

۱۳ یہ دبدھوں کا بگولا، شوخی کا مسکن، بیباکی کی نگری، گناہوں کا مخزن ہزار مکاریوں کا محل، بدگمانیوں کا ڈیرا، یہ پٹاری جس میں ہر قسم کا جادو منتر بھرا ہے، یہ معمہ جس کے حل کرنے میں بڑے سے بڑے اور نامور سے نامور مرد قاصر رہے ہیں، یہ کل جس کا نام عورت ہے، یہ امرت

ملا ہوا زہر، اس کو دنیا میں کس نے پیدا کیا کہ پارسائی کو میٹ دے۔

[پنچ تنتر]

۱۴ پس جب شوہروں کو معلوم ہے کہ خداوند عالم نے مخلوقات کی پیدائش کے وقت ان کو کیا خصلت عطا کی ہے تو ان کو لازم ہے کہ ان کی حراست میں از حد کوشش کریں۔ [منو شاستر]

لیکن ہندوستان کی استری اپنی وفاداری میں ضرب المثل رہی ہے۔ اس نے اپنی ہستی کو اپنے پتی کی ہستی میں ضم کر دیا وہ اس کے ساتھ زندہ رہی اور اسی کے ساتھ جل مری۔ ستی کی رسم نے ثابت کردیا کہ وفاداری کس کو کہتے ہیں۔ اپنے شوہر اور اپنے بچوں کی نگرانی دیکھ بھال اور خدمت کے لئے بھارت کی عورت نے مثال قائم کردی ہے۔ اسے اپنی ذمہ داریوں کا اتنا احساس ہے کہ اپنی ذات سے اسے کوئی دلچسپی باقی نہ رہی۔ اس کے ساتھ ساتھ جوانمردی، بہادری اور ایثار کی بڑی بڑی مثالیں ہندوستان کی عورت نے قائم کی ہیں۔ دنیا میں عورت کو مرکزی حیثیت حاصل ہے کیونکہ وہ دھرتی کی ماں ہے وہ رشی اور پیغمبر نہیں بلکہ وہ رشی اور پیغمبر پیدا کرتی ہے۔ ان کی پرورش و نگہداشت کی ذمہ داری اسی کے سر ہے اس کے باوجود اسے انسانی فرد کی حیثیت سے آزادی نہ دی جائے یہ انصاف نہیں۔ اسلام نے عورت کے درجے کو بہت بڑایا ہے اسے مساوات کا درجہ دیا ہے۔ اس کی اہمیت و معنی اور اسے زندہ رہنے کا سبق دیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عورت کو بھی اپنے جوہر دکھانے کے موقع ملے۔

بھارت کے قدیم دانشمندوں نے اس وقت علم کی قدر و قیمت کی جب کہ مغرب اس باب میں سویا ہوا تھا۔ وہ علم کو روپیہ پیسے سے بھی بڑی دولت سمجھتے ہیں اور جہالت کو افلاس سے کمتر درجہ قرار دیتے ہیں علم کی تعریف میں ان کے پاس «دھیان گیان» پر بہت زور دیا گیا ہے وہ جو بھی نتیجہ منضبط کرتے ہیں اس میں سونچ و بچار اوو تجربہ کو بڑا دخل ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ جب مغرب میں علم کی روشنی پھیلی تو مشرق کے سرچشموں سے استفادہ کیا گیا اور یہاں کی کتابوں کو بہت اہمیت دی جا کر ان خیالات کو اپنایا گیا۔ بعد میں مغرب کے مفکرین نے ان بنیادی پتھروں پر اپنے تخیلات کے محل بنائے، بات کو پھیلانے کی کوشش کی اور بات میں بات پیدا کی جس میں گھات کو دخل حاصل ہے۔

گو بڑی حد تک تیقن کے ذرات شامل ہوتے گئے. اسی لئے مشرق میں عالم کا درجہ بادشاہ سے بھی بڑھ چڑھ کر ہے. ذیل کے امثال اس کی گواہی دیتے ہیں.

علم و جہالت

۱ کوئی اس میں اختلاف نہیں کرتا کہ علم انسان کا بہترین زیور ہے علم مال کا ایک پوشیدہ دفینہ ہے علم ایک ایسا دوست ہے کہ ہر ایک سفر میں ساتھ دیتا ہے. علم دولت جاوید ہے. علم جاہ و جلال کو پہنچاتا ہے اور پوری محفل کو فریفتہ کرلیتا ہے. علم وہ آنکھ ہے جو سب سے بالا ہے. علم ہی ہم کو دنیا میں زندہ رکھتا ہے. علم کے بغیر انسان وحشی جانور کے برابر ہوتا ہے. [ہتوپدیش]

۲ کہتے ہیں کہ سب دولتوں میں علم بڑا ہوتا ہے کیونکہ نہ کوئی اس کو کسی دوسرے سے چھین سکتا ہے نہ خرید سکتا ہے اور پھر وہ لازوال ہوتا ہے. [ہتوپدیش]

۳ دانائی اور بادشاہی کبھی برابر نہیں ہوسکتی بادشاہ کی حرمت اسی کے ملک میں ہوتی ہے اور دانا کی حرمت ہر جگہ. [ہتوپدیش]

۴ تعلیمیافتہ آدمی میں سب اوصاف پائے جاتے ہیں اور جاہل میں عیب ہی عیب ہوتے ہیں پس ایک تعلیمیافتہ کڑوڑوں جاہلوں سے بہتر ہوتا ہے. [ہتوپدیش]

۵ انسان جب تک خوش خوش دنیا کی گردش نہ کرے اور ملک ملک نہ پھرے تب تک پوری طرح سے نہ علم حاصل کرسکتا ہے نہ دولت نہ ہنر. [پنچ تنتر]

۶ علم سے عقل بہتر ہے. عقل کو علم پر فوقیت ہے جس میں عقل مفقود ہوتی ہے وہ ہلاک ہوجاتا ہے. [پنچ تنتر]

۷ جو کوئی خلقتاً عقل سے مبرا ہو اس کو کتابوں کے مطالعہ سے کیا فائدہ ہے جس کی دونوں آنکھیں جاتی رہی ہوں اس کے لئے آئنہ کس مصرف کا. [ہتوپدیش]

۸ تیر انداز کی کمان سے جو تیر نکلتا ہے وہ یا تو ایک فرد بشر کو ہلاک کرتا ہے یا خالی جاتا ہے مگر جب دانشور کی دانشمندی پرواز کرتی ہے تو ایک پورے ملک اور ملک کے مالک کو خاک کردیتی ہے ۔ [پنچ تنتر]

۹ افلاس کی سب سے بڑی قسم وہ ہے جس میں علم کا قحط ہو ۔
[پنچ تنتر]

۱۰ جاہل پر روز ہزار قسم کی مصیبت کا ہجوم رہتا ہے اور خوف کی سو باتوں کا اس پر حملہ ہوتا ہے مگر عالم کی یہ حالت نہیں ہوتی ۔
[ہتوپدیش]

۱۱ محفل میں جاہل کی چمک دمک صرف اس کے لباس کی بدولت ہوتی ہے جاہل کی نمود اسی وقت تک باقی رہتی ہے جب تک وہ سکوت اختیار کرے اور زبان نہ کھولے ۔ [ہتوپدیش]

۱۲ با لیاقت اکلوتا بیٹا سینکڑوں جاہل بیٹوں سے بہتر ہوتا ہے ۔ چاند اکیلا اندھیارا دور کرنے کو بس ہے ۔ پھر یہ کام بے شمار ستاروں کی جمگھٹ سے نہیں ہوتا ۔ [ہتوپدیش]

۱۳ جن آدمیوں میں اوصاف ہوتے ہیں وہ اپنی لیاقت کے زور سے اقبال کے اوج کو پہونچ جاتے ہیں ۔ ان کے خاندان کو کون پوچھتا ہے ؟

لیکن اقوال بالا علم و فراست کی پوری پوری حمایت کرتے ہیں اور یہ ثابت کرتے ہیں کہ عالم « آنکھ والا » اور جاہل « اندھا » ہوتا ہے ۔ اگر علم و فراست ایک جا جمع ہوجائیں تو پھر روشنی ہی روشنی ہے ۔ عالم کو ظاہری شان و شوکت اور بے جا چمک دمک کی ضرورت نہیں ہے بلکہ وہ اپنے علم کی روشنی سے محفل پر چھا جاتا ہے اور وقت پڑے اپنی دانشمندی سے کمال اوج حاصل کرسکتا ہے ۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ ایک چاند ہزاروں ستاروں سے بہتر ہے جو اپنی روشنی سے دنیا کی تاریکی کو دور کرسکتا ہے ۔ عالموں نے آنے والی نسلوں کے لئے ایسا ذخیرہ چھوڑا جو کبھی فنا نہیں ہوسکتا بلکہ اس کی اولاد اس ورثے میں اضافہ ہی کرتی ہے ۔

عالم کے لئے نسل و خاندان کے بھی اچھے ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی. اس کا علم اس کی طاقت ہے جو ہر چیز پر فوقیت لے جاتا ہے.

بھارت کے حکماء کے نزدیک علم کے بعد دولت کا درجہ ہے لیکن تقسیم دولت کے فلسفہ میں ان کے پاس افرط و تفریط ہے. دولت کمانا ان کے نزدیک زندگی کا اہم مقصد ہے لیکن ذات پات کی تقسیم نے غریب اور امیر کے درمیان بڑی گہری اور عمیق خلیج حائل کردی ہے، ایک طرف دولت مندوں کا خاص گروہ ہے تو دوسری طرف غریب و مفلس کا انبوہ کثیر. مذہب نے بھی کچھ اس قسم کا جواز دے رکھا تھا کہ غریب، غریب رہے اور امیر، امیر رہے. دونوں کے درمیان کی دوری کو باٹنے کی کوشش نہیں کی گئی بلکہ انسان، انسان میں فرق رکھنے کی کوشش کی گئی ہے جس کی وجہ سے بھارت سونے کی چڑیا ہونے کے باوجود بھی غریبوں کا ملک رہا. حالانکہ اس بات پر اہمیت دیگئی ہے کہ اس دنیا میں جس کے پاس دولت نہ ہو تو وہ فقط نام کا انسان ہے اور اگر بوڑھے کے پاس دولت موجود ہو تو وہ جوان ہے. لیکن دولت کی مساوی تقسیم پر زور نہیں بلکہ اس کا انحصار ذاتی سعی پر رکھا گیا اور پس منظر میں ذات پات کی تقسیم اس عمل میں حائل رہی. نمونے درج ہیں

دولت اور افلاس

۱ « بعض ہوشمندوں کا قول ہے کہ سب سے بڑی نعمت نیک خصلتی اور دولت ہے. بعض کہتے ہیں عیش اور دولت، بعضوں کے نزدیک فقط نیک خصلتی اور اوروں کی رائے میں صرف دولت ہی نعمت عظمیٰ ہے مگر سچی دولت ان تینوں کے اکٹھا کرنے سے حاصل ہوتی ہے. » [منوشاستر]

۲ « لوگ دولت کے حصول میں کوئی بات اٹھا نہیں رکھتے پس ہوشمند کو لازم ہے کہ بجز دولت حاصل کرنے کے اور کسی کام میں اپنی کوششوں کو صرف نہ کرے. » [پنچ تنتر]

۳ « جو امیر ہے اس کے دوست احباب ہوتے ہیں، جو امیر ہے اس کے عزیز و اقارب ہوتے ہیں جو امیر ہے وہ اس دنیا میں ایک شخص ہوتا ہے، جو امیر ہے وہ درحقیقت زندگی بسر کرتا ہے. » [پنچ تنتر]

۴ «اس دنیا میں امیروں کے واسطے دشمن بھی عزیز بن جاتا ہے۔ غریبوں کے لئے عزیز بھی فوراً دشمن بن جاتا ہے۔» [پنچ تنتر]

۵ «جو حرمت کا اہل نہ ہو اس کی حرمت کی جائے جس سے کوسوں بھاگنا چاہئے اس کے سب طلب گار ہوں. جس کو تعریف کا کچھ بھی حق نہ ہو اس کا لوگ ڈنکا بجائیں. اس کو کہتے ہیں دولت کا زور۔» [پنچ تنتر]

۶ بڈھے کے پاس اگر دولت ہو تو وہ جوان ہے اور نادار عین عالم شباب میں بڈھا ہے۔» [پنچ تنتر]

۷ «اس دنیا میں جس کے پاس دولت نہ ہو وہ فقط نام کا انسان ہوتا ہے۔» [پنچ تنتر]

۸ «جب آدمی کی دولت جاتی رہتی ہے تو اس کی آبرو آن بان حسن و جمال ذہانت سب دفعتاً غائب ہوجاتی ہیں یہ کہنا بے سود ہے کہ حواس خمسہ برابر بے نقص رہتے ہیں یہ فقط کہاوت ہے یا یہ کہ عقل برابر سالم رہتی ہے۔ یہ بھی کہنے کی بات ہے۔ جس آدمی کی دولت جاتی رہتی ہے وہ گھڑی میں کچھ کا کچھ ہوتا ہے۔» [ہتوپدیش]

۹ «انسان کے لئے افلاس نیستی مجسم ہے اور قبائح کا مسکن غرض کہ ایک قسم کی موت ہے۔» [پنچ تنتر]

۱۰ «کبھی کبھی مٹی بھی کام آتی ہے بشرطیکہ خالص ہو۔ پر اس دنیا میں مفلس آدمی کسی مصرف کا نہیں ہوتا۔» [پنچ تنتر]

۱۱ «افلاس سے ہمیشہ ڈرنا چاہئے کیونکہ مفلس کے لئے کچھ نہیں ہوتا غریب اگر احسان کرنے کو بھی آئے تو لوگ اس کو کتے کے برابر سمجھتے ہیں۔» [پنچ تنتر]

۱۱ نیک آدمی اگر افلاس میں مبتلا ہو تو اس کے اوصاف حمیدہ چمکنے نہیں پاتے۔ دولت ذاتی جوہر کو ایسا روشن کردیتی ہے جیسا آفتاب کائنات کو۔» [پنچ تنتر]

۱۳ «انسان کیسا ہی تیز فہم کیوں نہ ہو کھانے کپڑے کی روز مرہ کی فکر اس کی عقل کو فنا کردیتی ہے۔» [پنچ تنتر]

۱۴ «مکان کیسا بھی خوشنما کیوں نہ ہو افلاس اس کو بے رونق کردیتا ہے جیسے

تاروں بن آسمان، پانی بن تالاب یا جیسے کوئی مہیب گورستان.» [پنچ تنتر]

۱۵ «جب افلاس آتا ہے تو آدمی خفیف ہوجاتا ہے اور جب خفیف ہوگیا تو وہ ایماندار نہیں رہتا اور جہاں کہیں ایمانداری کی گئی تو وہ حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور جب اس کی حقارت ہونے لگی تو وہ ہمت ہار جاتا ہے اور ہمت ہار نے کے بعد آتی ہے مایوسی. اور جب مایوسی اس پر غالب ہوگئی تو اس کی عقل سلب ہوجاتی ہے اور جب عقل سلب ہوگئی تو وہ سیدھا تباہی کی راہ لیتا ہے. ہائے رے افلاس! تو سب قباحتوں کا سرچشمہ ہے.» [ہتوپدیش]

۱۶ «دانشمند آدمی موت کا گلہ نہیں کرتا لیکن افلاس سے کبھی راضی نہیں ہوتا ہے آگ بجھ جاتی ہے پر ٹھنڈی نہیں ہوتی.» [ہتوپدیش]

۱۷ «کہتے ہیں کہ افلاس کو موت پر ترجیح دینا چاہیئے. موت سے تھوڑی سی تکلیف ہوتی ہے پر افلاس ایک ایسا عذاب ہے جس کی برداشت نہیں ہوسکتی.» [ہتوپدیش]

۱۸ «زندگی اس وقت تک سودمند ہے جب تک اس کے ساتھ استغنا بھی ہو جس کا گذارا دوسروں پر ہو اس کے لئے زندگی اگر موت نہیں ہے تو کیا ہے.» [ہتوپدیش]

۱۹ «جو عروج غلامی سے حاصل ہو اس سے بہتر ہے جنگل کی گشت اس سے بہتر ہے گداگری اس سے بہتر ہے بوجھا اٹھانا اس سے بہتر ہے آدمی کا بیمار ہوجانا.» [پنچ تنتر]

لیکن دنیا میں دولت، روپیہ پیسہ سب کچھ ہونے کے باوجود بھی سب کچھ نہیں. دولت فرد کی شخصیت کو ابھار سکتی ہے اس کی ظاہری شان و شوکت کو بڑھا سکتی ہے اس کے عیش و آرام کے سامان کو مہیا کر سکتی ہے لیکن اس کے اندرونی صلاحیتوں کو گٹھا دیتی ہے اور اس کے زندگی کے توازن کو بگاڑ دیتی ھے. دنیا میں شاذ و نادر لوگ ایسے ہیں جو باوجود دولت مند ہونے کے حلم، انکساری، تواضع، دانشمندی، علم و تدبر کو وضعداری بنائے رکھتے ہیں اور انسانی اعلیٰ صفات کا دامن نہیں چھوڑتے، بالعموم دولت انسان کو غلط راستہ پر ڈال دیتی ہے اور وہ اپنی ھستی کو ابھارنے سے معذور ہوجاتا ہے. اسی لئے دولت

کو جو اہمیت دی گئی ہے وہ برقرار نہیں رہتی بلکہ اپنا وزن کھو دیتی ہے. گو دولت ایک طاقت ہے لیکن سب سے بڑی طاقت نہیں. حضرت سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے:

اے زر تو خدا نہ ای و لیکن بخدا ستار عیوب و قاضی الحاجاتی

اس شعر سے یہ مطلب واضح ہوتا ہے کہ دولت میں یہ طاقت ہے کہ وہ انسان کو خدا کے درجے تک لے جاسکتی ہے لیکن یہی وہ مقام ہے جہاں جاکر انسان قعر مذلت میں گرجاتا ہے جہاں دولت انسان کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے اور صرف اس کا حسن عمل باقی رہتا ہے.

انسان کی زندگی ایک آزمائش ہے، اس امتحان میں پورا اترنا ایک کٹھن کام ہے کیونکہ دنیا «خیر و شر» کی کشمکش کا ایک مرقع ہے. معمولی کاموں سے لے کر بڑے کاموں تک اسے مختلف قوتیں متاثر کرتی رہتی ہیں. قدم قدم پر مشکلات اس کی راہ تکتی ہیں اور اس کشمکش میں اس کے لئے دو چیزیں بہت مشکل بن جاتی ہیں ایک مختلف پگڈنڈیوں میں سے سیدھا راستہ اختیار کرنا اور دوسرے اپنے ارادے پر ثابت قدمی کا ثبوت دینا. یہ دو مشکلات ایسی ہیں جو انسان کو بوکھلا دیتی ہیں اور وہ مختلف الجھنوں میں گرفتار ہوجاتا ہے. اسی لئے ہر مذہب و ملت کے اکابرین نے عملی زندگی میں «مکارم اخلاق» کی زندہ مثالیں پیش کی ہیں تاکہ انسان کے رفتار و کردار میں ایک توازن پایا جائے اور اس کی زندگی یک رخی راستہ اختیار نہ کرے. پھر غصہ، حسد، تعصب، جھوٹ، برائی اول غلطیوں سے بچے اور دوسرے انسان کو انسان سمجھے اور اس کی حق تلفی نہ کرے. ذیل کے اقوال زندگی کی راہوں کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں لیکن ان امثال میں دنیا سازی کا بھی جواز شامل ہے.

چال و چلن

۱ اخلاق کے اصول عامہ کی اس بات کو کان لگا کر سنو، یہ نیکی کا جوہر ہے اور جب سن لو تو اس پر غور کرو. یعنی جو چیز اپنے کو آزار پہونچائے اس کا عمل دوسرے پر نہ ہونے دو. [پنچ تنتر]

۲ جس کے دل میں ایمان ہوتا ہے وہ دوسرے کی عورت کو ماں کے برابر

سمجھتا ہے اور دوسرے کے مال کو ڈھلیے کے برابر اور کل کائنات کو اپنے برابر۔ [پنچ تنتر]

۳ دوسروں کو خوش اخلاقی کا وعظ دنیا ایک انسانیت ہے کہ اس کو ہر شخص بہ آسانی حاصل کرسکتا ہے مگر خود صلاح کاری کو عمل میں لانا ایک ایسی بات ہے جو فقط برگزیدہ ارواح سے ہوسکتی ہے [ہتوپدیش]

۴ بعضوں کی رائے میں علقمندی لفظوں ہی میں ہوتی جیسے طوطے کی عقلمندی بعضوں کے نزدیک دل میں جیسے گونگے کی اوروں کے قول کے مطابق دل میں اور لفظوں میں برابر برابر ہوتی ہے۔ [پنچ تنتر]

۵ انسان اگر سو کوس کی مسافت بھی طے کرلے تو اس کے برے اعمال اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ یہی حال فیاض آدمی کے اعمال کا بھی ہوتا ہے۔ [پنچ تنتر]

۶ ہر ایک حرکت جو انسان کے خیال سے یا قول سے یا فعل صادر ہوتی ہے اسکا ثمرہ یا اچھا ہوتا ہے یا برا اور یہ اس پر موقوف ہے کہ خود وہ حرکت اچھی ہے یا بری۔ انسان کی ہر ایک حالت اس کے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے۔ [منوشاستر]

۷ خلوص قلب، ہوائے نفسانی پر قابو، نفس کشی اور ریاضت، داد و دہش، دوسروں کی ضرر رسانی سے اجتناب، قرض کا ہمیشہ ادا کرنا، ان ہی باتوں سے ہماری قدر ہوتی۔ ذات اور اصلیت کی کم کوئی پرواہ کرتا ہے۔ [مہا بھارت]

۸ جو کودو کنگنی بوئے گا وہ کودو کنگنی کاٹے گا جو بدی کا پودا لگائے گا۔ وہ بدی پھل پائیگا۔ [تامل مثل]

۹ انسان کی بد اطواری ایک ایسا درخت ہے جس کے پھل بیماری، رنج و الم سوختہ دلی اور مصیبت ہوا کرتے ہیں۔ [ہتوپدیش]

۱۰ سانپ اور بد نفس آدمی اور جو دوسروں کا مال چراتے ہیں ان کی بندشیں اور منصوبے پورے نہیں ہوتے یہی وجہ ہے کہ دنیا کا وجود اب تک باقی ہے۔

لیکن مندرجہ بالا اقوال زندگی کے طویل گزرگاہ پر چلنے میں سہارے کا کام کرتے ہیں کیونکہ انسان فرشتہ تو نہیں اس لئے دنیاداری اور دنیا سازی اس کی ضرورت بن جاتی ہے ۔ اس عمل میں بعض دفعہ اسے « خیر و شر » دونوں کا سہارا لینا پڑتا ہے ۔ اعمال زندگی میں انسان کو اچھائی و برائی دونوں سے سابقہ پڑتا ہے اور یہ دونوں ستون انسان کا کردار بناتے ہیں اور اس کے چال چلن کی راہیں متعین کرتے ہیں ۔ ان امثال و اقوال میں انسانی الجھنوں کو سلجھانے کی بڑی طاقت ہے وہ ایک طرح سے رہنمائی کا کام کرتے ہیں اور عقلمندوں کے لئے اشارہ بن جاتے ہیں ۔

(باقی آئندہ)

عمدۂ منتخبہ

یعنی

تذکرۂ سَرور

اردو کے ۹۹۶ شاعروں کا ایک نایاب تذکرہ جو سنہ ۱۸۰۹ع
میں مرتب ہوا

تالیف : نواب اعظم الدولہ میر محمد خاں بہادر سرور

مرتبہ : ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی

جسے شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی نے بڑے اہتمام کے ساتھ نہایت
خوب صورت ٹائپ میں شائع کیا ہے

صفحات : ۸۳۶ قیمت (مجلد) : بیس روپئے علاوہ محصول ڈاک

ملنے کا پتہ : ادبی پبلشرس

۸ شیفرڈ روڈ بمبئی ۸

نثار احمد فاروقی*

مولانا فضل حق خیرآبادی کا ایک غیر مطبوعہ خط

مجھے ایک قدیم قلمی بیاض میں مولانا فضل حق خیرآبادی ۱۲۷۸ھ ـ ۱۲۱۲ھ کا ایک غیر مطبوعہ خط ملا ہے، اس کی اہمیت صرف یہی نہیں کہ اس کا کاتب ایک اہم علمی و ادبی شخصیت ہے۔ بلکہ اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بھی بہت قابل غور و فکر ہے۔ انیسویں صدی کی اقتصادی حالت اور معاشی زبوں حالی کا جو نقشہ اس میں پیش کیا گیا ہے وہ اس سلسلے کی ایک کڑی ہے جو ۱۸۵۷ع کی شورش پر ختم ہوتا ہے۔ اٹھارہ سو ستاون کا ہنگامہ ہندوستان کی تاریخ کا سب سے اہم سانحہ ہے اور اس کے بارے میں مورخوں کی مختلف رائیں ہیں۔ کوئی اسے محض «فوجی بغاوت» کہتا ہے، کسی کو اس کی پشت پر گہری سازش نظر آتی ہے، کوئی اسے بے سوچے سمجھے ہنگامے سے تعبیر کرتا ہے تو کسی نے اسے طے شدہ اور منظم قومی تحریک قرار دیا ہے، لطف یہ کہ ہر مورخ کے پاس قوی دلائل بھی موجود ہیں۔

مولانا فضل حق خیرآبادی کے اس خط سے یہ ضرور معلوم ہوجاتا ہے کہ اس زمانے میں علماء کا طبقہ اقتصادی معاملات میں کس انداز سے سوچتا تھا اور کمپنی کی معاشی پالسی کا اثر ہندوستان کی عوام پر کیا پڑ رہا تھا جس نے رفتہ رفتہ انھیں انگریزوں کی حکومت سے اتنا بیزار اور متنفر کردیا کہ وہ یک لخت بغاوت پر آمادہ ہوگئے۔

یہ خط کس کے نام لکھا گیا ہے اس کا پتہ نہیں چلتا، عنوان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مکتوب الیہ آخری مغل بادشاہ سراج الدین ظفر ہے۔ یہ خط مکمل بھی نہیں ہے اچانک تمام ہوجاتا ہے اس لئے سال کتابت کا تعین بھی دشوار ہے۔ اس خط میں مولانا فضل حق خیرآبادی نے «حضرت جہاں پناہ» کی توجہ اس امر کی طرف

* نثار احمد فاروقی، شعبۂ علوم مشرقی، دہلی یونی ورسٹی، (دہلی)۔

مبذول کرائی ہے کہ اس ملک کے باشندے خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، ان میں کچھ کسان اور کاشتکار ہیں کچھ روزگار پیشہ، کچھ تاجر اور اہل حرفہ، کچھ لوگ لاخراجدار اور روزینہ دار ہیں، کچھ کی معاش محض دریوزہ گری پر ہے. یہاں کے باشندے مسلمان بیشتر اور ہندو کمتر ایسے ہیں جو اپنا اصلی وطن ترک کرکے کسی زمانے میں یہاں آکر آباد ہوئے. جب تک ہندوستان کی حکومت بادشاہوں اور راجاؤں کے تصرف میں رہی، اس ملک کے باشندوں کو معیشت کی کوئی تنگی نہ تھی کیوں کہ ہر قسم کی سرکاری خدمات خواہ وہ سپاہ کی نوکری ہو یا دوسری خدمات اسی ملک کے باشندوں کے واسطے مختص تھیں اور یہاں کے باشندوں میں ہر شخص اپنے حوصلے اور لیاقت کے موافق تجارت، حرفہ، سپاہ یا مناصب میں اپنا روزگار پالیتا تھا. مگر جب سے انگریزوں کی عملداری ہوئی ہے، اس وقت سے بتدریج معاش کی تنگی اور روزگار کا فقدان اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ عوام کی حالت تباہ ہوگئی ہے. کیوں کہ انگریز سرکار کے زمانے میں معاش کے سارے وسائل مفقود ہیں اور روزگار کے دروازے بند ہوگئے ہیں، سوائے معدودے چند لوگوں کے جنہیں عدالت دیوانی، کلکٹری، فوجداری پرمٹ، تھانہ، یا تحصیل کے عملے میں معمولی سی تنخواہ کی نوکری مل جاتی ہے، وہ بھی اب دفتروں کے تبدیل ہونے اور سرکاری کام کا ڈھانچہ بدل جانے کے بعد ایسا نظر آرہا ہے کہ ان لوگوں سے چھن جائیگی. چنانچہ اس شہر کے باشندوں کا حال اور یہاں کے تاجروں کی کیفیت یہ ہے کہ سرکار انگریز نے تجارت کے سارے گرُ اپنے قبضے میں رکھے ہیں، اور تمام اجناس مثلاً کپڑا، سوت، برتن، گھوڑے اور دوسرے مویشی وغیرہ ملک انگلستان سے لاتے ہیں اور اس ملک کے ہر ہر شہر اور گاؤں میں فروخت کرکے خود نفع کماتے ہیں اور یہاں کے باشندوں کو نفع اندوزی کا کوئی موقع نہیں دیتے اس لئے ہمارے ملک کے تاجر اپنے پیشوں سے دست بردار ہوگئے ہیں.

اور معافی داروں کا حال یہ ہے کہ سنہ ۱۸۰۳ع اور ۱۸۰۵ع کے قوانین کی رو سے اگرچہ انگریز سرکار نے عہد و پیمان کئے تھے کہ ساری لاخراجی زمینیں جو یکم جنوری سنہ ۱۸۰۱ع اور یکم جنوری سنہ ۱۸۰۳ع سے پہلے لاخراجی دار کے تصرف میں ہوں گی، چاہے وہ ان کی سند رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو اور

خواہ ان کے واہب کو عطا کا اختیار ہو یا نہ ہو ایسی زمینوں کو ضبط نہ کیا جائیگا. مگر اب بغیر کسی تحقیقات کے ہر ضلع میں معافیاں ضبط کرلی گئیں ہیں اور معافی داروں کے لئے کوئی وجہ معاش باقی نہیں چھوڑی، اور کسانوں کا حال یہ ہے کہ ان پر اِتنے محاصل واجب کردیئے گئے ہیں کہ ان میں ادا کرنے کی سکت نہیں ہے، ان کی بے استطاعتی اور بے مقدوری خود دفتر کلکٹری کے ریکارڈ سے ظاہر ہوجاتی ہے. پس جب کسی کے لئے اس ملک میں روزگار باقی نہ رہا تو اب اہل حرفہ کس کے لئے کام کریں جو ان کا پیٹ بھرے؟ اور جب سارے ہی لوگ تنگی معاش میں مبتلا ہوں تو بھک منگے کو کون خیرات دے؟ یہ مختصر سی کیفیت رعایائے ہندوستان کی معاشی تنگی کی ہے اور علاقہ شاہجہاں آباد کی رعایا کا اقتصادی حال بطور اجمال یہ ہے کہ ابتدائے عمل سرکار انگریزی میں ہوڈل و پلول و بتین و نجف گڑھ و سالکہ و فیروزآباد و ڈیگ و لبوناہانا و سانگرس و بجنور و سونی پت و گوہانہ و جرسٹھ و کھرکھودہ و روہتک و مہم و ہانسی و حصار یہ سارے پرگنے جاگیر میں تھے اور جاگیرداروں کی سرکار میں ہزارہا آدمی فوج، انتظامیہ، اور شاگرد پیشہ کی خدمات پر مامور تھے. ان میں اکثر دیہات معافی کے تھے اب یہ سب پرگنے اور دیہات و اراضیات سرکار انگریز نے ضبط کرلیں اور لاکھوں کسان یک لخت بے روزگار ہوگئے اور تمام عالم میں روزگار عنقا کی طرح ناپید ہوگیا، سیکڑوں بیوائیں اور محتاج اپنی روزی کا دار و مدار چرخہ کاتنے رسّیاں بٹنے، یا چکی پیسنے پر موقوف کئے ہوئے تھے، اب ریسمان کی تجارت سرکار نے اپنے ہاتھ میں لے لی ہے اور ہاتھ کی چکیوں کی جگہ پن چکیاں لگ گئی ہیں تو یہ ذریعہ معاش بھی جاتا رہا، اسی طرح اہل حرفہ اور ساہوکار عوام کی بے بضاعتی کے باعث نفع اندوزی سے محروم ہوگئے اور جو کچھ سرمایا انکے پاس تھا کھا پی کر برابر کردیا اور اپنے دوالے نکال دئے.

ان ساری دشواریوں کے باوجود سر چارلس مٹکاف بہادر کی پیشی سے حکم ہوا کہ ہم غریب «زر چوکیداری» ادا کریں، اگرچہ کبھی سلاطین کے زمانے میں یہ رسم نہیں رہی مگر حکم حاکم مرگ مفاجات سمجھ کر اسے بھی قبول کیا اور اب تک ادا کرتے رہے، اب ڈسٹرک مجسٹریٹ کا نیا حکم آیا ہے جس میں انہوں نے ہر گلی کوچہ میں پھاٹک تعمیر کرنے کا حکم دیا ہے، جن کا

فائدہ نہ پہلے کچھ تھا نہ آئندہ ہوسکتا ہے۔ ہم غریبوں نے فاقہ کشی کی مصیبت جھیل کر، سامان گروی رکھ کر یا بیچ کھوچ کر، ہزارہا روپیہ خرچ کیا اور اس حکم کی تعمیل بھی کردی۔ اب ان نو تعمیر پھاٹکوں کے کھلنے اور بند ہونے کے اوقات یا چوکیدار کے تساہل سے ہم لوگوں کو آئے دن تکالیف کا سامنا ہے مگر اسے بھی جھیل لیا، اس خبر کے علاوہ اب صاحب مجسٹریٹ بہادر نے ہر محلہ میں پانچ پانچ بچوں کے مقرر کرنے کا حکم دیا ہے۔

بس یہاں یہ عرضی ختم ہوجاتی ہے اگر اس کا پورا متن دستیاب ہوجاتا تو یقیناً نہایت اہم چیز ہوتی۔ اب بھی اس خط سے جو باتیں معلوم ہوتی ہیں وہ نہ صرف انیسویں صدی کی معاشرت اور اقتصادی حالات پر کام کرنے والے محقق کے لئے معلومات افروز ہیں بلکہ ان سے اس ذہن کا بھی اندازہ ہوتا ہے جو ۱۸۵۷ع کی بغاوت کے پیچھے کام کررہا تھا۔

جس بیاض سے یہ خط نقل کیا گیا ہے، نظاہر بظاہر وہ «غدر» سے پہلے کی لکھی ہوئی ہے، اس کے جامع کا نام معلوم نہیں، لیکن اس نے بہت سے نثر نگاروں کی نثر کے نمونے جمع کئے ہیں، ان میں بیشتر غیر مطبوعہ اور اہم ہیں یہاں صرف مولوی فضل حق خیرآبادی کا مکتوب نقل کیا گیا ہے، باقی اہم تحریریں کسی اور موقع پر پیش کی جائیں گی، مولانا خیرآبادی مرحوم کے اس خط کا مکمل متن درج ذیل ہے، کہیں کہیں میں نے قیاسی تصحیح کی ہے، پھر بھی ایک آدھ لفظ سمجھ میں نہیں آیا تو اسے ویسے ہی چھوڑ دیا ہے

(۲)

عرضی رقم زدۂ مولوی فضل حق صاحب، از طرف رعایائے شہر، در باب امتناع ٹکس وغیرہ*

حضرت جہاں پناہ خلد اللہ ملکہٗ وسلطانہٗ بعرض اقدس واعلیٰ (می رساند) بر رائے جہاں آرائے اقدس روشن و مُبرھن است کہ رعایائے ایں ملک، چہ ھنود و

* جس بیاض سے یہ خط نقل کیا گیا ہے وہ راقم الحروف کے ذخیرۂ ذاتی سے تعلق رکھتی ہے۔

چه مسلمان، برخے ازاں ها مزارعاں و کشاورزاں و اکثر روزگار پیشه و بعض ازاں ها تجّار و اکثرے اهل حرفه و بعض لاخراج دار و روزینه دار و بعض دریوزه گر بوده اند. و اکثرے از اهل اسلام و بعض هنود اصل متوطن ایں جانیستند بلکه به همراهئ حکام و سلاطین ترک اوطان خود ها (کرده) دریں (جا) توطن گزیده اند. تا وقتیکه مملکت هندوستان بقبض و تصرّفِ سلاطین و راجگان بود وجه معیشت سکان ایں دیار هیچ گونه تنگی نکرده بود، که همگی وجوه معاش که خدمات عمده وجه روزگار سپاه، صرف بسکنۀ ایں دیار اختصاص داشت. هرکس از سکنۀ همیں ملک بقدر حوصلۀ و فراخور لیاقت خود روزگارے در اهل مناصب یا در زمرۀ سپاه، یا در پیشۀ تجارت یا در حرفه میداشت. از زمانے که عملداریٔ سرکار انگریزی در مملکت هندستان رسیده است، بتدریج تنگی روزی و ضیق معاشی رفته رفته الحال بحدے رسیده است که نوبت بجان و کارد باستخوان رسیده، زیراکه در سرکار انگریزی همگی وجوه معاش مفقود و ابواب روزی مسدود شده اند بجز معدودے چند، یعنی چند کس در عملۀ عدالت دیوانی و کلکٹری و فوجداری و پرمٹ و تهانه و تحصیل بمشاهرۀ قلیل ملازم اند، و پس از تبدیل دفاتر و تغیّر طرز نوشت و خواند کچهری ها، چناں تخیل می گردد که در چندے ایں روزگار هم نصیب ایں بےچارگان نخواهد ماند. ایں است حال تنگی معاش روزگار سکان ایں دیار.
و حال تجار اینست که سرکار انگریزی همه وجوه تجارت خود اختیار نموده، و همگی اجناس از قسم پارچه و ریسمان و ظرف و اسپان وغیره دوّاب، خود از ملک انگلستان وغیره بهم رسانیده، در ایں ملک برائے فروش علی التواتر در هر قریه و بلده از بلاد ایں ملک می آرد، و منفعتے برائے کسی از سکنۀ ایں دیار نمی گزارد. ازیں جهت همه تجار ایں دیار از پیشۀ خود دست بردار شدند، و حال لاخراجیداراں اینست که همه لاخراجی باوجود ایں که در قوانین سنه ۱۸۰۳ع و سنه ۱۸۰۵ع اهالی سرکار انگریزی عهد و میثاق نوشته اند که هر اراضئ لاخراجی که پیش از غرۀ جنوری سنه ۱۸۰۱ع وغرۀ جنوری سنه ۱۸۰۳ع بقبض و تصرف لاخراجیدار خواهد بود، گو، سند باشد یا نه، یا واهب آں اختیار عطا داشته باشد یا نه، گاهے بضبطی نه خواهد آمد. الحال بلا هیچک تحقیقات و بلا تامل در هر یک ضلع ضبط شده می شود. حالا از وجه معیشت لاخراجیداراں بالمره مسدود شده است و روزیکه یک قلم در همه اضلاع

موقوف شده است این وجه معیشت هم باقی نمانده، و حال مزارعان و کشاورزان اینست که بر آن ها آن چنان جمع خراج مقرر شده است که دران حالتے و استطاعتے باقی نمانده است، و حال بے استطاعتی و بے مقدوریٔ آنها خود از دفاتر کلکٹری ظاهر. و هر گاهیکه برائے این همه سکان این دیار وجه معیشت باقی نماند اهل حرفه چه کار برائے کدام کس توانند که بذریعه آن برائے خود کسب معیشت توانند نمود. هر گاهیکهٔ همگی خلائق از معیشت خود تنگ باشد بدریوزه گر کدام کس تواند داد؟ این همه حالات اجمالی تنگی معاش جمله رعایاے هندوستان است، و حال تنگیٔ معاش رعایاے علاقهٔ شاهجهان آباد مجملاً اینست که در ابتداے عمل سرکار انگریزی پرگنه هوڈل و پلول و بیتن و نجف گڈھ و سالکه و فیروز آباد و ڈیگ و پوناهانه و سانگرس و بجنور و سونی پت و گوهانه و جرسٹه و کهرکهوده و روهتک و مهم و هانسی و حصار وغیره پرگنات در جاگیر بودند و در سرکارات جاگیرداران این همه پرگنات هزارها کسان در هر کار و در فوج و شاگرد پیشه ملازم بودند، و اکثر دیهات در و بست و اراضیات لاخراجی متصرفه در معافی بودند، این همه پرگنه و دیهات و اراضیات بحیطهٔ ضبطی در آمدند، و معیشت لکوک کسان بالمرّه موقوف شده. حالا در تمام عالم روزگار همچو عنقا ناپدید است، و بیوه ها و بیچارگان از مسدودیٔ روزینه و ضبطیٔ املاک مدار بر سربرد اوقات خود ها بر چرخه زنی و ریسمان فروشی و آسیا سائی می داشتند بسبب اینکه سرکار تجارت ریسمان اختیار کرده، و آسیاهاے آبی نصب نموده است، این وجه معیشت آنها بالمرّه مسدود گردید، و هم چنین اهل حرفه و دکانداران و ساهوکاران (به) بے بضاعتی خلائق از انتفاع مایوس گشته سرمایهٔ که داشتند بصرف خور و نوش در آورده دواله ها بر آورده اند. باین همه تنگی ها از مدش سر چارک مٹکاف صاحب بهادر مصادرهٔ اداے زر چوکیداری بر ما بے چارگان، چار و نا چار که «حکم حاکم مرگ مفاجات است» دادن مصادره با وصف آن که گاهے از عهد سلاطین و حکام سلف علت آن نداشتیم بذمهٔ خود نهاده تا حال کرده ماندیم. حالا چند روز است که صاحب مجسٹریٹ حال در هر کوچه و برزن و بازار به تعمیر پهاٹک هاے قدیم و جدید که هیچک فائده بر آن مترتب نیست و گاهے مترتب نه خواهد شد حکم دادند. ما غربا جبراً و کرهاً تکالیف فاقه کشی و بیع و رهن اسباب خور و نوش بر داشته

بصرف هزارها روپیه تعمیل حکم نمودیم و تکالیف هر روزه (که) از مسدود ماندن دروازه هاے نو تعمیر و اغماض چوکیداران هر یک محله، در بست و کشاد آں عاید حال مایان می شود، بر خود گوارا می نمائیم. الحال علاوه ازیں خبر، صاحب مجسٹریٹ حال حکم تقرر پنچ پنچ کس پنچاں در کوچه و محله ......»

(۳)

یہ عرضی اچانک یہاں ختم ہوجاتی ہے اور اس کے بعد مولوی امیر علی کا خط دربارۂ شطرنج شروع ہوجاتا ہے. مولانا فضل حق خیرآبادی کے اس مکتوب سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہد کے اقتصادی اور سیاسی رفتار پر پوری نظر رکھتے تھے اور مختلف طبقات کی معاشی زبوں حالی کا انہیں اندازہ تھا. اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ع کی شورش میں خواہ مولانا خیرآبادی نے کوئی عملی حصہ نہ لیا ہو، لیکن اصولی طور پر ان کی ہمدردیاں ضرور «باغیوں» کے ساتھ رہی ہوں گی. مولانا فضل حق پر بغاوت فرو ہونے کے بعد ۱۸۵۹ع میں مقدمہ چلایا گیا تھا جس کی پوری تفصیل نیشنل آرکائوز آف انڈیا کے ریکارڈ کی مدد سے جناب مالک رام لکھ چکے ہیں[۱]. انتظام اللہ شہابی وغیرہ نے مقدمہ بغاوت کے ضمن میں جو واقعات لکھے ہیں وہ محض بے اصل ہیں.

حضرت مولانا امتیاز علی عرشی رام پوری نے دارالانشاے رام پور میں محفوظ بعض دستاویزوں کی روشنی میں یہ ثابت کردیا تھا کہ مولانا فضل حق کی گرفتاری ایک دوسرے ملزم فضل حق شاہجہاں پوری سے التباس اسمی کے بنا پر ہوئی تھی[۲] اور وہ آخر تک اپنی صفائی میں کوشش کرتے رہے تا آں کہ نواب کلب علی خان آف رام پور کی سعی سے ان کی رہائی کا حکم ہوا، مگر ان کے صاحبزادے مولوی شمس الحق یہ پروانہ لے کر جب انڈمان پہنچے تو ایک دن قبل (۱۲ صفر سنہ ۱۲۷۸ھ) مولانا فضل حق کا انتقال ہوچکا تھا[۳].

---

۱ ملاحظہ ہو رسالہ تحریک دہلی جولائی سنہ ۱۹۶۰ع مضمون بعنوان «مولوی فضل حق خیرآبادی اور فتوای جہاد».

۲ ملاحظہ ہو ماہ نامہ تحریک دہلی ماہ اگست سنہ ۱۹۵۷ع.

۳ عبدالسلام ندوی: حکماے اسلام جلد دوم ۳۲۱ ـ ۳۲۴ (اعظم گڑھ ۱۹۵۶ع).

* ڈاکٹر حبیب النساء بیگم.

نسیم میسوری اور تذکرۂ ساقی

اردو زبان کی خدمت میں اردو کے بڑے بڑے مرکز دہلی، لکھنؤ، رامپور، اور حیدرآباد کی طرح میسور بھی پیش پیش رہا، اور اس دور دراز سرزمین میں بھی اردو زبان و ادب کے دہارے بہتے رہے، لیکن بد قسمتی سے کسی نے یہاں کے جواہر پاروں کو یکجا کرنے کی کوشش نہ کی جس کی وجہ سے ہمارے یہاں کے صدھا ادیب و شاعر آج تک ایسے ہی گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوے ہیں. البتہ گذشتہ چند سالوں سے متعدد مضامین یہاں کی ادبی خدمات کے متعلق شائع ہورہے ہیں اور علم و ادب کے وہ دفینے جو میسور اپنے سینے میں پوشیدہ رکھتا ہے ایک ایک کرکے منظر عام پر آرہے ہیں. میں نے اپنی کتاب « میسور میں اردو کی نشو و نما » میں یہاں کی ادبی ہستیوں کو متعارف کرانے اور ان کے ادبی کارناموں یکجا کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن اس کتاب کی تنگدامنی، جس میں صد ہا شعراء و ادبا کا ذکر کیا گیا ہے، کسی ایک ہستی پر وضاحتی مضمون لکھنے سے مانع ہوئی، لہذا میں نے مضمون ہذا میں میسور کے ایک مشہور معروف شاعر نسیم کی بعض ادبی صلاحیتوں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے جو ہنوز تشنۂ تحقیق نظر آئیں.

میسور میں اردو زبان کی داغ بیل سرکار خداداد سے صدہا سال پہلے بہمنی سلاطین کے دوران حکومت میں ہی پڑ چکی تھی. ریاست میسور کا بڑا حصہ عادل شاہی حکومت میں داخل تھا، اور بیجاپور کی طرح یہاں کے باشندے بھی گیسوئے اردو کے سنوارنے میں مصروف تھے. بیجاپور اور گولکنڈہ کی بساطِ سلطنت کے الٹ جانے کے بعد میسور، وہاں کے تباہ حال شعراء اور ادبا کا ملجا و ماوا بنا. حیدر علی اور ٹیپو سلطان کی مضبوط حکومت ان بکھری ہوئی صلاحیتوں کی

* ڈاکٹر حبیب النساء بیگم ایم. اے. پی. ایچ. ڈی. میسور یونی ورسٹی (میسور).

شیرازہ بندی کا باعث ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ہندوستان کے مختلف حصے یکے بعد دیگرے غیر اقوام کی مضبوط گرفت میں آرہے تھے اور ہندوستان، جس کی قسمت میں صد سالہ غلامی لکھی ہوئی تھی، خانہ جنگی میں گرفتار اپنا گھر آپ جلانے پر تلے ہوئے تھے۔ اس وقت جنوبی ہند کی اس چھوٹی سی ریاست میں شہر میسور آزادیٔ ہند کا علم تھامے اتفاق و اتحاد کی دعوت دیتا ہے، لیکن اس بھیانک سیاسی پس منظر کے باوجود سرکار خداداد نے اردو کی نشو و نما مین جو دلچسپی لی اور جو کارہائے نمایاں انجام دیئے وہ اردو کی تاریخ میں زرین حرفوں میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔ اگر حیدرآباد کی طرح یہاں بھی تحقیق و تلاش کا کام مخلصانہ اور بے لوث طریقے سے کیا جائے تو اردو ادب کی تاریخ میں کئی بیش بہا باتوں کا اضافہ ہوگا۔ سرکار خداداد کے عہد کے بعد بھی علم و ادب کے چشمے اسی طرح سے بہتے اور اپنی مدھر راگنیوں سے فضا کو معمور کرتے رہے۔ رسل و رسائل کی آسانیوں نے جب حد نظر کو وسیع کردیا اور شمالی و جنوبی ہندوستان قریب تر ہوگئے تو میسور کی ادب نواز ہستیوں نے دہلی اور لکھنؤ کی اردو دوستی اور خدمت کو اپنا شعار بنایا۔ اردو کا پہلا مطبع سنہ ۱۸۴۷ء میں فردوسی پریس کے نام سے قائم ہوا اور اس میں اردو کی متعدد کتابیں تصنیف و تالیف ہوتی رہیں۔ سنہ ۱۸۶۱ء میں اردو کا پہلا اخبار، بنگلور سے بنام «قاسم الاخبار» نکلا، اسکے بعد لوگوں کے ذوق و شوق کی وجہ سے متعدد مطبعے قائم ہونے لگے اور رسائل و اخبارات کی مانگ بڑھ گئی۔

یہ تھا وہ ماحول جس میں نسیم میسوری نے پرورش پائی، یہ دور میسور میں اردو کا عہد زریں کہلانے کا مستحق ہے، کیوں کہ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ یہاں کے بڑے بڑے علماء و فضلا، قلمے، درمے، سخنے، اردو زبان کی خدمت میں منہمک تھے، ان ہی با وقار ہستیوں کی پر خلوص خدمت کا نتیجہ تھا کہ اس دور دراز سرزمین میں بھی اردو کا طوطی بول رہا تھا، اس دور میں میسور کے دوسرے ارباب ذوق و خادمان اردو کے درمیان نسیم کی مسحور کن شخصیت ایک مشہور و معروف شاعر کی حیثیت سے ابھرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ریاست میسور کے اس مقبول خاص و عام شاعر پر متعدد مضامین لکھے جاچکے ہیں جن کا ماخذ عموماً محمد علی خاں میانہ کا تذکرہ نسیم خود نسیم ہی کا دیوان ہے جس کی داخلی شہادتیں

اس زمانے کی سماجی، ادبی اور سیاسی زندگی کی غمازی کرتی ہیں. مذکورہ بالا ماخذوں کے علاوہ ایک دو مضامین میں عبد الحمید خاں ساقی کے تذکرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کی عدم موجودگی کا ذکر کیا گیا ہے. مجھے یہاں کے ایک کتب خانے میں یہ تذکرہ ملا ہے اس مضمون میں اسی تذکرے کے پیش نظر نسیم میسوری کی بعض ان خصوصیات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے جو ہنوز پردۂ اخفا میں ہے.

یادگار ضیغم، مولفہ نواب عبد اللہ خان ضیغم، میں سنہ ۱۸۸۴ع تک کے شعرائے کرام کے حالات زندگی لکھے گئے ہیں. میں نے اس کا ایک نسخہ کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد میں دیکھا ہے اس میں نسیم کا فوٹو چسپاں ہے، زری کی ٹوپی، لمبے بال، ڈاڑھی اور لمبی مونچھیں ہیں، شیروانی اور گھڑی معہ زنجیر پہنے ہوئے ہیں. ان کے بارے میں لکھا ہے :

« نسیم تخلص، محمد حسین علی سلطان نام ہے، ان کے دادا ٹیپو سلطان کے ہمشیر زادے تھے، اور نانا ان کے بنکی نواب تھے، طرفین سے رئیس اور قوم کے شیخ قریشی ہیں، سرکار انگریزی سے وثیقہ معقول ملتا ہے، جاگیردار ہر پور اور متوطن میسور ہیں، خوش اخلاق اور نیک صفات ہیں، مختلف لوگوں سے شعر و سخن میں مشورہ رہا اور اردو میں حافظ شمس الدین محمد فیض مرحوم حیدرآبادی سے تلمذ تھا پچاس کی عمر ہے ».

نسیم کی سوانح حیات سے متعلق محمد علی خاں میانہ کا تذکرہ ہے جو اس سے پہلے شائع ہوچکا ہے. اس کے علاوہ ان کے پر نانا بنکی نواب محمد رضا علی خاں شہید کی قبر پر نصب شدہ ایک کتبہ ہے جس کی نقل، ہماری زبان، مورخہ ۸ ستمبر سنہ ۱۹۵۸ع میں چھپ چکی ہے. اس سے نسیم کے آبا و اجداد اور ان کی ٹیپو سلطان سے رشتہ داری پر روشنی پڑتی ہے، اس کے علاوہ کچھ سال پیشتر یہاں سے نسیم کا دیوان مع ایک طویل دیباچے کے شائع ہوا ہے. معلوم ہوتا ہے نسیم کے حالات کے مرتب کرنے میں مولف نے محمد علی خاں میانہ اور عبد الحمید خاں ساقی کے تذکرے سے مدد لی ہے. میں نے بھی ساقی کا تذکرہ ایک دیوان میں لکھا ہوا دیکھا، نیز اس میں نسیم کے تین چار خطوط ساقی کے

نام پائے۔ یہ یہاں کی مروجہ زبان کے آئینہ دار ہیں۔ چونکہ یہ نہایت ہی خستہ حالت میں ہیں مبادا کے زمانے کی دستبرد کا شکار ہوجائیں چنانچہ میں نے سوچا کہ یہ خطوط مع ساقی کے تذکرے کے بجنسہ شائع کردئیے جائیں۔

میانہ لکھتے ہیں کہ سنہ ۱۸۷۵ء میں نواب صاحب[1] باسودہ متخلص بہ وحشی نے اپنے فرزند دلبند کے بیاہ کی خوشی میں نواب صاحب نسیم سے ایک غزل سہرا کی ردیف میں لکھنے کی فرمائش کی تھی، تب مرحوم نے دو تین گھنٹوں کے عرصہ میں ایک سہل اردو خط اور ایک مثنوی اور ایک فرمائشی غزل لکھ کر بھجوادی تھی۔ شاہ ظفر نے بھی اپنے فرزند کی شادی میں اسی ردیف کی غزلیں لکھنے کی فرمائش اپنے شعرائے نامدار سے کی تھی۔

خــط

مئے گلگوں پلا ساقی کدہر ہے کہ ہر نخل تمنا پرُ ثمر ہے

سبحان اللہ بحمدہ، آج علیٰ الصبح کیا مبارک خواب دیکھا جس کے خیال میں جشن جمشیدی ایک دور ساغر بھی نہ تھا، ڈاک کا ہرکارہ نصرت الاخبار دھلی لایا، میں نے تعبیر پائی یعنی کیفیت جشن شادی نوشاہ محمد حیدر علی خاں صاحب بہادر صاحبزادۂ بلند اقبال مطاعی ام نواب محمد عمر علی خاں صاحب بہادر والی باسودہ مع حسن ایمائے شعر و سخن بندہ نظر آئی، اس کی خوشی و انبساط کا حال، بیچارہ قلم چہ بر نگارد۔

میں نے فرمائشیں حسب حوصلہ بجا لائیں الامرفوق الادب بلکہ ایک مثنوی طرہ ہے۔ لیکن حیران ہوں کہ الٰہی لچھے دار عبارت کیا لکھوں، فقط لغت سے بھر دوں، مقفیٰ یا مسجع لکھوں تو سراسر آورد، رعایت قافیہ میں بھرتی کے الفاظ آجاتے ہیں زبان کا مزا نہیں آتا، خیر نثر مرجز سہی، یہ بھی نظم کا بھائی ہے ہم منشی نہ شاعر نہ مولوی نثر عاری لکھنے سے کیا عار

---

۱ محمد عمر علی خان والی ریاست باسودہ کو نسیم سے دلی عقیدت تھی۔ چنانچہ میں نے ۱۳ مئی سنہ ۱۸۷۵ء کے "میسور اخبار" میں نواب صاحب کی ایک نظم چھپی ہوئی دیکھی، جس کا ایک شعر ہے:

خداوندا کرے صدقے اپنے حضرت کے ٥ کہ ہم ہوں باغ ہو "وحشی"، "نسیم" بنگلوری

آگے چل کر لکھتے ہیں:

جس جا پہ نہ ہو نسیم وحشی ٥ سر سبزہ وہ بوستاں نہیں ہے

ہے . اگر ہم سے کچھ قصور بھی ہوجائے ہم دہلی اور لکھنؤ والے تو نہیں محبت دلی حاضر ہے جو دل میں آیا قلم سے نکلا چشم بد دور چشم دید خود نواب صاحب نے وہ رنگین عبارت لکھی ہے کہ نسیم و صبا کا رنگ اڑگیا صاحب نصرت الاخبار نے جھوٹھ نہ لکھنے کے الزام کے ساتھ سماعی مضمون کا گلدستہ ایسا باندھا کہ بلبل کا دم بند ہوگیا ، ہم قیاسی تشبیہ کیا دیں ، بنگلور کے لال باغ کا نظارہ نواب صاحب نے کیا ہے ، کہتے ہیں اس کا ثانی آج کل ہند میں نہیں .

ھنگام شادی میمنت آبادی روئے زمین باسودہ بعینہ باغ موصوف کے سرو شمشاد و صنوبر کئے قسم کے دو رویہ لب جو ہوں گے ، جس قدر انسان کے علم میں پھول پھل جڑی بوٹی ہیں کیاریوں میں موقع پر لگائے گئے ہوں گے ، ہر رنگ و ہر قسم کے پھولوں کے تختے الگ الگ قرینے سے رہیں گے ، اور ہر روش پر سبزے کی جدولیں ہوں گی ، باد بہاری ہر سمت رواں ہوگی ، نکہت گل دل و دماغ تر و تازہ کرتی ہوگی ، کہیں آب رواں ، کہیں فوارے ہوں گے ، رقاصان پری وش مطربان خوشنوا راگ رنگ میں مشغول ہوں گے ، اھل محفل خوشی سے پھولے نہیں سماتے ہوں گے ، دور شراب صالحین و مثلث ہوگا ، چشم بد دور نو شاہ با خلعت شاہانہ جلوہ افروز ہوں گے ، نواب صاحب مبارکبادیاں بہ خوشی و فرحت لیتے ہوں گے . ہم کم یاد آوری کا گلہ کیا کریں اگر ہم ہوتے ہمارے یہ ارمان نکل جاتے نوشاہ جوان صالح پر بصد دل نقد جاں نثار کرتے ، تصدق ہوتے ، گھوڑا تھامتے ، براتیوں کے ساتھ ساتھ چلتے ، ہر ہر قدم پر دعائیں دیتے ، مبارکباد کہتے ، میرے ہمصفیر نواب مرزا فیروز حسین خاں صاحب بہادر صبا ، بھی من حال و قال ھر دو مبتلائے فراق بہ مصداق اس بیت کے ہے :

چوں بیک شمع دو پروانہ تولا دارند حال آں ہر دو بیک سوزش و سازش باشد

جناب نواب صاحب . آداب!

سال تاریخ عروسی چہ خوش آمد زنسیم ٭ جلوہ شادی نوشاہ مبارک باشد

۱۲۹۳

اب روئے سخن سراپا مسرت بخدمت نواب محمد حافظ قلی خاں صاحب بہادر والیء محمد گڑھ ہے ، اگرچہ مثل صورت پرستان جمال مبارک ہم نے نہیں دیکھا ، لیکن برنگ معنی آشنایاں محو سابقہ اتحاد و عالم ارواح ہوں :

مصاحبت چہ ضرور است آشنائی را　　هنوز باد یمن محو نکہت عربی است

اور دوست کے دوست بڑے پیارے ہوتے ہیں :

از بس بساز و برگ دو رنگی نزاع بست ؀ یک سجدہ بر دو قبلہ ہم از افتراع ما ست

داماد جوان صالح شیریں قلم خسرو ملک علم و فضل مبارکباد بالنون و الصاد .

سنتے ہیں کہ نواب صاحب باسودہ کا ارادہ زیارت بیت اللہ شریف کا ہے :

بہ سفر رفتنت مبارکباد　　بہ سلامت روی و باز آئی

بندہ بھی ہم رکاب ہوجاتا ، کچھ ایک نمبر باقی رہ گئے ہیں ، مجبور ہے ، امید کہ نواب صاحب موصوف کی سرکار کے سوائے اس خاکسار کو ، جو اردو اخبار آتے ہیں ان میں طبع ہوں .

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

مورخہ ۵ ماہ اکتوبر سنہ ۱۸۷۵ع

والراقم

محمد حسین علی سلطان نسیم قریشی ، بمقام : بنگلور

نسیم کے مندرجۂ ذیل خطوط ساقی کے نام ملاحظہ فرمائیے :-

اجی او مہربان بط شراب احسان سلمہ الرحمٰن ، السلام علیکم

ابھی تمہارا خط پہونچا میسور میں بے پر کی اڑی سنی کسی مٹو میاں کی ٹیں ٹیں معلوم ہوی ، یا کسی سبز قدم کی طوطی دل کی شکر شکنی ہے . کیا عجیب جہاں سرشاہیں زرین بال مہر محشر طلوع ہو ، جن لوگوں کی لگڑ جھگڑ میں اوقات بسر ہوں ، اس سرخاب کے پر سر میں کیوں نہ کھولیں اپنی بولی میں گالیاں دی لیں کون فاختہ مانع ہو ، گر مرغ دل گھبراتا ہے کہ سننے والے الّوؤں کو کیوں باور آتا ہے ، قاز کی سی گردن اٹھاتے ہیں بگولوں سی بال شادی بجاتے ہیں ، آدھے تیتر آدھے بٹیر ، واہ ری زمانے کے

پھیر تم نے اکتوبر کے خط میں لکھا ہے حضرت کا جواب درست تھا ، پر قاعدے کے رو سے سست تھا غرض یہ شعر پڑھا:

کیوں نہ مشہور ہو سخن اپنا		میر صاحب سے ہے صلاح سخن

یہ کس چم خچر کی صلاح ہے کسی تذکیریمیں سخن میر کے شاگرد دیکھے ہیں، سخن کا دیوان کتب خانہ اہل اسلام سے منگوا کے دیکھا چھوٹا سا ہے یہ بیت اُنکی نہیں کلام سے ظاہر ہے میر سے مشہور کی کیا رعایت ، کیا میر عنقا کا بچہ ہے وہ کڑا فقرا تمہارے لئے شایان نہیں تھا ، بذات خود تم تو اُستاد کامل فن بن گئے ہو میری اصلاح پر معترض ہو کیا فائدہ یہ تُو تُو میں میں داتا کل کل بھاتا نہیں . مجھے بری کو اچھا لکھنا منہ بنوانا چونچلا کرنا آتا نہیں .

اے موتراش دست تو باید بریدن است ٭ اصلاح می دہی خط پروردگار را میں تمہیں اللہ آمین کا دوست سمجھتا ہوں ، دعائیں مانگتا ہوں . مرغ آمین را کہے فقط .

یم نیساں عط نفع و ضرر کے ساتھ ھمدم ہوں
صدف کے منہ میں گوہر ہوں دہاں یار میں ہم ہوں

دیگر نامہ

ساقی خمخانۂ محبت دام محبتہ

رنگ رندوں کر خود بھکتا ہے		تو بھی کیا بادہ نواز ہے ساقی

کیا غضب ہے کہ تم بے پر کی اڑی ، یقین جانتے ہیں ، اسی کو مانتے ہیں ، تمہیں شیفتہ پری کہوں کہ ولی کہوں . شہاب الدین صاحب شہاب و بخشی اسحاق صاحب سے بجد ہو کے میں بیمار ہوں سو دیکھ بھال اور مجھے ان دنوں مشق زیادہ نہیں کر کے فی البدیہا مشاعرہ کئے حضرت ایک بیت نہیں لکھے تک غزلیں لکھے پھینکا ، منہ پر ہوائی چھوٹی رونے لگے ، بد دعا دینے لگے بنگلور سے خبر لو ، ان کے شاگرد تخلص قادر پیراں سے پوچھو ، تمہارے منہ میں کتنے دانت ہیں کر کے یہی ذکر نکلا یا نہیں تم کیوں پڑے

اچھلتے ہیں، بےطریق چلتے ہیں، خیر تو ہے کیا شاعری ایک مجری پر ختم ہے کیا بڑے عابد صاحب اور چھوٹے عابد صاحب کے سریکا ایک ایک غزل کے شاعر ہیں. کبیر صاحب تحصیل تخلص نے ہزاروں غزلیں خمسہ لکھا ہے اور ہمیشہ روانہ کرتے ہیں تمہارے دیکھنے کے واسطے ان کے چند اشعار اسکے ساتھ روانہ کیا ہوں اور تمہارا مجرا بھی ٹھیک ہے. لیکن اچھا لکھا کرکے ساقی صاحب مست نہ ہوجانا.

مشق کر مشق کہ تا لطف سخن پیدا ہو
خود بخود شعر میں بے ساختہ پن پیدا ہو

تم سال دو سال میں غزل یا خط لکھے تو جواب نہیں لکھوں گا، ہمیشہ لکھو، ہمیشہ لکھتا ہوں فقط.

(۳)

ساقی صاحب سلمہ

مار ڈالا یار تری جواب طلبی نے

اس چرخ کجرفتار کا برا ہو ہم نے اس کا کیا بگاڑا تھا توڑا پھینکا تھا جواب تک لکھنے کی فرصت نہ ہوئی، افسوس کہ میں ساقی سے اور ساقی مجھ سے الگ الگ خم کے خم لنڈھای، کبھی غم اور کبھی عیش کا لطف اٹھائے الٰہی پھر وہی گاڑی چھنے میں اس کا وہ میرا بنے رقیب کباب سا بھن جائیں، مئی تو کیا تلچھٹ نہ پائیں، بھیہ ساقی سچ پوچھو تو ان دنون تمہارے میں مستی نظر نہ آئی، اصلاح سے طبعیت گھبرائی، بجائے اصلاح تم صلاح لکھتے ہو. اول رسم خط دیکھو بعد شعر کی پوچھو روز مرہ محاورہ ڈھونڈو، دیکھو تو کیسی کڑی بات ہوئی، سعادت سمجھتے ہوں تو نبات ہوی، اجی میاں ساقی اپنی طرحی زمینوں میں کیوں تعمیر پر تم نے کمر باندھی.

کس نے شی دی اور زیادہ لکھوں تو مشکل کا سبق ہوگا. مزاج نازک پر قلق ہوگا، خدا کے فضل سے ڈول ڈیل خوب خلق ظاهری مرغوب لیکن

بات ہوئی بازاریوں کے سلامی پچوتروں پر بجالو اٹکل پچونہ سناؤ، یہاں قیام، تحصیل، روشن، کیفی، اثر وغیرہ شعراء غزلیں لکھا کرتے ہیں، ہمیشہ سنایا کرتے ہیں، یہ لو کیا لکھنا تھا کیا لکھ رہا ہوں، تمہاری قلعداری تمہیں مبارک ہو جیو جاگو چشم ما روشن و دل ماشاد، فہو المراد. ابھی ایک رباعی مالیہ یا دو تین ذیل میں لکھتا ہوں زیادہ فکر نہیں کرسکتا ہوں ٹپال کا وقت قریب ہے. ہاں تم تاریخ کو دانتوں کر ریخ بھی جانتے نہ ہیں. ماہ تو ماہ روز بروز سال سال ہے. مہینے گذرے خطوں میں تاریخ نہیں دیکھی. لیکن جواب نہ آنے پر شکوے تھے دل یہ کہتا تھا ساقی کو اس طرح کے ذکر سے آزردہ نہ کر، جواب نہ آنے سے آزردہ ہوں تو ہوں. شفیق من میرے قصور پر نظر نہ فرمانا تمہیں سلام لکھوں تو ہم عمر نہیں، دعا لکھنے بندہ فقیر نہیں، مجرا تسلیم بندگی باھم گریز نہیں، قصور معاف کیجئے غبار آئنہ خاطر کو صاف کیجئے، اپنے مزاج میں وہ جودت نہیں وہ فرصت نہیں واہی تباہی لکھتا ہوں غرض جنگل میں سڑی بنے پڑا ہوں، فقط. رباعی

ہے گرچہ کلام ان کا روکھا پھیکا بھوکا رہتا نہیں ہے شیدا ان کا
کھاتا ہے مزے سے غم بلا نوش نسیم کیا رنگ ہے سانولا سلونا ان کا

رباعی

بے ہوش جو کرچکا غصہ ان کا تصویر بنادیا ہے نقشہ ان کا
شامت لائی نہ شامہ طبیبو دیگر ہے لخلخہ بس مجھے پسینہ ان کا

مندرجہ ذیل خط بھی عبدالحمید خان صاحب تخلص ساقی کے نام اس دیوان میں مندرج ہے:

اے ساقی بادہ فصاحت، اللہ رکھے تجھے سلامت، خط آیا منع غزل تمہارا اصلاح کی احتیاج کیا تھی دو چار بیت یا زیادہ، کیوں بخل مزاج میں ہوا ہے، ہاں ایسی غزل کو کیجئے اصول. یہ شعر کو مختصر نہ کیجئے: ساقی جو لکھے مدام کاغذ، رکھواؤں سبیل مٹی کی گھر گھر، لٹواؤں تمام گنج دنیا، اندر کی سبھا کروں پریسے، دریائے شراب ہی بہادوں، دن رات چلاؤں کشتی مئی، نیک پیراں بھی آئے ہیں یاں اور دوست کئے ہیں جمع اپنے،

ساقی جو نہیں نہیں حلاوت، ہے تلخ مجھے شراب شیریں، اس نثر کا نام کیا ہے
لکھو ، خالق دیوے تمہیں سعادت، تاریخ ہے جنوری کی سات آج، سن آٹھ
سے یکہزار ایکہتر ، وستادی سے خط لکھا ہے میں نے ، یعنے یہ نسیم باغ الفت .

الغرض نسیم کے یہ چاروں خطوط ساقی کے ساتھ ان کے گہرے روابط ، سچی محبت اور سچے خلوص کے آئینہ دار ہیں . ان کی اشاعت سے ایک غرض تو ان کرم خوردہ مکتوبات کو محفوظ کرنا اور دوسری اس زمانے کی میسوری زبان اور عام طرز تحریر سے قارئین کو روشناس کرانا ہے . ان خطوط کی اہمیت اس زمانے میں خصوصاً اس وجہ سے بڑھ جاتی ہے کہ ان کے ذریعے ہمیں نسیم کے معاصرین اور ماحول کا صحیح علم ہوسکتا ہے ، اور یہاں علمی سر گرمیوں کی تصویر نگاہوں کے سامنے آتی ہے ، مثلاً دوسرے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ میسور میں اکثر ادبی محفلیں منعقد ہوا کرتی تھیں ، لہذا ایک مشاعرے میں شہاب الدین شہاب اور بخشی اسحاق صاحب نے فی البدیہ اشعار پڑھے ، پھر عابد نامی دو شاعروں کا ذکر ہے جنہیں نسیم ایک ایک غزل کے شاعر کہتے ہیں. ساقی نے بخشی اسحاق سالم اور زین العابدین عرف عابد میاں صاحب کو نسیم کے استاد بتایا ہے ممکن ہے علمی رقابت کی بنا پر نسیم کی اپنے استادوں سے ان بن ہوگئی ہو . نیز ان مکتوبات سے کبیر صاحب، تحصیل، اور خود ساقی کی شاگردی کا پتہ چلتا ہے . تیسرے خط سے اس زمانے کے شعراء میسور ، قیام ، روشن ، کیفی اور اثر کی موجودگی کا علم ہوتا ہے . ایک خط میں میر صاحب کا جن الفاظ میں انہوں نے ذکر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب کی عظمت و شہرت سے وہ مرعوب نہیں تھے ، اور ان کی فنکاری کے آگے سر عقیدت خم کرنا معیوب سمجھتے تھے ، نیز ان خطوط کی آسان اور سہل زبان اور طرز تحریر کی بے ساختگی اور بے تکلفی مرزا غالب کی یاد تازہ کرتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ادبی انقلاب جو نثر نویسی میں غالب کی بنا پر شمالی ہندوستان میں رونما ہورہا تھا ، میسور جیسے دور دراز خطے میں بھی اس کے اثرات نمایاں ہورہے تھے . نواب صاحب باسودہ کے خط کی زبان ہنگامی اور روایتی ماحول کی ترجمانی کرتی ہے ، اور نسیم کی قادر الکلامی اور قدرت بیانی کی شاہد ہے . یوں تو مقفیٰ اور مسجع عبارت کے لکھنے میں بھی انہیں استادانہ قدرت حاصل تھی لیکن نسیم ساقی کے خطوط میں اپنے اصلی رنگ و روپ

میں نظر آتے ہیں۔ الغرض نسیم کا زمانہ وہ عبوری دور تھا جس میں نئی چیزیں بھی تھیں اور پرانی بھی۔ مغربی تہذیب کے زیر اثر زندگی نئی قدروں اور نئے اسالیب کے ساتھ جلوہ‌ریز ہورہی تھی ادب کو زندگی کے قریب لایا جارہا تھا، واقعیت اور اصلیت معنی آفرین اور نازک خیالی کی جگہ لے رہے تھے، اشارہ تشبیہ اور صنائع و بدائع کے بوجھل زیوروں سے ادب کو آزاد اور بے نیاز کرنے کی بڑی شد و مد سے کوششیں ہورہی تھیں۔ نسیم نے بھی زمانے کے رجحان کے مطابق حقائق کے چہرے سے نقاب کشائی کو بہتر جانا اور اپنے نجی خطوط میں اس اختصار صفائی اور بے ساختگی کو جگہ دی جو غالب کا طرۂ امتیاز تھی۔ با ایں همه نسیم کی لافانی شہرت کا باعث ان کی شاعری تھی۔ اس میدان میں ان کی جولانئی طبع اور استادانہ قابلیت سے متعلق بہت کچھ لکھا جارہا ہے لیکن ساقی نے اپنے تذکرے میں ان سے متعلق کچھ لطائف و ظرائف داخل کرکے نسیم کی بدیہ گوئی اور حاضر جوابی کی صلاحیت کو اُجاگر کردیا ہے، لہذا ساقی کا یہ تذکرہ بجنسہ نقل کیا جاتا ہے۔

تذکرۂ ساقی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

للہ الحمد ہرآں چیزکہ خاطر میخواست آخر آمد ز پس پردۂ تقدیر پدید

میں نہایت حیران تھا کہ میرے لڑکپن کے دوست سراسر مغز بے پوست، فنِ شاعری کے استاد، جن سے میں نے ایک مدت شعر کی اصلاح لی، کی وصیت کیونکر ادا کروں۔ شکر ہے کہ دفعتاً اپنے حسب خواہش تمام سامان اس مسبب الاسباب نے مہیا کر دئے۔

از دست و زبانیکہ بر آید کز عہدہ شکرش بدر آمد

یہ خاکسار شاعران ہند کا ذلہ‌خوار ہیچمیدان ازلی منشی عبد الحمید خان متخلص بہ ساقی متوطن میسور التماس کرتا ہے کہ جب استادی منصراللہ بنکی نواب محمد حسین علی سلطان قریشی نسیم تخلص ۱۳۰۵ھ / ۱۸۸۸ ع میں سخت بیمار ہوے تو میرے شوق نے مجھکو اس امر پر مجبور کیا کہ ہمیشہ

بیمار داری میں رہا کروں. افسوس ہزار افسوس کہ قسمت نے میری آرزو پوری نہ ہونے دی. ہاسن ہائی اسکول کی منشی گری پر مبدل کر دیا. ع آخر جی کی جی ہی میں رہی بات نہ ہونے پائی. زمانہ اپنے لئے ایسا بھی نہ رہا کہ روزگار سے دست بردار ہو جاؤں اور میرے دوست کی تیمارداری کروں. یہ سعادت میرے نصیب نہ تھی. مجبوراً جب مجھے ہاسن جانے کی ضرورت ہوئی برائے عیادت و رخصت نواب نسیم صاحب کے مکان پر گیا. بالا خانے کی ایک کوٹھری میں نہالی پر بائیں کروٹ روبہ شمال پڑے ہوئے تھے، ایک ملازم پنکھا جھل رہا تھا، اٹھنے بیٹھنے کی طاقت بالکل نہ تھی. نواب نے مجھکو دیکھکر اپنی حسب عادت تبسم فرمایا. میں نزدیک بیٹھ کر پوچھا کہ حضرت اب طبیعت کیسی ہے، فرماتے ہیں کہ خواجہ ساقی کیا کہوں ع سب جاتا ہے پیشاب کا جلنا نہیں جاتا. اللہ ری طبیعت.

یہ جواب اُن کے منھ سے نکلتے وقت ہوش تک درست نہ تھے اور انکا ہاتھ نتھنوں پر بار بار دوڑتا تھا یہ حالت دیکھتے ہی جی بھر آیا، یقین ہو گیا کہ نسیم کا ضرور باغ خلد کو جانا ہوگا. تاسف سے پوچھا آپکا مرقع روحانی نگارستان معانی دیوان کہاں ہے. فرمایا کہ لوگوں کی زبان پر، ہاں وکچھ مسودے رہگئے ہیں لیجاؤ اور لکھنؤ میں چھپوادو. میں اس وقت ایک بوسیدہ کتاب کو جسمیں اشعار مرقوم تھے اور میز پر دھری تھی اٹھا لیا اور:

دل سنبھالا خدا خدا کر کے حق پہ سونپا انہیں جدا کر کے

بصد اندوہ و ناکامی وہاں سے لوٹا اور جی ہی جی میں کہا کہ انکو مرتب کرنا تو ضروری ہے لیکن اشعار بہت کم اور اکثر ردیفیں چھوٹ گئی ہیں کیا کروں. اسی فکر میں رہا، بارے بڑی جانکاہی سے اور بھی کئی شعر ادھر ادھر سے احباب کی معرفت فراہم ہوے، رات دن اسی سوچ میں رہنے لگا کہ کیا کروں اور کیونکر چھپواؤں، اس اثنا میں نواب نسیم صاحب کے بہنوئی میرے پرانے یار محمد علی خان صاحب ڈپٹی عملدار تروپکرہ نے راقم سے کہا کہ تم نواب نسیم صاحب مرحوم کا دیوان مرتب

کردیں تو میں اس کو لکھنؤ بھیج کر چھپوا دوں گا۔ میں بساختہ کہہ اوٹھا:
للہ الحمد ٹھکانے لگی محنت میری ٭ طے ہوی آج کی منزل میں مسافت میری
جھٹ سے دیوان مرتب کردیا اور نام اس کا «مخزن الفصاحت» رکھا،
۱۳۰۷ھ
جس میں ترتیب دیوان کی تاریخ نکلتی ہے۔ نواب نسیم صاحب گو میسوری تھے مگر اہل دہلی و لکھنؤ کی زبان سے زیادہ آشنا اور ان کی تقلید کرتے تھے۔ ہمیشہ آپ کے پاس دو ملازم ایک شیخ ابراهیم لکھنوی دیگر مولا بخش دہلوی رہتے تھے اور ان سے ہی بات چیت کرتے رہتے اور بار بار مجھ سے آپ نے فرمایا ہے کہ خواجہ ساقی یہ دونوں میری ڈکشنری ہیں۔

یہ نواب نسیم صاحب مرحوم سنہ ۱۲۵۶ھ/ ۱۸۳۹ع میسور میں پیدا ہوئے جب ان کی رسم بسم اللہ خوانی ہوئی انہیں مکتب میں بٹھا دیا۔ ان کے والدین گو سنی المذہب تھے لیکن حضرت علی کرم اللہ وجہ سے زیادہ محبت رکھتے تھے۔ آج بھی شیعوں میں ان کے قرابت دار موجود ہیں۔ ان کے والدین اپنے حسب منشاء ماہ محرم میں نسیم صاحب کو عشرے تک مجنوں بناتے اور کہتے تھے کہ یہ حسین کا فقیر ہے۔ مجنوں کا لفظ ان کے لئے مبارک فال ہوا کہ آخر عاشق مزاج ہو نکلے۔ غرض آٹھ سال کی عمر میں قرآن مجید ختم کرکے دسویں سال تک اس زمانے کے دستور موافق آمدن نامہ، کریما، نام حق، عقاید جامی وغیرہ کتابیں پڑہیں پھر بنگلور میں کئی مدت اونکو رہنا ہوا۔ وہاں ایک بڑے ایک فاضل شہر استاد غلام زین العابدین عرف عابد میاں صاحب سے درسی کتب (اور[1] جناب شاہ باقی صاحب، باقی تخلص اور جناب بخشی سید اسحٰق صاحب سالم تخلص سے) علم عروض و قوافی و علم بیاں و علم بدیع وغیرہ وغیرہ پڑھ کر ہئیت، حساب، رمل، نجوم وغیرہ علوم کو جناب منشی غلام حسین صاحب منجم سے میسور میں سیکھا۔

نسیم صاحب مرحوم سولا برس کی عمر سے شعر کہنے لگے۔ بموجب رسم زمانہ کے حضرت مولوی حافظ میر شمس الدین فیض حیدرآبادی سے اصلاح لیتے رہے۔ طبعیت آپ کی خوب موزوں اور شعر سے نہایت مناسبت

---

[1] قوسین کی عبارت اس نسخے میں کاٹ دی گئی ہے۔

رکھتی تھی، اسی وجہ سے ملک میسور میں فن شعر کے آفتاب ہو کر چمکے
ان کی استادی نے اپنا علم بلند کیا، اور ان کے سامنے ہی، ان کے صدہا
غزلیں، مخمس، مسدس، مثنوی، رباعی، سلام، مرثیے وغیرہ مشہور ہو گئے.
جس مجلس میں آپ کی غزل پڑھی نہ جاتی وہ مجلس پھیکی معلوم ہوتی تھی.
افسوس ہزار افسوس ہے کہ زمانے کا الگ الگ طور پر ہیں.

دنیا خوابیست کش عدم تعبیر است صید اجل است گر جوان و پیر است
هم روئے زمیں پر است و هم زیر زمین ایں صفحه خاک هر دو رو تصویر است

آخر مقام ہاسن میں میرے ایک دوست کے خط سے معلوم ہوا کہ
بنکی نواب نسیم صاحب نے ۱۳۰۵ھ / ۱۸۸۸ع شعبان کی بارھویں تاریخ کو
دنیائے فانی سے نقل مکان فرمایا. آہ صد آہ اس خبر و حشت اثر کے سنتے
ہی جان میں جان نہ رہی دیر تک روتا رہا اور بار بار میرے منہ سے یہ
مصرع بیساختہ نکلتا تھا:

ع شاعری کی آج رحلت ہو گئی

دوسرے تیسرے دن اون کے انتقال کی تاریخ لکھ کر جریدۂ روزگار
مدراس کو بھیج دی، وہ تاریخ یہ ہے. تاریخ وفات بنکی نواب محمد
حسین علی صاحب قریشی تخلص نسیم:

سنا ہائے میں نے کہ حضرت نسیم گئے شوق سے نزد اللہ آج
نہ ایسا رہا جب سخن دان دھر سخن گوئی نے اپنی لی راہ آج
یہ تاریکی غم بنی آنکھوں میں آہ منور نہیں مہر اور ماہ آج
قیامت بپا کیوں نہ ہو شہر میں جہاں سے اٹھا ایسا ذیجاہ آج
فلک سے جو پوچھا تو سال وفات ندا غیب سے آئی ناگاہ آج

کہ ساقی بر آہ و زاری سے لکھ
گیا مالک نظم و نثر آہ آج
۱۸۸۸ع

ایک ہفتہ کے بعد خیال کیا تو وہی مصرع «شاعری کی آج رحلت ہو گئی»
جو میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا تھا بعینہ سالم اور الہامی تاریخ
تھی. حقیقت میں نواب صاحب کا اردو دیوان دیکھیں تو جوہر کلام کے

اعتبار سے ایک مرصع یا یوں کہو کہ نگارخانہ چین معلوم ہوتا ہے، تمام غزلیں دلچسپ بحروں میں ہیں، اکثر اشعار ایسے بھی فصیح ہیں کہ ان کی فصاحت و بلاغت مضامین کے چمن میں اپنا قدرتی جوبن دکھاتی ہیں. اس میں کچھ کلام نہیں کہ یہ با کمال طوطی و بلبل کے طرح صاف زبان اور قدرتی الحان لائے تھے. سیدھی سادھی باتیں بیساختہ کہہ دیتے تھے، گویا وہ باتیں سامنے تصویر بن کر کھڑی ہیں، خدا نے آپ کو ایسی طبعیت دی تھی جو شعر اور فن انشا ھی کے لئے موضوع تھی. ان کے کلام کا مزہ محاورے کی چاشنی اور لفظوں کی بندش پر ہے محاورے کی جان ہے تو ان کا کلام ہے. ان کا کلام حسن و عشق کے معاملات عاشق و معشوق کے خیالات سے مملو نظر آتا ہے انکے محاورے کی خوش بیانی نے مضامین عاشقانہ کو فصاحت و بلاغت کے رنگ میں سر تا پا ڈوبا دیا ہے.

آپ کی زبان صاف و شستہ کلام عمدہ سے عمدہ، بیان ایسا پاکیزہ جیسے عاشق و معشوق باتیں کرتے ہیں، دل کے خیالات کو سب کی طبعیتوں کے موافق محاورہ کا رنگ دیکر باتوں باتوں ہی میں ادا کرنا ان کا جوہر اصلی تھا، اور اس کی شعر خوانی کا بھی نرالا انداز تھا جس سے شعر کی شان اور لطف کلام دوبالا ہوجاتا تھا، اور شعر کو نہات بانکپن سے لفظ لفظ جدا کرکے پڑھتے تھے اور آپ کو موسیقی میں بھی اچھی مہارت تھی.

حافظہ کا یہ عالم تھا کہ جب کسی کے منہ سے شعر ایک بار سنتے تو فوراً کچھ کم و بیش پڑھ دیتے تھے، آپ کی طبعیت میں آزادی تھی کوئی امیر یا فقیر آجاویں تو بے تکلف بہ کشادہ پیشانی ملاقات کرتے تھے، مگر مزاج میں رنگینی اور ظرافت ایسی تھی کہ ہر قسم کا خیال لطایف و ظرایف ہی میں ادا ہوتا تھا، ان کے چند لطیفے ذیل میں لکھتا ہوں.

لطیفہ: ایک دن نواب صاحب نے کئی معزز عمایدکے ساتھ حسب عادت عین کھانے میں پانی پیا، جھٹ سے ایک صاحب نے کہا کہ نواب صاحب آپ کھاتے کم ہیں اور پیتے بہت، تو جواب دیتے ہیں:

مری شراب کے دشمن خراب ہوں یارب
نہ کسی کے کھانے میں ہوں نہ کسی کے پینے میں

لطیفہ : نواب صاحب کو ایک اور نواب صاحب سے اتحاد قلبی تھا ، جب وہ علیل ہوے انکی عیادت کو آپ گئے ، بعد مزاج پرسی کے انھوں نے کہا کہ بھئی بنکی نواب دعا کر . آپ نے کہا کہ ہاں بھئی خدا کرے تری ، بیماری بی ماری جائے ، خدا کی قدرت اسی سال اتفاقاً ان کی پہلی بی بی نے انتقال کیا .

لطیفہ : ایک صاحب نواب صاحب کی ملاقات کو آئے اور بطور گلہ کہنے لگے کہ آپ تریکرے سے تشریف لائے سو میں کیا جانتا آپ کیوں بول نہ بھیجے ، جھٹ سے فرمائے کہ شیشہ نہ تھا .

لطیفہ : ایک دن نواب صاحب کے ہاں راقم حاضر ہوکر کیا دیکھتا ہے کہ ایک مے فروش نے اپنی باقی کی بل لائی ہے اور آپ فکر مند بیٹھے ہیں . مجھے جو دیکھا کہنے لگے آئیے آئیے خواجہ ساقی آیئے ، میں سلام کر کے بیٹھ گیا اور پوچھا چہرے سے آزردگی ظاہر ہے ، اور یہ کیا تحفہ ہے تو آپ فوراً کہہ اُٹھے ،

ڈھئی دیئے بیٹھا ہے در پر مئی احمر والا دشمنی کرتا ہے داماد سے دختر والا

لطیفہ : ایک دن ایک ہندو . . . . دربار میں نواب صاحب گئے جب ادب گہ پر پہونچے جوتا پاؤں سے اتارنے فراموش ہوگئے پہرے والے نے ٹوکا ، آپ فرماتے ہیں .

چھوڑ دو جوتا ادب گہ پر وہ کہتے ہیں نسیم
کیا بتان ھند کی ہے آبرو پاپوش میں

لطیفہ : رمضان کا مہینہ تھا جمعہ کی صبح کو عمر خان صاحب درانی کی مسجد کے پیش امام چند دانے آم کے لائے . نواب صاحب نے کہا کہ یہ آم کہاں کے ہیں پیش امام نے کہا کہ عمر خان صاحب نے فروخت کے لئے دیا ہے . جھٹ آپ فرماتے ہیں .

صباح جمعہ شنیدم امام مزدور است چرا نہ پیر مغاں قبلہ ام شود تا شام

لطیفہ : جمعدار محمد حسین صاحب ہمیشہ نواب نسیم صاحب کے پاس رہا کرتے تھے اور یہ جمعدار صاحب بڑے عقلمند کر کے مشہور ہیں . ایک موقع پر کہے :

بہت شیر مردوں کی روزی گئی جمعدار جیسے کہ کولا ہوا

لطیفہ : دھوپ کالے کے موسم میں نواب صاحب کو نیلگری کے پہاڑ پر رہنے کی عادت تھی ، ایک دن کرنل اسکاٹ صاحب کے بنگلے میں نواب نسیم صاحب اور چند یورپین لیڈیاں اور یورپین صاحبان دوپہر کے بعد بیٹھے باتیں کررہے تھے ۔ اس اثناء میں ایک پرندہ درخت کی ڈالی پر بیٹھکر بولنے لگا ۔ ان میں سے ایک لیڈی نے کہاکہ بنکی نواب یہ جانور کیا بولتا ہے ۔ آپ نے کہا کہ (ٹی پو ٹے ٹو - ٹی پو ٹے ٹو ، برنگ برنگ برنگ) بولتا ہے ۔ سب نے قہقہہ مارا فوراً چائے اور آلو منگوائے نوش کئے ۔

لطیفہ : ایک دن نواب صاحب عملدار محمد علی خان صاحب کے گھر تشریف لیگئے وہاں ایک حکیم جی بیٹھے باتیں بگھار رہے تھے ۔ اثنائے گفتگو میں خان صاحب نے کہا کہ ہمارے حکیم جی اس زمانے کے بو علی سینا ہیں ۔ نواب نے فرمایا کہ ہاں جناب بو تو سچ ہیں لیکن علی سینا نہیں ۔

لطیفہ : نواب نسیم صاحب کے ہاں ایک سوداگر صاحب مہمان تھے اور زیادہ مے نوشی کے بھی عادی تھے ۔ جب سوجاتے ، اٹھتے وقت ان کا ملازم سوڈا واٹر کا شیشہ لاکر اس کا کارک نکالتا ، اس آواز کے ساتھ ہوشیار ہوجاتے تھے ، میں نے یہ دیکھ کے نواب صاحب سے پوچھا کہ حضرت یہ کیا حالت ہے آپ نے جھٹ سے کہا سنو ساقی ۔ شعر :

آنکھیں نہ شور حشر سے کھولیں نسیم نے ٭ بوتل کا کارک اُڑتے ہی بیدار ہوگئے

نواب نسیم صاحب کی مزاج میں شوخی کوٹ کوٹ کر بھری تھی ، مگر اسکی بنیاد نازک مزاجی پر تھی ، خدا نہ کرے غرور یا بد نیتی یا کسی کی عزت ریزی کا خیال مطلق نہ تھا ۔ آداب محفل کا خیال آپ کو ہمیشہ رہتا تھا ۔ آپ کوٹھے پر تکیہ لگائے ہمیشہ بیٹھے یا آرام کرسی پر لیٹے رہتے تھے ۔ شاگردوں سے اصلاح لینے کوئی آتے تو فرماتے کہ غزل پڑھو ، وہ پڑھتے ، آپ سنتے ، کہیں کہیں کہہ بھی دیتے تھے کہ اس لفظ کو نکال کر یہ لفظ لگادو یا اس شعر کو کاٹ دو یا اس کی بندش ٹھیک نہیں یا فلاں حرف گرجاتا ہے ۔

نواب صاحب نہایت رنگین طبع ، شگفتہ مزاج ، خوش وضع ، خوش لباس

تھے ۔ قد اونچا اور جسیم ، کمان ابرو ، گورا رنگ ، گرد چہرہ ، سر میں نرمۂ گوش تک چھڑی دار بال ۔ جملہ قوانین شرافت اور آئین خاندان میں اپنے نانا نواب قاسم علی خان بہادر کے پابند تھے ، مگر ڈاڑھی گھٹوایا کرتے تھے ، سر پر چوحاشیہ بنارسی قور کا ڈوپٹہ اکثر باندھتے تھے یا دلی کے نواب زادوں کی سی زرین ٹوپی رکھتے ، تن میں تن زیب کا انگرکھا یا لانگ کوٹ ، سفید پاجامہ کبھی پتلون ، کمر میں پٹکہ ، ہاتھ میں قمچی ، پاؤں میں ترچناپلی کی نوک کا جوتا ، کبھی شوز کبھی ہاف بوٹ داھنے ہاتھ میں کھربے کے بڑے بڑے منکے ، ہاتھ میں عطر بسا ہوا ریشمی رومال ، کن انگلی میں طلائی انگشتری سنگ سلیمانی نصب کی ہوئی تھی ، اور اس انگوٹھی پر ایک تصویر شیرزہ کی اور انگریزی میں تین حرف یعنی بی ۔ ین ۔ ٹی ۔ کندہ تھے ۔ اس انگشتری کو چیف کمشنر مسٹر ایل بورنگ بہادر نے کندا کرواکے دیا تھا مذکورحرفوں سے یہ اشارہ ہے کہ بی ، سے بنگی نواب ، ین ۔ سے نسیم اور ٹی ۔ سے ٹیپو سلطان والی سریرنگ پٹن مراد ہیں ۔ فقط

ساقی کا تذکرہ نسیم کے حالات کا سب سے زیادہ مستند ماخذ ہے ، جو اب تک پردۂ اخفا میں تھا ۔ بقول ساقی محمد علی خان میانہ نسیم کے بہنوی تھے جنہوں نے اس کا تفصیلی تذکرہ لکھ کر انہیں زندۂ جاوید بنادیا ۔ ساقی نسیم کے محبوب دوست و شاگرد تھے جو ان کی ادبی تخلیقات کی ہر ہر قدم پر داد دیتے اور ان کی غیر معمولی ذہانت اور رچے ہوئے مذاق شاعری کے معترف تھے ، انہوں نے جو کچھ لکھا اپنے تجربے کی بنا پر لکھا چشم دید واقعات قلمبند کئے ۔ دہلی اور لکھنؤ کی ادبی قیادت پر پورا جنوبی ہندوستان متفق الرائے تھا یہی وجہ تھی کہ نسیم نے بھی دہلی اور لکھنؤ والے ملازم اپنے یہاں رکھ لئے تھے اور انہیں اپنی ڈکشنری کہا کرتے تھے ، اور شمالی ہندوستان کی اردو کی پیروی قابل فخر سمجھتے تھے ۔ نسیم بحیثیت شاعر کے بڑے کامیاب رہے جس کی زندہ شہادت ان کے اشعار ہیں جو آج تک زبان زد خاص و عام ہیں گو کہ ان کے کلام کا تجزیہ میرے موضوع سے متعلق نہیں لیکن اتنا تو ضرور

کہنا پڑے گا کہ شگفتگی بیان رنگینی مضامین دل کشی اسلوب نگارش کی وجہ سے وہ اپنے معاصرین میں ممتاز سمجھے جاتے تھے۔ نسیم کی زندگی کے حالات کے مطالعے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ انکی عمر کا بیشتر حصہ فارغ البالی اور عیش و عشرت میں گذرا. انگریزوں کی رفاقت اور دوستی انہیں میسر تھی اگر چاہتے تو اپنے اثر و رسوخ سے فائدہ اٹھاکر بڑے سے بڑا منصب حاصل کرتے کیوں کہ ایک تو خاندانی نجابت کی بنا پر اور دوسرے اپنے اخلاق و عادات اور علم و فضل کی وجہ سے فرمانروایان ملک سے خراج تحسین وصول کررہے تھے. انھوں نے ایک مرتبہ ایک بڑا منصب پایا بھی لیکن اپنی بے چین اور متلون مزاج طبعیت کے سبب اس کو سنبھال نہ سکے. گذر معاش سے مطمئن ہوتے ہی فوراً ہی اس عہدے سے مستعفی ہوکر علم و ادب کی پیاس بجھانے میں شبانہ روز مصروف ہوگئے، اور درحقیقت اس میلان طبع، ذوق ادبی اور مساعدت وقت نے انہیں اس کا موقع دیا کہ آج ان کا نام اس زمانے کے میسوری شعراء و ادبا میں سرفہرست نظر آرہا ہے.

ہندوستانی قصوں سے ماخوذ

اُردو مثنویاں

از

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

قیمت: چھ روپے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی

* جناب سخاوت مرزا

ریختہ ثناء گجراتی بزبان ہیکلی

شیخ ثناءاللہ المتخلص بہ ثناء مولانا قاضی نور الدین حسین خاں، مؤلف مخزن شعراء گجرات نے ثناء احمد آبادی کا اس طرح تعارف کرایا ہے:

ثناء تخلص[1] شیخ ثناء اللہ از شیخ زادگان احمد آباد بودہ و از اجل تلامذہ محمد ولی المتخلص بہ ولی و کسب فیض باطنی از خدمت مخدوم العالم مولانا محمد نور الدین حسین صدیقی سہروردی حاصل ساختہ، و در زمان محمد شاہ در ہنگام زخمی شدہ، حضرت مولانا شربت شہادت چشیدہ و عمرٗ گرا نمایہ خود را بصدق دل نثار پیر خود کردہ محاورہ اش با محاورۂ حال فرقے دارد و بعید مضامین درست می یابد، تا ایں یک دو شعر کہ موافق محاورہ جدید اہل گجرات است از مضامین قدیمہ بہم رسید، در ایں اوراق ثبت گردید.

یہ ہوگئی ہے اسے نام سے ثنا کے ضد ٭ کہ ثنا خدا کی بھی وہ بت نہیں کیا کرتا
ثنا کا کام یہی ہے کہ اپنے منہ سے بس ٭ سدا ثنا، دہن یار کی کیا کرتا

آگے اس قاتل خونریز کے مقتل کے ثنا ٭ جس نے سر اپنا جھکایا وہ سرافراز ہوا

گویا، شیخ ثناء اللہ، احمد آباد کے شیخ زادہ تھے، تعلیم و تربیت ظاہری و باطنی اور علوم کی تکمیل گجرات کے مشہور و معرف علامہ شیخ نور الدین[2] حسین صدیقی سہروردیؒ المتوفی (سنہ ١٠٦٤/١١٥٥ع) سے کی، جو علوم ظاہری میں اخوند احمد، مولانا سلیمان اور ملا فرید الدین احمد آبادی کے شاگرد تھے. اس طرح ثناء کا سلسلۂ شاگردی مولانا اخوند احمد، مولانا سلیمان اور ملا فرید الدین سے ملتا ہے، اور علوم باطنی میں، ثناء چونکہ مولانا نور الدین ہی کے مرید تھے، لہذا ثنا سہروردی

---

* جناب سخاوت مرزا، بی. اے. ایل. ایل. بی. حیدرآباد، دکن.

١ مخزن شعراء گجرات مطبوعہ ٣٥

٢ تذکرہ اولیاء دکن، عبدالجبار خان ملکاپوری، مطبوعہ جلد دوم.

الطریقه تھے ان کا سلسله ارادت بیک واسطه حضرت سید محمد ابو المجد محبوب عالم[1] بخاری (سنه ١٠٤٧ / ١١١١ھ) معاصر شاهجهاں و عالمگیر ابن سید جعفر بدر عالم[2] بخاری (وفات سنه ١٠٨٥ھ) از اولاد سید جلال بخاری المعروف به مخدوم[3] جهانیاں جهانگشت قدس سره المتوفی (٧٨٥ھ) تک پهنچتا ہے.

اردو شاعری میں بابائے ریخته، ولی گجراتی، المتوفی ١١١٩ھ سے تلمذ تها اور اجل تلامذه ولی میں شمار تها. وفات ثناء گجراتی بزمانه محمد شاه دهلی (١١٣١ھ - ١١٦١ھ) مطابق (١٧١٩ء - ١٧٤٨ء) کسی معرکه میں زخمی ہوکر جام شهادت نوش فرمایا. اس طرح ثناء نے تین سلاطین مغلیه یعنی شاهجهاں کے آخری عهد میں پیدا ہوے، عالمگیر اورنگ زیب سنه ١٠٦٨ھ - ١١١٧ھ کا زمانه دیکها اور شاید اوایل عهد محمد شاه دہلی میں مابعد سنه ١١٣١ھ واصل بحق ہرئے. اپنے استاد ولی، اور استاد صوری و معنوی شاه نور الدین رح سے پورا پورا استفاده کیا. چونکه ولی بهی شیخ نور الدین رح کے شاگرد تهے، اس لئے ثناء ولی کے خواجه تاش تهے، اور ریخته میں ولی سے تلمذ تها. کتبخانه دانش گاه پنجاب میں اسی ثناء الله ثناء گجراتی کا مکتوبه دیوان ولی کا ایک نسخه ہے جس کا سنه کتابت سنه ٨ جلوس محمد شاهی مطابق ١٣٣٨ھ ہے مگر کاتب نے اپنا نام ثناءالله لکها ہے اور تخلص فانی، یا شاید ثناء الله ثانی یا ثناء کو ثانی لکهدیا ہے جو سهو کتابت معلوم ہوتا ہے، اگر یه صحیح ہے تو ثناء گجراتی سنه ١١٣٨ھ تک بقید حیات تهے. مقام کتابت احمد آباد ہے. اس نسخه کا حواله کلیات ولی مرتبه سید نور الحسن ہاشمی میں نہیں ہے، اور یه نصیر حسین خان خیال کے نسخه کے بعد سب سے قدیم ہے.

ثناء کے کلام کے متعلق فائق نے لکها ہے که « محاوره اش با محاورهٔ حال فرقے دارد ببعید » « مضامین درست می یابد، تا ایں یک دو شعر که موافق محاورهٔ جدید اہل گجرات است از مضامین قدیمه بهم رسید » جس سے واضح ہے که ثناء کا ابتدائی کلام قدیم طرز میں تها، اور جدید طرز اور محاوره میں بهی دستگاه حاصل کی تهی، اور اپنے استاد ولی سے اپنے کلام میں بہت زیاده صفائی حاصل کرلی تهی جو نمونه فایق نے دیا ہے اوس میں دکنیت نہیں پائی جاتی ہے. کس قدر صاف شعر کہا ہے:

---

١ تذکره اولیاء دکن ص. ٨٨١ جلد دوم مطبوعه ١٣٣٢ھ حیدرآباد دکن.

٢ ایضاً ص. ٥ - ٨٠٥ نزهة الخواطر عربی مطبوعه ص. ٢٨ دائرة المعارف حیدرآباد.

یہ ہوگئی ہے اسے نام سے ثنا کے ضد ٭ کہ ثنا خدا کی بھی وہ بت نہیں کیاکرتا
اور ہیکلی زبان (توتلی) میں جو غزل ریختہ کہی ہے اوس سے بھی صفائی زبان و بیان ، خوشگوئی و خوش طبعی ظاہر و باہر ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ثناء کو علم عروض پر کامل عبور تھا، اور صنعت تنافر ہیکلی زبان (توتلی) میں آج سے ڈھائی سو سال قبل خوب غزل کہی ہے جس کے نمونے فارسی شعراء کے کلام میں ملتے ہیں. ریختہ میں اس کا سہرا شیخ ثناء اللہ کے سر ہے اور « دیوان پرتو مدراسی مطبوعہ میں جو یہ لکھا ہے کہ « غزل ہیکلی زبان میں اردو نظم کہنے کے موجد حضور مصنف ہیں » غلط ہے. موجودہ دور میں قاضی عباس حسین ظریف دہلوی کی دو غزلیں اسی طرز میں شائع ہوئی ہیں ، اس صنعت کا موجد حکیم قآنی مشہور شاعر بیان کیا جاتا ہے.[1] متاخرین ثناء میں سید شاہ کمال الدین کڑپوی (المتوفی ١٢٢٥ھ) نے جو عربی و فارسی کی فاضل اجل اور ریختہ کے بھی ایک جید شاعر تھے، اسی صنعت تنافر میں دو ایک غزلیں فارسی میں لکھی ہیں چند اشعار بطور نمونہ و تقابل ہدیۂ ناظرین ہیں :

ہیکلی زبان | یہ بھی ایک صنعت شعر ہے جس کو فارسی زبان میں شاید صنعت تنافر کہتے ہیں. جنوبی ہند کے ایک صوفی شاعر شاہ کمال فرماتے ہیں :

ح ح ح ح حبیب حور پیکر　　　　خ خ خ خ خدت خورشید انور
ق ق ق ق قد و زلف د و تایت　　　　س س س س سہی و سنبل تر
ک ک ک ک کمال الدین کلامت　　　　ہ ہ ہ ہ ہمہ چوں در و گوہر

خ خ خ خط تو خضر و ل ل ل لعل تو عیسی　　　　ش ش ش تو یوسف ، ی ی ی ید تو بیضا

مدراس کے ایک شاعر رؤف احمد خان المتخلص پرتو ، معاصر داغ دہلوی نے بھی منجملہ اور لطائف کے اس طرز میں ایک غزل کہی ہے جسکا مطلع یہ ہے :

ت ت تیری ف ف فرقت میں یہ مضطر ہوں میں　　　　پ پ پیارے س س سے بڑھ کر د د دلبر ہوں میں

---

[1] رسالہ صمصم جولائی ١٩٥٩ع ص ٤٦ کراچی .

ریختہ بیکلی زبان، شیخ ثناء اللہ ثناء جو نادر و نایاب ہے بغرض ضیافت طبع درج ذیل ہے تاکہ یہ محفوظ ہو جائے، اس لئے کہ ثناء کا کلام کمیاب ہے، تذکرہ نویسوں نے ان کے دو چار شعر سے زائد نہیں لکھے ہیں:

دہ، ددہ، ددہ، دلبر آیا بہ، بہ، بہ، بانکی ادا کا
پیہ پیہ پیہ پیہ پیہ پہرا[1] ہے جامہ ز ز زری زربفت نما کا
ہیہ ہیہ ہیہ ہاتھ میں دستا[2] خہ، خہ، خہ، خنجر خونی
لہہ، لہہ، لہہ، لہو[3] سے بھرا ہے دہ، ددہ، دامن سو قبا کا
غہ، غہ، غہ، غمزدہ اوپر آ، آ، آ، آ، آج میاکر[4]
تہ، تہ، تہ، تجھ کو دیا ہوں ققہ، ققہ، ققہ، قسم خدا کا
کہہ، کہہ، کہہ، اوس کو کہا میں ننہ، ننہ، نیہ، نین تیری دو نا؟
مہ، مہ، مہ، مست مدن ہو پیہ، پیہ، پیہ پھول حنا کا
سہ، سہ، سہ، ساری عمر میں جہ، جہ، جہ، جان کی زبان سے
ارر[5]، رر، جب ہی کہا ہے ششہ، ششہ، ششہ، شعر ثنا کا

چونکہ یہ غزل ہم کو ایک کشکول شعراء سے دستیاب ہوئی ہے، جس میں بعض شعراء گجرات مثلاً حافظ شیخ داؤد دلکش، میاں عبدالرحمن عرف میٹھا میاں شیخ پربین گجراتی کی اردو غزلیں، اور بعض ہندو شعرائے گجرات فارسی گو مثلاً آتما رام، مکند رام، اور منشی شیو لعل کے کہے ہوئے قطعات تواریخ نوابان گجرات، یعنی نواب میر خیرالدین خان المتوفی ۱۲۳۵ھ و نواب میر نصیر الدین قطب الدولہ المتوفی ۱۶۳۶ھ وغیرہ کی درج ذیل ہیں۔ مثلاً آتما رام نے تاریخ کہی:

عقل چوں سال رحلتش را جست ٭ وے شدہ در بہشت ہاتف گفت
۱۲۳۶ھ

از مکند رام (نواب فلک قدر والی صوات الخ):

سن رحلتش را ز آہ درونی ٭ مکاندار زد، خورد «رفتہ آں ماہ تاباں»
۱۲۳۶ھ

از شیو لعل منشی: «نصیرالدین شہ مہمان فردوس»
۱۲۳۲ھ

---

(۱) پہنا۔ (۲) دکھائی دیتا ہے۔ (۳) لہو۔ (۴) محبت۔ (۵) یعنی ارے، رے، رے۔

جس سے نوابان سورت (گجرات) کا غیر مسلم اقوام سے رواداری اور ہمدردی کا پتہ چلتا ہے ، اس لئے یہ غزل ثناء گجراتی تلمیذ ولی کے ہونے میں کوئی شبہ کی گنجائش نہیں معلوم ہوتی ہے ، اور اس میں تخلص ثناء موجود ہے .

ہم یہاں بعض اور گجراتی شاعروں کے کلام اور انشاء پردازی کا نمونہ درج کرتے ہیں جو کمیاب ہے . تاریخ شادی میر معین الدین[1] خان خلف نواب صفدر جنگ از حافظ محمد داؤد دلکش[2] :

دلکشم گفت چه تاریخ صفائے طبعش ٭ او ز دہاں شست ز آب گہر بسم اللہ

اس بیاض میں مسدس شیخ پیربین کے دس بند ہیں ' ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی نے اپنے مضمون « گجرات کی مثنویاں[3] » میں ان کی ایک مثنوی قصۂ ہیرا لال تصنیف ۱۲۱۶ھ کا نمونہ پیش کیا ہے ، تخلص پربین کی متعلق یہ تاویل کی ہے کہ یہ لفظ پروین ہونا چاہئے ، مگر اس مسدس میں تو « پربین » ہی لکھا ہوا ہے . لغت میں پرُ بمعنی بسیار آتے ہیں ، جیسے ' پرُ ' معنی ' بزدل ' اسی طرح « پربین » شاید صحیح ہوگا :

جب تُہیں صبح و شام سب مل کر پیا پیا ٭ جو سنگدل تھے ان کا بھی پل میں کھلا ہیا
ستنی[4] کی دید بی سیں وو بڑنے لگے شیا[5] ٭ آڑے سبوں کے آیا کچھ اون کا دیا لیا
سب کو کئے نمازی بڑا مرتبہ دیا ٭ اس دور میں خدا نے اپس[6] کا فضل کیا

چھوٹے بڑے نمازاں پڑیں مل کے دمبدم ٭ پڑنے درود کلماں ، وو قرآن کریں ختم
دل پر میرے عزیزاں ایکا ایک ہوا عزم ٭ سن بارہ سے تے تیس میں باندہا ہے یہ نظم
۱۲۳۰ھ
سب کو کئے نمازی بڑا مرتبہ دیا

گویا اس مسدس کا سنہ تصنیف ۱۲۳۰ ھ ہے جس کا ذکر مدنی صاحب نے نہیں

---

۱ کشکول قلمی ص ۱۹۰ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن .
۲ تذکرۂ مخزن شعراء گجرات ص ۴۰ مطبوعہ دلکش عدالت سورت کے منصف تھے ، ان کی ایک مثنوی لطائف الظرائف بطرز بوستان سعدی بھی بیان کیجاتی ہے .
۳ نوائے ادب بمبئی جولائی ۱۹۵۴ع ص ۱۰-۱۲ .
۴ ستی : سنت جماعت .
۵ شیعہ کا قدیم املا .
۶ اپنا .

کیا ہے، اس کشکول میں گجراتیوں کے بعض اردو انشا پردازی کے نمونے بھی ہیں، جس کا ایک خط بطور نمونہ درج ہے، اردو میں دو رقعے شبیر حسین کے بنام میر شمس الدین قلمی درج ہیں، جن کے منجملہ ایک رقعہ درج ذیل ہے، یہ اردو میں فارسی طرز انشا پردازی کا ایک نمونہ ہے جو گجرات میں مروج تھا، اور یہ تیرھویں صدی کے ربع اول سے متعلق معلوم ہوتا ہے:

میر صاحب قبلہ امان و امانی و کعبۂ گلشن کامرنی سلامت

بعد بندگی و نیاز گذارش جناب مستطاب کے ہو جیو، اشہب ارادت ہمارا کئی دن سے اگاڑی پچھاڑی توڑ رہا ہے کہ آپ کے میدان کرم میں حاضر ہوکے کچھ جھندگی کرے، لیکن مونہ زوری اس زمانے کہنہ لنگ نے ایسا تنگ کر رکھا ہے کہ اصلا راضی نہیں دیتا اس واسطے اس وادی ناتمام سے اقدام کرکے مطلب گذارش کرتا ہے کہ اس وقت صاحب والا فراست کے توسن طبع میں یوں جولانی آئی کہ کتاب خالق باری کہیں سے منگواؤ یہ نا کند محبت؟ سوائے آپ کی، نعل عقیدت کسی سے نہیں رکھتا ہے اس لئے بلا تکلف عرض کرتا ہے کہ عیال مطلب ہمارا اگر آپ کے زمام اختیار میں ہو تو عنایت فرماویں، زیادہ بندگی.

تنقید و تبصرہ

* محمد شعیب اعظمی

ادبی نقوش

دار المصنفین اپنی علمی، تاریخی، تحقیقی اور تالیفی خدمات کے لئے ایک زمانے سے مشہور ہے۔ یہاں کے اہل قلم نے اپنی ادبی اور علمی سرگرمیوں سے تشنگان و دلدادگان ادب کی پیاس بجھائی ہے۔ انہیں لوگوں میں مولانا شاہ معین الدین ندوی کی ذات گرامی ہے جو اپنی مدیرانہ مصروفیت کے باوجود وقتاً فوقتاً علمی، ادبی و تنقیدی مضامین لکھتے رہے ہیں اور مختلف رسائل میں شائع ہونے کے بعد اب یہ «ادبی نقوش» کے نام سے مجموعہ کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔

ادبی نقوش میں (۹) مضامین ہیں، اور تقریباً ہر مضمون توجہ سے پڑھے جانے کا مستحق ہے لیکن «اردو شاعری میں ہندو کلچر اور ہندوستان کے طبعی اور جغرافی اثرات» «اردو زبان کی لسانی، علمی اور تمدنی اہمیت» اور «کیا اقبال فرقہ پرست تھے» خصوصاً زیادہ اہم ہیں۔

اردو شاعری پر یہ عام اعتراض ہے کہ وہ محض گل و بلبل یا حسن و عشق کی شاعری ہے اور اس کا ماحول اور فضا غیر ملکی اوس کی تشبیہیں اور استعارے ہندوستانی سامانوں کے بجائے ایرانی سامانوں سے آراستہ ہیں۔ ان سب اعتراضات کا جواب شاہ صاحب نے تفصیل کے ساتھ دیا ہے۔

اردو شاعری میں خالص ہندوانہ، مذہبی اور ثقافتی الفاظ اصطلاحات اور خیالات جس کثرت سے استعمال ہوئے ہیں اون کی مثالوں میں شاہ صاحب نے وہ ترکیبیں بھی لکھی ہیں جو فارسی کے اثر سے بنیں۔ دیوتاؤں کے نام اردو شاعری کا موضوع بن کر تشبیہہ استعارہ کی دنیا میں جس طرح داخل ہوئے ہیں، اون کی مثالیں بھی دی ہیں، ہندو دیومالا کے اقسام جیسے کھنیّا، پاربتی، شیوجی برہما، بھیم، گردہاری

* محمد شعیب اعظمی ایم۔ اے بی ایڈ۔ انجمن اسلام بمبئی۔

کالی اور رام کا ذکر ولی، آتش، ذوق وغیرہ کے اشعار سے لیکر آج تک کے شعرا کے کلام میں ملتا ہے۔

اسی طرح اردو شاعری میں ہندی بحروں کا اثر یا استعمال ہندو دیومالا کے قصے، ہندو مذہب سے مسلمان شعراء کا تعلق، ہندو تہوار، ہولی، دیوالی، جنم اشٹمی بسنت، شادی غمی کے رسوم، سہرا، رنڈاپا، توہمات، ہندوستانی زیورات، آلاتِ موسیقی، ناچ رنگ پھر جغرافیائی اثرات کے تحت، حبُ وطن، ہندوستانی مناظر، موسم غرض کوئی ایسا موضوع نہیں جس کا تذکرہ فاضل مصنف نے نہ کیا ہو اور اس کی مثالیں شعراء کے کلام سے نہ دی ہوں۔ یہ مثالیں بیشتر متوسطین کے کلام سے لی گئی ہیں قدیم شعراء جیسے محمّد قلی قطبؔ شاہ، محمود بحری، وجہی وغیرہ کے کلام سے نہیں دی گئی ہیں حالانکہ قدما کا کلام ہندوستانی عناصر سے پر ہے اور ان کے یہاں ہندوستانی فضا متوسطین اور متاخرین سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ جہاں تک ہندی بحروں اور تلمیحات کا تعلق ہے اس پر بھی دوسرے موضوعات کی طرح تفصیل سے لکھا جاسکتا تھا۔

حبُ وطن کے سلسلہ میں شاہ صاحب نے قدیم شعراء کی وطنی نظموں کا تذکرہ نہیں کیا، حالانکہ ان کا کلام اس قسم کے جذبات سے خالی نہیں، اگر قدیم شعراء کو اس لئے نظر انداز کیا گیا کہ ان کے یہاں حبُ وطن کے موضوع پر براہ راست کچھ نہیں لکھا گیا تو کم از کم شیفتہ کی اس نظم کا ذکر تو انہیں ضرور کرنا چاہئے تھا جس کا مطلع یہ ہے:

ہند کی وہ زمیں ہے عشرت خیز ۞ کہ نہ زاہد کریں جہاں پرہیز

یہ صحیح ہے کہ اردو شاعری وطنی نظموں سے پر ہے، دور جدید میں خصوصیت کے ساتھ اس موضوع پر بیشمار نظمیں لکھی گئی ہیں، اس لئے ان تمام کا مطالعہ تو کیا ذکر بھی مشکل ہے لیکن آنند نرائن ملاّ کی نظم «زمین وطن» کے چند بند کا ذکر ضرور کرنا چاہئے تھا، یہ بڑی پاکیزہ و شگفتہ نظم ہے مثلاً مندرجہ ذیل بند پڑھئے:

زمین وطن ! اے زمین وطن ! !

ترے کوہ و دریا جمال آفریں
تری وادیاں رشک خلد بریں
کسی نے تجھے یوں بنایا حسیں

که جیسے سنواری گئی ہو دلہن
زمین وطن! اے زمین وطن!!

«اردو کی لسانی اهمیت» کو اگر حاصل کتاب کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا. اگر چه اس موضوع پر مولانا سید سلیمان ندوی نے «نقوشِ سلیمانی» میں شرح و بسط کے ساتھ جو کچھ لکھا ہے وہ ناکافی نہیں ہے، مگر شاہ صاحب نے اعادہ کے طور پر اس موضوع میں تھوڑی سی اور وسعت پیدا کی ہے کہ کس طرح اردو زبان نے تھوڑے ہی عرصہ میں ایک خاص مقام حاصل کرکے دنیا کے بیشتر علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کے سلسلہ میں اظہار خیال کے لئے الفاظ کا ذخیرہ اپنے خزانہ میں جمع کرنے کی صلاحیت پیدا کرلی اور دوسری زبانوں کی ہم پلّہ بن کر ایک علمی زبان بن گئی. اس مضمون کا دلچسپ حصہ خود اردو کی وسعت دامنی کا ہے کہ کس طرح دیسی زبان کے سابقوں اور لاحقوں کے ساتھ ہی ساتھ عربی اور فارسی کے سابقوں اور لاحقوں کو بھی اپنالیا ہے، آخر میں اردو زبان کی قواعدی دشواریاں، حروف تہجی کی آسانی، اس کا دوسری زبانوں سے رشتہ، اس کی تہذیبی اور تمدنی روایت کی رنگارنگی اور اردو شاعری کی ان خصوصیات کے ساتھ اس کے سیاسی اثرات کا تذکرہ مضمون کی افادیت اور اهمیت کو بڑھاتا ہے، اگرچہ یہ ایک چھوٹا سا مقالہ ہے مگر وزن اور اهمیت کے لحاظ سے بڑا گراں قدر ہے.

اقبال پر فرقہ پرستی کا الزام لگایا جاتا ہے، مصنف نے اس کی تردید میں جہاں اقبال کی حکومت الٰہیہ کے تصور اور ان کی خالص اسلامی شاعری کو پیش کیا ہے وہیں اسلامی عقاید کی مثالوں کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری کے وہ موضوعات جو خالص ہندوستانی ماحول، فضا، زمین اور اس کے سپوتوں سے متعلق ہیں اور جن سے اقبال کی اپنے وطن سے گہری عقیدت اور خلوص کا اظہار ہوتا ہے، بہترین مثالوں کے ساتھ پیش کیا ہے. مادر وطن کی غلامی پر جس قدر سینہ کوبی اور ماتم سرائی کی ہے اس کی نظیر ہندوستان کے کسی شاعر کے یہاں نہیں ملتی. مثلاً:

می ندانی خطۂ ہندوستاں — آں عزیز خاطر صاحب دلاں
خطۂ ہر جلوہ اش گیتی فروز — درمیان خاک و خوں غلطد ہنوز
در گلشن تخم غلامی را کہ کشت — ایں ہمہ کردار آں ارواح زشت

ان کے اسلامی عقاید کے ساتھ ہندوستان کے صلحا و اخیار مثلاً رامچندرجی، گوتم بدھ، گرونانک، بھرتری وغیرہ کے ساتھ ان کی بے پناہ عقیدت کے نمونے بھی

ملتے ہیں۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا اقبال پر کس بنا پر فرقہ پرستی کا الزام لگایا جاتا ہے۔

ریاض، مجذوب، اصغر اور جگر کے کلام کے مجموعوں پر شاہ صاحب نے جو تبصرہ کیا ہے ان میں ہر ایک کا اپنا انفرادی رنگ نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے، اس ضمن میں مناسب موقعوں پر ان کے مناسب اشعار پیش کئے ہیں۔

« سہیل اور نعت » نبوی مندرجہ بالا مضامین سے مختلف ہے۔ اس میں سہیل کی نعت گوئی پر تبصرہ ہے، نعت ایک مشکل صنف ہے جس میں قادرالکلام سے قادرالکلام شاعر بھی احتیاط و احترام سے قدم پھونک پھونک کر رکھتا ہے، لیکن سہیل نے اپنی عظیم شاعرانہ صلاحیتوں اور عربی اور فارسی زبان پر عبور حاصل ہونے کی وجہ سے اس میدان میں اپنی شہسواری کے خوب جوہر دکھائے ہیں اور نازک موقوں پر اس کامیابی سے قلم اٹھایا ہے کہ حیرت ہوتی ہے، اس مضمون سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ سہیل کے بیان میں زور اور طرز ادا میں دل کشی اور بانکپن ہے۔

ادبی نقوش کا آخری مضمون « مولانا عبد السلام ندوی » ہے۔ جن لوگوں نے مولانا عبد السلام مرحوم کو قریب سے دیکھا ہے اور ان کی محبت میں رہے ہیں، وہ اس مضمون کی عمدگی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ شاہ صاحب نے ایک طویل رفاقت کا وہ حق ادا کیا ہے جو اہل علم ہی کا حصہ ہوا کرتی ہے۔ شاید مولانا عبد السلام کا یہ زندہ جاوید سراپا کوئی نہ کھینچ سکتا۔ مرحوم کے علمی و ادبی ذوق، عادات و اطوار ان کی بے نیازی سادگی کے ساتھ پرکاری اور معصومیت کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا ہے کہ آج بھی مولانا عبدالسلام آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔

شاہ صاحب دار المصنفین کے ایک دیرینہ رفیق ہیں۔ ان کی زبان میں وہی سادگی، سلاست اور ساتھ ہی رنگینی جھلکتی ہے جو دبستان شبلی کا خاص امتیاز ہے۔ شاہ صاحب مشرقی تنقید کے پیرو ہیں اور مرنجان مرنج تنقید کا رنگ ان کے مضامین میں غالب ہے۔

ادبی نقوش کی اشاعت اردو کے علمی و ادبی سرمایہ میں ایک خوش گوار اضافہ ہے۔

تبصرے

عظمت رفتہ

مصنف : جناب ضیاء الدین احمد برنی بی۔ اے۔
صفحات : ۵۰۱ ـ ۵۱۲ قیمت : دس روپے۔
ملنے کا پتہ: تعلیمی مرکز کراچی نمبر ۱ (پاکستان)

آج سے پندرہ سترہ برس پہلے بمبئی کی کوئی اسلامی علمی ، ادبی تعلیمی اور شاید سیاسی مجلس ایسی نہ تھی جس سے جناب ضیاءالدین برنی صاحب کو بالواسطہ یا بلا واسطہ تعلق نہ رہا ہو، اس لئے وہ لوگ جو اس زمانے کے بمبئی میں رہتے تھے ان سے اچھی طرح واقف ہی نہ تھے بلکہ ان کو ایک انجمن سمجھتے تھے. وہ دہلی میں پیدا ہوئے وہیں تعلیم حاصل کی اور پھر کچھ دنوں کانپور میں رہ کر بمبئی آگئے ، اس لئے ان کے ملنے والوں میں زیادہ تر وہ لوگ ہیں جن کا تعلق کسی نہ کسی صورت سے ان شہروں سے رہا ہے. خواجہ حسن نظامی اور ریورنڈ اینڈ ریوز کی روحانی و ذہنی تعلیم نے ان کو مرنجان مرنج ، یار دوست ، صاحب درد اور تبسم بار بنا دیا ہے. وہ اپنی وضع کے بڑے پابند اور اپنے اصولوں میں بڑے مستقل ہیں ، یہی وجہ ہے کہ وہ ہر قوم و مذھب اور ہر دبستان فکر و نظر کے افراد سے یکساں تعلقات رکھ سکے. ان کی نیک دلی کا سب سے بڑا ثبوت تو یہ ہے کہ انہوں نے بابائے اردو کو ملا کر ۹۴ ممتاز اشخاص کے حالات لکھے ہیں جن سے بلا واسطہ وہ کم یا زیادہ ملے تھے ، اور ان میں سے کسی کے خلاف بھی اس میں کوئی لفظ بھی ایسا نہیں ہے جس سے ان میں سے کسی ایک کی کسی بھی کمزوری یا کمی کا پتہ چل سکے. یہ تذکرہ در اصل ایک ایسا تاریخی مرقع ہے جس کے ذریعہ ایک مصنف یا محقق اپنے لئے مواد حاصل کرسکتا ہے. پھر تصویروں نے اس کتاب کی اہمیت و حسن کو اور بڑھا دیا ہے ، ابتدا میں جناب مولانا عبدالماجد دریا بادی کا مقدمہ ہے ، اور ہم کو ان کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ یہ کتاب ایسی کتابوں میں جن سے انسانی زندگی کی اعلیٰ قدریں اجاگر ہوتی ہیں ایک خوشگوار

اضافہ ہے۔ ہم کو امید ہے کہ اس کا مطالعہ ذوق و شوق سے کیا جائے گا۔

« ن »

نساخ سے وحشت تک

مصنف : سید لطیف الرحمن

صفحات : ۳۵۰ قیمت : ۳ روپے ۵۰ نئے پیسے

کاغذ، کتابت، طباعت اوسط درجہ کی

ملنے کا پتہ : عثمانیہ بک ڈپو، اور چیت پور روڈ کلکتہ ۱

اس کتاب میں مصنف نے « ایک سلسلۂ استادی کے چار بنگالی شعرائے اردو یعنی نساخ، انسخ، شمس اور وحشت کی شاعری سے ارباب ذوق کو متعارف کرایا ہے » فورٹ ولیم کالج، مرشدآباد اور ھگلی کے بعض شعراء کے کارناموں کے علاوہ ہم کو اس کا کوئی علم نہیں تھا کہ اس علاقہ کے شعرائے اردو نے اردو ادب کی تعمیر و ترقی میں کیا حصہ لیا ہے، اس لئے یہ کتاب کسی حد تک اس کمی کو پورا کرتی ہے۔ اس میں مذکورہ بالا چاروں اساتذہ کے حالات زندگی اور ادبی و شعری کارناموں کا ذکر کیا گیا ہے، مصنف نے حالات و واقعات کے بیان میں بیجا عقیدت کا اظہار نہیں کیا ہے لیکن بعض واقعات کے بیان کرنے میں درایت سے کام نہیں لیا، مثلاً پانچ چھ برس کے نساخ کا اپنے استاد کو پستول لے کر دوڑانا یا اپنے دوسرے استاد کو پنک مارنا خلاف قیاس ہے۔ اس طرح مصنف کا کہنا کہ نساخ « بحیثیت مترجم ماہوار ہزار روپے تک کمانے لگے » تو بے قابل قبول نہیں ہوسکتا۔ مصنف نے وحشت کے حالات زندگی خصوصاً تفصیل کے ساتھ لکھے ہیں جنھیں پڑھ کر ان کی ایک اچھی تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ ان کی شاعری سے متعلق بھی کسی قدر تفصیل سے لکھا ہے، زبان و بیان کے بعض خامیوں سے قطع نظر کتاب مجموعی حیثیت سے دلچسپ اور لائق مطالعہ ہے۔

« ع. ر. ق. »

کلمة الحقائق

از : شاہ برہان الدین جانم بیجاپوری

مرتبہ :- (۱) محمد اکبر الدین صدیقی (۲) ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ

ملنے کا پتہ : (۱) ادارہ ادبیات اردو خیرت آباد حیدرآباد . (اے . پی .)
(۲) مجلس تحقیقات اردو حیدرآباد

تحقیق و تنقید کی راہ بڑی دشوار گذار ہے ، جن لوگوں کا مبلغ علم محدود ، شعور نا پختہ اور طلب غیر صادق ہو وہ اس راہ میں دو قدم بھی نہیں چل سکتے . ہمیں خوشی ہے کہ گذشتہ پندرہ بیس سال کے عرصہ میں اردو زبان و ادب کی قدیم ترین کتابوں کی تحقیق و تنقید کی طرف بعض صائب الرائے اور اہل علم حضرات نے توجہ فرمائی ہے ، یہی وجہ ہے کہ آئے دن اس قسم کی تحریریں ہمارے سامنے آتی رہتی ہیں جن سے اردو کی قدامت ، ہردلعزیزی اور وسعت کا اندازہ ہوتا ہے .

حال ہی میں حضرت سید شاہ برہان الدین جانم بیجاپوری کے مواعظ کا ایک مجموعہ « کلمۃ الحقائق » کے نام سے ایڈٹ ہوکر شائع ہوا ہے ، اس کتاب کی تاریخی عظمت اور لسانی اہمیت کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ اسے بیک وقت جناب محمد اکبرالدین صدیقی نے ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد کی طرف سے اور محترمہ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے مجلس تحقیقات اردو ، حیدآباد دکن کی جانب سے ایڈٹ کیا ہے . عجیب اتفاق یہ ہے کہ یہ دونوں کتابیں سنہ ۱۹۶۱ع ہی میں طبع ہوئیں .

« کلمۃ الحقائق » کہنے کو سلوک و معرفت کے مختلف موضوعات پر ایک رسالہ ہے لیکن اس کے استدلال کی گہرائی و گیرائی اور سب سے بڑھ کر اسکی لسانی حیثیت کو خاص اہمیت حاصل ہے یہ اس دور کی کتاب ہے جب اردو زبان سیالی حالت میں تھی ، باالخصوص اردو نثر کی نیو رکھی جارہی تھی ، جس طرح شاہ بندہ نواز گیسو دراز کی نثری تصنیف « معراج العاشقین » اردو نثر کی ابتدائی اسالیب میں اولیت کا شرف رکھتی ہے ، اس طرح کلمۃ الحقائق بھی اردو نثر کی عمارت کی بنیادی اینٹ ہے . یہاں ہمیں رسالۂ مذکور کی ادبی اور لسانی حیثیت پر تفصیلی گفتگو کی ضرورت نہیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ دونوں مذکورۂ بالا ایڈیشنوں میں کونسی ایسی باتیں ہیں جو ایک کو دوسرے سے ممتاز کرتی ہیں .

پروفیسر صدیقی نے اپنے ایڈیشن کے مقدمہ میں حضرت میراں جی شمس العشاق اور ان کے صاحبزادے شاہ برہان الدین جانم ، صاحب کلمۃ الحقائق کا شجرہ اور

مختصر سوانح پیش کئے ہیں، ان بزرگوں کی شہرت اور ان کی دینی خدمات کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ اس کے بعد رسالہ کلمۃ الحقائق کے مختلف معلوم شدہ مخطوطات سے بحث کی ہے، اس کے سن تصنیف اور سنہ کتابت کا بھی پتہ لگایا ہے، اس کے بعد اس کی لسانی خصوصیات کا مختصر جائزہ لیتے ہوئے اس کے موضوع پر روشنی ڈالی ہے، اصل متن کتاب صفحہ ۲۱ سے ۱۱۲ تک پھیلا ہوا ہے، حواشی بھی دئیے ہیں اور آخر میں چھ صفحات پر مشتمل ایک فرہنگ بھی شامل کیا ہے۔

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کے ایڈٹ کئے ہوئے نسخہ میں پروفیسر عبد القادر سروری کا پیش لفظ بھی شامل ہے جس میں انہوں نے کلمۃ الحقائق کے مطالعہ کی ضرورت کو واضح کیا ہے، ڈاکٹر سلطانہ نے اپنے مقدمہ میں حسب ذیل ذیلی سرخیاں قائم کی ہیں:

مصنف	ص	۲ ــ ۵
حالات زندگی	ص	۵ ــ ۸
نثری رسالے	ص	۹ ــ ۱۰
اسلوب اور زبان	ص	۱۰ ــ ۱۱
تشبیہ و استعارہ کا استعمال	ص	۱۱ ــ ۱۳

اس کے بعد رسالہ میں پائے جانے والے قواعد کے اجزا مثلاً اسماً، تعداد، ضمیر، صفات، افعال، مضارع وغیرہ سے بحث کی ہے، شاہ جانم رح کی دیگر تصانیف کی اہمیت کو بھی واضح کیا ہے، رفیعہ سلطانہ صاحبہ کے مقدمہ میں دو خاص سرخیاں اور بھی ہیں یعنی معراج العاشقین اور کلمۃ الحقائق کا موازنہ اور کلمۃ الحقائق کا بھگتی تحریک سے تعلق رسالہ کے مختلف نسخوں کی نشان دھی بھی کی ہے، اس کتاب میں فرہنگ وغیرہ نہیں ہے البتہ ضروری حواشی موجود ہیں۔

پروفیسر صدیقی اور ڈاکٹر سلطانہ کے نسخوں کا متن ایک ہی ہے مگر اسکی ترتیب میں کچھ فرق ہے مثلاً، صدیقی صاحب نے ابتدائی عربی عبارت اور کچھ فارسی عبارت بجائے اصل متن میں دینے کے حاشیہ میں دے دی ہے، ڈاکٹر سلطانہ نے اسے بھی اصل کتاب میں شامل کردیا ہے۔

"س۔ م۔ ح۔"

جوالا مکھی

از : اننت گوپال شیوڈے

مترجمہ : ڈاکٹر محمد حسن

قیمت : دو روپے پچاس نئے پیسے ، ص ۲۵۲

پتہ : ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈیویژن ، اولڈ سیکریٹریٹ دہلی ۸

قیـد خانوں میں جسم بند کئے جاتے ہیں ' لیکن یہی بندش دل و دماغ اور قلب و روح کے کتنے دروازے کھول دیتی ہے . دنیا کی ہدایت و ادب کے قیمتی سرمایے میں ، جیل خانون کا پیدا کیا ہوا سرمایہ بہت اہم ہے . جوالا مکھی بھی در اصل دل و دماغ کی اسی شعلہ بار شوق آزادی کی زندگی بخش اور حرارت زا جد وجہد کی ایک صحیح روئداد ہے ، اس ناول نے ہماری جنگ آزادی کے ایک مخصوص پرُشکوہ عہد کی بڑی اچھی منظر کشی کی ہے فنی اور ادبی حیثیت سے بلند ترین ادیبوں سے خراج تحسین حاصل کیا ہے ، یہی وجہ ہے کہ نیشنل بک ٹرسٹ نے صحیح طور سے یہ طے کیا کہ اس ہندی ناول کے مطالعہ سے ملک کی دوسری زبان والے محروم نہ رہیں اور اب یہ اردو کے جامہ میں ہمارے سامنے موجود ہے . ترجمہ کی خوبی و صحت کے لئے مترجم کا نام کافی ہے . سچ تو یہ ہے کہ جس زبان میں یہ ترجمہ پیش کیا گیا ہے اگر یہی زبان ملک میں رائج ہوجائے تو زبان کا مسئلہ اور اس سے متعلق مشکل ہونے کی شکایت بڑی حد تک دور ہوجائیگی . یہ ناول اس پایہ کا ہے کہ اسے ہر ادب دوست محب وطن کو پڑھنا چاہئے .

« ن »

مقالـــہ نمـا

مرتب:

حامد اللہ ندوی

معـاونین:

سید مجاہد حسـین حسینی

عبد الستار دلوی

علاؤ الدین جینابڑے

فہرست عنوانات

۱	مذہبیات	۱
۲	تذکرہ و سیرت نگاری	۲
۳	تاریخ و سیاسیات	۴
۴	تنقید، ادب، لسانیات	۶
۵	متفرقات	۱۳

مذہبیات

۱ اصلاحی صدر الدین
روزہ۔ اسلام کا چوتھا ستون
(زندگی رام پور ۶۲ فروری ۴۵ ۔ ۹۸)

۲ امین محمد تقی
لامذہبی دور کا تاریخی پس منظر
(برہان دہلی ۶۲ جنوری ۔فروری)
مذکورہ مضمون کی دوسری اور تیسری قسط

۳ جرمانوس عبد الکریم
اسلام کے متعلق ہنگری کے نومسلم ڈاکٹر جرمانوس کے تأثرات
(عارف لاہور ۶۲ فروری ۳۵ ۔ ۴۲)

۴ خواجہ بدر : مترجم
نظریہ ارتقا اور مذہب
(ثقافت لاہور ۶۲ مارچ ۱۹ ۔ ۳۲)

۵ درد کاکوری
حج اور اس کا فلسفہ
(تعمیر انسانیت، لاہور ۶۲ فروری ۔ مارچ ۵ ۔ ۸)

۶ رحمانی عبد الرؤف
جب اسلام کارفرما تھا
(تجلی دیوبند ۶۲ جنوری ۔ فروری ۔ مارچ)
صحابہ کرام کے اخلاق حسنہ کی تفصیلات . (مسلسل مضمون تین قسطیں)

۷ صدیقی عبدالحمید
نبوت کی ضرورت
(ترجمان القرآن لاہور ۶۲ فروری)
مذکورہ مضمون کی دوسری قسط

۸ عثمان شمس نوید
کیا ہم مسلمان ہیں
(تجلی دیوبند ۶۲ جنوری ۔ فروری ۔ مارچ)
آج کے مسلمانوں کے اخلاق کا مقابلہ صحابہ کرام کے اخلاق حسنہ سے .
(ایک مسلسل مضمون کی تین قسطیں)

۹ عمری جلال الدین
خدا کی تلاش ، خدا کی کتاب میں
(زندگی رام پور ۶۲ جنوری ۹ ۔ ۲۸)
خدا کی ذات و صفات اور اس تک پہنچنے کا راستہ قرآن کی روشنی میں

۱۰ عمری جلال الدین
خدا کی ذات
(زندگی رامپور ۶۲ فروری ۲۴ ۔ ۴۴)
خدا کی ذات ، اس کی صفات اور اس کے دائرۂ عمل کی تشریح قرآن کی روشنی میں

۱۱ غوری شبیر احمد خان
اسلام میں علم و حکمت کا آغاز
(معارف اعظم گڑھ ۶۲ مارچ)
مسلمانوں نے علوم عقلیہ کی ترویج

میں جو حصہ ادا کیا ہے اس کی تفصیلات

۱۲ فضل الرحمن
«کمرشیل انٹرسٹ کی فقہی حیثیت»
کا تنقیدی جائزہ
(برہان دہلی ۶۲ جنوری - فروری - مارچ)
جعفر شاہ پھلواروی کی کتاب
«کمرشیل انٹرسٹ کی فقہی حیثیت» کا
تنقیدی جائزہ قسط ۱، ۲، ۳

۱۳ فضل قدیر
فرمودۂ رسول
عبادت کا دعا سے تعلق
(فیض الاسلام، راولپنڈی ۶۲ جنوری ۱۹-۲۲)

۱۴ ماہر القادری
اسلام کیا ہے
(فاران کراچی ۶۲ فروری ۱۷ - ۲۵)

۱۵ منظور نعمانی
معارف الحدیث (مسلسل)
(الفرقان لکھنؤ، سنہ ۸۱ رجب ۶ - ۱۴)
نماز میں امامت کے مسئلہ کی اہمیت
کو واضح کیا ہے

۱۶ منظور نعمانی
معارف الحدیث (مسلسل)
(الفرقان لکھنؤ، سنہ ۸۱ رمضان ۵ - ۱۱)
نماز پڑھنے کے طریقوں سے بحث
کی ہے

۱۷ ندوی شاہ معین الدین
دین رحمت
(معارف اعظم گڈھ ۶۲ جنوری - فروری)

۱۸ ندوی محمد حنیف
قرآن میں رمز و اشارہ کی چند مثالیں
(ثقافت لاہور ۶۲ فروری ۷ - ۱۶)
مضمون کی پہلی قسط

۱۹ نذیر احمد صوفی
سیرت مومنانہ کی تعمیر کے مرکزی
نقاط
(برہان دہلی ۶۲ جنوری - فروری)
مذکورہ مضمون کی پہلی اور دوسری
قسط

۲۰ نعیم صدیقی
مطلق العناں اقتدار کے تحت محدود
مذہبی مناصب
(ترجمان القرآن لاہور ۶۲ جنوری، مارچ)
مذکورہ مضمون کی چھٹی اور ساتویں
قسط

۲۱ وحید الدین خان
قرآن اور علم جدید
(زندگی رام پور ۶۲ جنوری ۲۹ - ۳۶)
ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی کتاب
«قرآن اور علم جدید» پر تفصیلی تبصرہ

تذکرہ و سیرت نگاری

۲۲ ابوالقاسم رفیق دلاوری
تاریخ کے آئینہ میں

قاضی منذر اور خلیفہ الناصر الدین اللہ
(تعمیر انسانیت، لاہور ۶۲ جنوری ۱۹ ـ ۲۵)

۲۳ بابو علی
مولانا عبد الرحمن بلگرامی
(فاران کراچی ۶۲ فروری ۴۰ ـ ۴۶)

۲۴ « ادارہ »
صدیق رض کا جمال و جلال
خطوط کے آئینے میں
(فیض الاسلام، راولپنڈی ۶۲ مارچ ـ اپریل ۴۷ ـ ۸۴)

۲۵ « ایم . ایم . »
بزرگان دین
(فیض الاسلام راولپنڈی ۶۲ فروری ۲۵ ـ ۳۶)
سید برکت علی شاہ گیلانی کے حالات
قلمبند کئے ہیں

۲۶ جعفر شاہ
عقل و عشق کا حسین امتزاج
(فیض الاسلام راولپنڈی ۶۲ مارچ ـ اپریل ۶۵ ـ ۴۷)
حضرت صدیق رض کی زندگی کے
بعض واقعات کی تشریح کرکے بتایا ہے کہ
وہ عقل و عشق کا حسین امتزاج تھے

۲۷ جعفر شاہ
صدیق اکبر رض کا پہلا خطبہ
(فیض الاسلام راولپنڈی ۶۲ مارچ ـ اپریل ۲۱ ـ ۲۵)
صدیق اکبر رض کے پہلے خطبے کی
عمرانی تشریح کی ہے

۲۸ خلیق انجم
میرزا مظہر کے فارسی خطوط
(نگار مارچ ۶۲ ص ۶ ـ ۱۱)
مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط کی
تاریخی و ادبی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے
مرزا کی شخصیت کو ان آئینوں میں دیکھا ہے

۲۹ رشید اختر
مسلمان مورخین
(ثقافت لاہور ۶۲ جنوری ـ فروری ـ مارچ)
مسلم مورخین کے حالات زندگی
قسط ۱، ۲، ۳

۳۰ ظہیر احمد
ماضی کا انقلابی کردار ـ اسمعیل شہید
(تعمیر انسانیت، لاہور ۶۲ فروری ـ مارچ ۱۲ ـ ۱۴)
اسمعیل شہید کے مختصر سوانح حیات
بیان کئے ہیں

۳۱ عبد اللہ یسین حسنی
پہلا مرد مومن
(فیض الاسلام راولپنڈی ۶۲ مارچ اپریل ۱۶ـ۲۰)
حضرت صدیق رض کی فضیلت بیان
کی ہے

۳۲ غبار یاور
ابن ماجہ
(تعمیر انسانیت لاہور ۶۲ جنوری ۱۵ـ۱۸)
عباسیہ دور کے ایک زبردست عالم
حدیث ابن ماجہ کا تعارف کرایا ہے

۳۳ فاطمہ شجاعت
حالی کی زندگی اور سیرت
(اردو کراچی ۶۰ جنوری ـ اپریل ۱۱۳ ـ ۱۴۴)

۳۴ قاضی اطہر
علمائے اسلام کے القاب کی تاریخ

(معارف اعظم گڑھ ۶۲ جنوری ۴۲ - ۶۰)

۳۵ قریشی عبدالرزاق
آزاد بلگرامی
(معارف اعظم گڑھ ۶۲ جنوری - فروری - مارچ)
آزاد بلگرامی کے حالات زندگی
قسط ۱، ۲، ۳

۳۶ مسعود احمد
شیخ احمد سرہندی
(معارف اعظم گڑھ ۶۲ جنوری ۲۹ - ۴۲)

۳۷ مسعود احمد
شیخ مجدد کے اصلاحی کارنامے
(الفرقان لکھنو ۸۱ ھ رجب ص ۱۵ - ۲۷)
شیخ مجدد الف ثانی نے رد بدعات میں جو کچھ کیا یا کہا اس کا بیان ہے

۳۸ مسعود احمد
شیخ مجدد کے اصلاحی کارنامے
(الفرقان لکھنؤ ۸۱ ھ شعبان ص ۱۳-۲۷)
شیخ مجدد کی اسیری کا تاریخی ذکر ہے

۳۹ مسعود احمد
شیخ مجدد کے اصلاحی کارنامے (۷)
(الفرقان لکھنؤ ۸۱ ھ رمضان المبارک ص ۲۱-۳۰)
شیخ مجدد الف ثانی کی نظر بندی اور رہائی کا تذکرہ ہے

۴۰ مسیح اللہ
زیب النساء
(صبح نو پٹنہ ۶۲ فروری ۱۵-۱۸)
اورنگ زیب عالمگیر کی سب سے بڑی لڑکی کی ذہانت و فطانت کا تذکرہ ہے

۴۱ مشفق خواجہ
«علم الاقتصاد» اقبال کا پہلا علمی کارنامہ
(اردو کراچی ۶۰ جولائی، اکتوبر ۱۶۱-۱۶۸)
اقبال کی پہلی تصنیف «علم الاقتصاد» سے متعلق تحقیقی مقالہ ہے

تاریخ و سیاسیات

۴۲ ابوالحسن علی ندوی
انسانی دنیا میں عربوں کا مقام
(الفرقان لکھنؤ ۸۱ھ رمضان ۱۲-۲۰)
عربوں کا تاریخی اور سماجی مقام متعین کیا ہے

۴۳ تاراچند
مغلیہ دور میں حکومت اور سماج
(آج کل ۶۲ فروری ۸ - ۱۳)
ریڈیو تقریر کے اقتباسات ہیں

۴۴ خان رشید
شاہ عالم کا ہندوستان
(نگار لکھنؤ ۶۲ مارچ ۱۲-۲۶)
سنہ ۱۱۷۴ھ سے سنہ ۱۲۲۱ تک کے ہندوستان کا نقشہ کھینچا ہے

۴۵ راج بہادر گوڑ
دکھنی رواداری
(سب رس حیدرآباد ۶۲ جنوری - فروری ۳۵-۳۷)
قطب شاہی دور کی گنگا جمنی تہذیب

کا سرسری جائزہ لیا ہے

۴۶ راما راجو، بی
بھاگیرتھی پٹنم اور بھاگ نگر
(سب رس حیدرآباد ۶۲ جنوری - فروری ۴۷-۴۸)
شہر گولکنڈہ سے متعلق ایک مختصر تحقیقی مقالہ ہے

۴۷ رچرڈ پائپس، شاہد احمد
سویٹ وسطی ایشیا کے مسلمان
(ساقی کراچی ۶۲ مارچ ۲۰۹-۲۳۵)

۴۸ رشید الدین
دستور ہند کے چند خاص نکات
(شاعر بمبی ۶۲ جمہوریت نمبر ۳۴-۳۶)

۴۹ سبزواری شوکت
پاکستان کا دستور اساسی
(ساقی کراچی ۶۲ مارچ ۱۹-۲۴)

۵۰ سراج الدین علی
چند قطب شاہی فرامین
(سب رس حیدرآباد ۶۲ جنوری - فروری ۴۲-۴۵)

۵۱ شریف النساء
حدیقۃ السلاطین میں حقیقت نگاری و فطرت کی عکاسی
(سب رس حیدرآباد ۶۲ جنوری - فروری ۴۰-۴۱)
عبداللہ قطب شاہ کے عہد حکومت کی تاریخ «حدیقۃ السلاطین» سے حقیقت نگاری وفطرت کی عکاسی کے چند نمونے پیش کئے ہیں

۵۲ ضیاء الدین احمد
ہندوستان میں قومی اتحاد کا مسئلہ
(اشارہ پٹنہ ۶۲ جنوری - فروری ۳۵-۴۳)
حصول آزادی کے بعد ہندوستان میں عام جذبۂ اتحاد کا علمی مطالعہ ہے

۵۳ علی اصغر بلگرامی (مرحوم)
سلاطین قطب شاہیہ کے تعلقات خارجہ
(سب رس حیدرآباد ۶۲ جنوری - فروری ۱۰-۱۹)

۵۴ قاضی اطہر
نارجیل سے نخیل تک
(معارف اعظم گڑھ ۶۲ مارچ)
ہند و عرب تعلقات تاریخ کی روشنی میں

۵۵ ماہ منیر خان
ہندوستان قومی یکجہتی کے آئینے میں
(اشارہ پٹنہ ۶۲ جنوری - فروری ۲۵-۳۰)
تاریخی حیثیت سے ہندوستان میں قومی یکجہتی کا ذکر کیا ہے

۵۶ محمود الحسن
جدید ترکی ادب میں معاشرتی موضوعات
(برہان دہلی ۶۲ جنوری - فروری - مارچ)
مضمون کی تیسری، چوتھی اور پانچویں قسط

۵۷ نرمدیشور پرشاد
قومی یکجہتی
(اشارہ پٹنہ ۶۲ جنوری - فروری ۱۵-۲۲)
ہندوستان کی قومی یکجہتی کا جائزہ ہے

۵۸ وقار خلیل
ادارۂ ادبیات اردو
ایک سرسری جائزہ
(سب رس حیدرآباد ۶۲ مارچ ۴-۶)

تنقید، ادب، لسانیات

۵۹ آزاد، جگن ناتھ
اقبال کی شاعری
(نگار لکھنؤ ۶۲ جنوری ۱۰-۲۰)
اقبال کی شاعری کے مختلف اصناف کا جائزہ ہے

۶۰ ابن فرید
سرود رفتہ
(ادیب علیگڑھ ۶۲ جنوری ص ۴۳-۴۶)
سیفو نامی شاعرہ کا تذکرہ اور اسکی نظموں کے ترجمہ پر تبصرہ ہے

۶۱ ابوالفضل صدیقی
حالی ایک زندہ فیضان
(ماہ نو ۶۲ جنوری ۸-۵۴)
خواجہ حالی کی سماجی و علمی خدمات کا ذکر ہے

۶۲ ابوالفیض عثمانی
اردو ہندی کا تاریخی رشتہ
(ادیب علی گڑھ ۶۲ جنوری ۲۳-۳۱)
اردو ہندی لسانیات کا تاریخی اور فنی مطالعہ ہے

۶۳ ابوالفیض عثمانی
اردو اور ہندی (۲)
(ادیب علی گڑھ ۶۲ مارچ ۲۸-۳۵)
اردو ہندی کا لسانیاتی مطالعہ ہے

۶۴ احتشام احمد ندوی
فن موازنہ (۵)
(ادیب علی گڑھ ۶۲ جنوری ۳۲-۳۵)
فن موازنہ کے چند عناصر مثلاً معانی و مقاصد وغیرہ کا بیان ہے

۶۵ احتشام احمد ندوی
فن موازنہ (۶)
(ادیب علی گڑھ ۶۲ مارچ ۳۹-۴۸)
فن موازنہ کے ایک اہم عنصر اسلوب کی بحث ہے

۶۶ احتشام بن حسن
پریم چند کی شخصیت
(ادیب علی گڑھ ۶۲ جنوری ۲۶-۴۲)
پریم چند کو بحیثیت انسان پیش کر کے ان کی نفسیات کا تجزیہ کیا ہے

۶۷ احتشام حسین
اقبال کی شاعری عملی نقطۂ نظر سے
(نگار لکھنؤ ۶۲ جنوری ۸۳-۹۲)
اقبال کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی نقاب کشائی کی ہے

۶۸ احراز نقوی
اردو کا پہلا ظریف اخبار
(ادیب علی گڑھ ۶۲ جنوری ۶-۸)
شواہد سے ثابت کیا گیا ہے اردو کا پہلا ظریف اخبار اودھ پنچ نہیں بلکہ «مذاق» رامپور ہے

۶۹ حسن فاروقی
دنیا کی عظیم ترین ناولیں
(اردو کراچی ۶۰ جنوری، اپریل ۳۹-۶۲)
«پرائڈ اینڈ پریجوڈس» پر تنقید کی ہے

۷۰ احمر رفاحی
جگر کی شاعری کا واقعاتی پس منظر
(اردو کراچی ۶۰ جنوری ۔ اپریل ۱۸۷-۲۰۳)

۷۱ اختر حسن
قطب مشتری اور سب رس کے مصنف
ملاّ وجہی کے متعلق بعض نئی معلومات
(سب رس حیدرآباد ۶۲ جنوری ۔ فروری ۲۸-۳۴)

۷۲ ارتضی حسین
اقبال ایک فلسفی شاعر
(نگار لکھنؤ ۶۲ جنوری ۱۲۱-۱۲۴)
اقبال کے بنیادی عقاید کے اہم اجزا
کا مطالعہ ہے

۷۳ عبد الطیف
تراجمہ
(جامعہ دہلی ۶۲ فروری ۴۴-۵۴)
سنہ ۶۱-۶۰ کے درمیان دیگر زبانوں
سے اردو میں ہونے والے تراجمہ پر تبصرہ

۷۴ اقبال قادری
مہاراشٹر اور صحافت
(صبح امید بمبئی مہاراشٹر نمبر ۱۱۷-۱۲۱)
دکھایا ہے کہ صوبۂ بمبئی میں صحافت
کا ارتقا کیوں کر ہوا

۷۵ اقتدار حسین صدیقی
اردو زبان عہد وسطی میں
(ادیب علی گڑھ ۶۲ مارچ ۳۶-۳۸)
تیرھویں صدی عیسوی سے سولھویں
صدی عیسوی تک زبان اردو کے ارتقا
پر روشنی ڈالی گئی ہے

۷۶ انجم فاطمی
جدید اردو افسانہ نگاری، ایک جائزہ
(شاعر بمبئی ۶۲ مارچ ۲۷-۳۰)

۷۷ باقی عبد القیوم
مطالعۂ اقبال غلط زاویۂ نگاہ سے
(نگار لکھنؤ ۶۲ جنوری ۹۷-۱۰۴)
اقبال پر مجنوں گورکھپوری کے
کے اعتراضات کے جوابات

۷۸ بیدار عابد رضا
حسرت
(برہان دہلی ۶۲ جنوری ۔ فروری ۔ مارچ)
اردوے معلیٰ مرتبہ حسرت کے
مضامین کی تفصیلات قسط ۷، ۸، ۹

۷۹ تسکین قریشی
نگار کا جگر نمبر
(فروغ اردو لکھنؤ ۶۲ جنوری ۲۳-۹۶)
نگار کے جگر نمبر پر ایک تفصیلی
تبصرہ

۸۰ ثناء الحق
اردو شاعری اور روایات
(شاعر بمبئی ۶۲ مارچ ۹-۱۴)
بتایا گیا ہے کہ اردو شاعر نے کس
طرح ہندی کے خیالات اور روایات کو
محفوظ رکھا ہے

۸۱ جاوید نہال
ملا عرفی، حیات اور شاعری
(صبح نو پٹنہ ۶۲ مارچ و اپریل ۱۱-۵۵)
عرفی شیرازی کا مختصر تذکرہ اور
ان کے کلام پر تبصرہ ہے

۸۲ جمیل مظہری
بنام خدائے زباں آفریں
(صبح نو پٹنہ ۶۲ فروری ۹-۲۲)
اردو زبان کی اہمیت پر ایک عالمانہ خطبہ ہے جو سنہ ۱۹۳۳ع میں لکھا گیا تھا

۸۳ چشتی یوسف سلیم
خدا اور خودی
(اقبال ریویو کراچی ۶۲ جنوری ۴۷-۶۰)

۸۴ حفیظ جمال
نصیر الدین ہاشمی
(صبح امید بمبئی ۶۲ جنوری ۶-۱۰)
ذاتی تأثرات ہیں

۸۵ حمیدہ سلطان
غالب کا تصور عشق
(ماہ نو ۶۲ فروری ۲۲-۲۴)
عشق کے متعلق غالب کے نظریات پیش کئے ہیں

۸۶ خان رشید
مثنوی گلزار نسیم
(اردو کراچی ۶۰ جنوری - اپریل ۶۳-۱۱۲)
گلزار نسیم کا تاریخی و سیاسی پس منظر بتاتے ہوئے مثنوی کا تنقیدی جائزہ لیا ہے

۸۷ دسنوی شہاب الدین
اردو ٹائپ میں تلفظ کا مسئلہ ایک نئی تجویز
(نوائے ادب بمبئی ۶۲ جنوری ۵۲-۶۱)

۸۸ رشید حسن خاں
نظم
(جامعہ دہلی ۶۲ فروری ۶۲-۸۹)
سنہ ۱۹۶۰ع اور ۱۹۶۲ع میں شائع ہونے والے مجموعوں پر تبصرہ ہے

۸۹ رضا انصاری
نگار کا جگر نمبر
(فروغ اردو لکھنؤ ۶۲ جنوری ۷-۲۲)
نگار کے جگر نمبر پر اظہار خیال

۹۰ رفعت مبارز الدین
مدرسۂ محمود گاواں بیدر
(آج کل دہلی ۶۲ جنوری ۹-۱۲)
دکن کے ایک تاریخی مدرسہ کا تذکرہ

۹۱ رفعت مبارز الدین
مولانا آزاد
(ادیب علی گڑھ ۶۲ جنوری ص ۵)
مولانا آزاد کے صاحب طرز ہونے پر اظہار خیال ہے

۹۲ رفیق سعید احمد
فرائد کا نظریہ ادب
(ادب لطیف ۶۲ جنوری، مارچ)

۹۲ رئیس مینائی
چند گراں مایہ خطوط
(آج کل دہلی ۶۲ جنوری ۳۸-۴۱)
حضرت نفیس بنگلوری کے نام عزیز لکھنؤی، یگانہ چنگیزی، آرزو لکھنوی جلیل مانکپوری، عزیز یارجنگ، اثر لکھنوی اور ناطق گلاؤٹھوی کے خطوط ہیں

۹۴ زور محی الدین قادری

محمد قلی قطب شاہ کی شاعری
(سب رس ، حیدرآبار ۶۲ جنوری - فروری ۷-۸)

۹۵ سخاوت مرزا
ایک گمنام شاعر خروشی معاصر ولی
(اردو کراچی ۶۰ جنوری ، اپریل ۲۳-۳۸)
خروشی کا تعارف کراتے ہوئے اسکے اردو کلام کا انتخاب پیش کیا ہے

۹۶ سخاوت مرزا
ترکی زبان اور کائیستھ
(اورینٹل کالج میگزین لاہور ۶۱ نومبر ۸۱-۹۴)
ہندوستان میں ترکی زبان کے رواج کا سرسری جائزہ لیتے ہوئے ایک کائستھ ادیب کاسی ابن بیربل اور اس کی ترکی تصنیف « ہفت اختر » کا تعارف کرایا ہے

۹۷ سہل الرحمن انجم
کیا اکبر رجعت پسند تھا
(اشارہ پٹنہ ۶۲ مارچ ۲۱-۲۳)
اکبر الہ آبادی کا نفسیاتی تجزیہ ہے

۹۸ سید عبد اللہ
اقبال ایک ادبی فنکار
(اقبال ریویو کراچی ۶۲ جنوی ۱-۱۶)

۹۹ سیدہ جعفر
مرقع نگاری
(ادب لطیف لاہور ۶۲ فروری - مارچ)

۱۰۰ ش اختر
اردو ادب کا جمہوری کردار
(شاعر بمبئی ۶۲ جمہوریت نمبر ۲۹-۳۳)

۱۰۱ شاہد خواجہ حمید الدین
سلطان محمد قلی قطب شاہ کی گنگا جمنی شاعری
(سب رس حیدرآباد ۶۲ جنوری - فروری ۲۳-۲۷)

۱۰۲ شبیر علی کاظمی
قواعد کلیہ بھاکا
(اردو کراچی ۶۰ جنوری ، اپریل ۱۰-۲۲)
عہد عالمگیر کی ایک غیر مطبوعہ کتاب « تحفۃ الهند » کے باب چہارم ، فصل دوم کا ترجمہ پیش کیا ہے جو ہندوستانی کے قواعد سے متعلق ہے ۔

۱۰۳ شروانی ہارون خاں
تلگو ادب محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں
(سب رس حیدراباد ۶۲ جنوری - فروری ۲۰-۲۲)

۱۰۴ شفیق النساء
مکتوبات غالب
(ادیب علی گڑہ ۶۲ جنوری ۹-۱۸)
مرزا غالب کے مکتوبات پر ذاتی تأثرات

۱۰۵ شفیق النساء
ملا وجہی کی سب رس
(ادیب علی گڑہ ۶۲ مارچ ۱۲-۱۵)
ملا وجہی کی تصنیف سب رس کا فنی مطالعہ ہے

۱۰۶ شہاب مہر محمد خان
غالب و ذوق کے سہرے
ایک تفصیلی تبصرہ
(نوائے ادب بمبئی ۶۲ جنوری ۵-۲۶)

۱۰۷ شیدا راجندر ناتھ

پچھلے دو سال کا تحقیقی اور تنقیدی
ادب
(جامعہ دہلی ۶۲ فروری ۱۵۔۲۶)
۱۹۶۰۔۱۹۶۱ع کے تحقیقی و تنقیدی
ادب کا جائزہ ہے

۱۰۸ شیدائی اسد الحق
بہادر شاہ ظفر اور ان کی شاعری
(ساقی کراچی ۶۲ فروری ۳۳۔۳۷)

۱۰۹ شیرانی محمود خان
عروض جدید
(اورینٹل کالج میگزین لاہور ۶۱ نومبر ۱۔۴۰)
حافظ محمد شیرانی مرحوم کا ایک
غیر مطبوعہ مضمون ہے جس میں علم العروض
کو تفصیل کے ساتھ سمجھایا ہے

۱۱۰ صبیح احمد کمالی
اقبال کے یہاں ڈرامائی عنصر
(نگار لکھنؤ ۶۲ جنوری ۷۵۔۸۱)
ڈرامہ کے متعلق اقبال کے نظریات
اور ان کے کلام میں ڈرامائی عناصر کا
پتہ لگایا ہے

۱۱۱ صفدر آہ
امیر خسرو بحیثیت ہندی شاعر
(نوائے ادب بمبئی ۶۲ جنوری ۲۷۔۵۱)

۱۱۲ صوفی نذیر احمد
اقبال و رومی کا مقام اور ان کے
نظریات اسلام
(عارف لاہور ۶۲ مارچ ۱۹۔۲۶)

۱۱۳ طاہر فاروقی
ہمارا رسم الخط
(ماہ نو ۶۲ مارچ ۴۵۔۸۶)
اردو کے رسم الخط کا فنی مطالعہ ہے

۱۱۴ عابد رضا بیدار
لخت لخت
(ماہ نو ۶۲ فروری ۲۷۔۳۶)
غالب کی شخصیت پر مختلف حیثیتوں
سے روشنی ڈالی ہے

۱۱۵ عبارت بریلوی
پاکستان کی اردو مطبوعات
(جامعہ دہلی ۶۲ فروری ۳۔۱۴)
پاکستانی مطبوعات اردو کا جائزہ ہے

۱۱۶ عبدالغنی
کلام بیدل میں معنی خیز علامتیں
(ساقی کراچی ۶۲ فروری ۹۔۱۸)

۱۱۷ عبداللہ چغتائی
مثنوی نل و من
(ماہ نو ۶۲ مارچ ۹۸۔۱۰۸)
فیضی کی مثنوی کا تحقیقی مطالعہ

۱۱۸ عبد اللہ ولی بخش قادری
آتش گل کے اشعار آئینہ ایام میں
(جامعہ دہلی ۶۲ جنوری ۱۲۵۔۱۴۳)
جگر مرادآبادی کے آخری دور کے
مجموعہ کلام میں نبض دوراں کی دھڑکن
سننے کی کوشش کی ہے

۱۱۹ عثمان صدیقی
مظہر جان جاناں اور ان کی شاعری
(ادیب علی گڑھ ۶۲ مارچ ۱۶۔۲۷)
مرزا مظہر کی شاعری پر تبصرہ ہے

۱۲۰ عرشی صالح الکبری

اقبال کی زندگی کا گمشدہ ورق
(اقبال ریویو کراچی ۶۲ جنوری ۶۱-۷۴)
جلسوں میں اقبال کی شعر خوانی،
کالج میں ان کا انگریزی پڑھانے کا طریقہ
اور ان کے لب و لہجہ پر روشنی ڈالی
گئی ہے

۱۲۱ عظیم فیروزآبادی
اقبال کی حیات معاشقہ
(نگار لکھنؤ ۶۲ جنوری ۴۲-۴۷)
اقبال کے خطوط، ان کے اشعار اور
احباب کے بیانات کی روشنی میں ان کے
معاشقوں کا ذکر کیا گیا ہے

۱۲۲ علیم اللہ حالی
یگانہ چنگیزی
(صبح نو پٹنہ ۶۲ فروری ۱۹-۲۲)
تذکرہ ہے یگانہ کے آرٹ کا

۱۲۳ غبار یاور
شاعری میں عقلیت
(جام نو کراچی ۶۲ فروری ۱۱-۱۵)

۱۲۴ غلام ربانی عزیز
اقبال اور نظریۂ جمہوریت
(نگار لکھنؤ ۶۲ جنوری ۵۵-۶۴)
اقبال کے جمہوری تصورات پر روشنی
ڈالی ہے

۱۲۵ فراق گورکھپوری
غزل کیا ہے
(آج کل ۶۲ فروری ۳-۶)
صنف غزل پر چند تاثرات ہیں

۱۲۶ فرقت غلام احمد
سنہ ۶۱-۱۹۶۰ع کا مزاحیہ ادب
(جامعہ دہلی ۶۲ فروری ۳۴-۴۳)
دوران سنہ ۶۱-۶۰ع میں اردو میں
مزاحیہ ادب کا جائزہ ہے

۱۲۷ فرمان فتح پوری
اقبال و غالب کا تقابلی مطالعہ
(نگار لکھنؤ ۶۲ جنوری ۱۰۵-۱۱۸)
اقبال و غالب کے افکار و خیالات
کا تقابلی تجزیہ ہے

۱۲۸ فروغ احمد
اقبال کا تصور خودی اور عقیدۂ آخرت
(اقبال ریویو کراچی ۶۲ جنوری ۱۷-۴۱)

۱۲۹ فضیل جعفری
نذر دانشوراں
(شاعر بمبئی ۶۱ مارچ ۲۰-۲۶)
« سوغات » کے نظم نیر پر ایک
تبصراتی مقالہ ہے

۱۳۰ قاضی عبدالودود
غالب کے فارسی خطوط
(ماہ نو ۶۲ فروری ۷-۱۰)
محمد علی خان بھوپالی کے نام غالب
کے خطوط کے مجموعہ کا ذکر ہے

۱۳۱ قدرت نقوی
غالب کون ہے
(ماہ نو ۶۲ فروری ۱۱-۲۱)
غالب کے مذہبی عقائد سے بحث
کی ہے

۱۳۲ قمر رئیس
اردو افسانہ اور ناول
(جامعہ دہلی ۶۲ فروری ۲۷۔۳۳)
سنہ ۶۱ع میں ہندوستان میں افسانوں کے مجموعوں اور اہم ناولوں کا تذکرہ ہے

۱۳۳ کریم الدین احمد
امیر مینائی کی ایک غیر مطبوعہ عاشقانہ مثنوی
(اردو کراچی ۶۰ جولائی ، اکتوبر ۳۔۱۶۰)
تبصرے کے ساتھ امیر مینائی کی ایک عاشقانہ مثنوی پیش کی ہے

۱۳۴ کریم اللہ پالوی
تصورات اقبال کا سرسری جائزہ
(نگار لکھنؤ ۶۲ جنوری ۱۲۵۔۱۲۸)
تصورات اقبال کا سرسری جائزہ ہے

۱۳۵ کلیم عاجز
تحقیق عتیق
(صبح نو پٹنہ ۶۲ جنوری ۱۱۔۳۳)
عتیق صدیقی کی تصنیف «گل کرسٹ» پر تنقید ہے

۱۳۶ گوہر نوشاہی
مولانا غنیمت کنجاہی
(اورینٹل کالج میگزین لاہور ۶۱ نومبر ۵۵۔۸۰)
فارسی کے ایک مشہور پنجابی شاعر مولانا غنیمت کی سوانح حیات سے متعلق مقالہ ہے

۱۳۷ ماہرالقادری
اقبال کی اردو شاعری
(فاران کراچی ۶۲ جنوری ۸۔۳۶)

۱۳۸ محسن انصاری
اقبال کی شاعری
(ادیب علی گڑھ ۶۲ جنوری ۱۹۔۲۲)
اقبال کی شاعری پر چند ذاتی خیالات کا اظہار ہے

۱۳۹ محمد باقر
شیوۂ خط فارسی
(اورینٹل کالج میگزین لاہور ۶۱ نومبر ۴۱۔۵۴)
املا اور نقطہ گذاری سے متعلق فارسی کے مروجہ طریقے کا تفصیلی جائزہ لیا ہے

۱۴۰ محمود الٰہی
دیا شنکر نسیم
(ہندوستانی ادب حیدرآباد ۶۲ جنوری ۔ فروری ۳۹۔۴۰)
دیا شنکر نسیم کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کیا ہے

۱۴۱ مسعود احمد
حضرت غمگین شاہجہاں آبادی
(اردو کراچی ۶۰ جنوری ، اپریل ۱۴۵۔۱۸۴)
غمگین کی حیات اور کلام سے متعلق تحقیقی و تنقیدی مقالہ ہے

۱۴۲ مظہر امام
ہندی میں اردو
(شاعر بمبئی ۶۲ جمہوریت نمبر ۱۸۔۲۴)
ہندی میں اب تک شائع ہونے والی اردو کتابوں کا سرسری جائزہ لیا ہے

۱۴۳ ناصر نصیر احمد
اقبال اور وحدت الوجود
(اقبال ریویو ۶۲ جنوری ۷۵۔۹۹)

۱۴۴ نامی عبدالعلیم

اردو کا پہلا ڈرامہ نویس

(صبح امید بمبئی مہاراشٹر نمبر ۸۷-۸۸)

ڈاکٹر بھاؤ داجی لاڈ کا تذکرہ ہے

۱۴۵ ندوی عبدالسلام

اردو شاعری اور فن تنقید

(معارف اعظم ۶۲ مارچ)

مضمون کی پانچویں قسط

۱۴۶ نصیرالدین ہاشمی

علامہ شبلی کی رنگین زندگی

(ادیب علی گڑھ ۶۲ مارچ ۴-۸)

یہ دکھایا ہے کہ علامہ شبلی کی رنگین زندگی میں کیا صرف علامہ شبلی کو مورد الزام قرار دینا چاہئے

۱۴۷ نصیر کوٹی

وحیدہ نسیم کی نظمیں

(جام نو کراچی ۶۲ فروری ۱۷-۲۲)

۱۴۸ نقی احمد ارشاد

سنتھالی زبان میں اردو فارسی کے الفاظ

(صبح نو پٹنہ ۶۲ جنوری ۱۸-۲۱)

۱۴۹ نیاز فتح پوری

اقبال کا ذہنی ارتقا

(نگار لکھنؤ ۶۲ جنوری ۲۱-۲۹)

اقبال کی شاعری کو ان کی شعوری پختگی سے ہم آہنگ کیا ہے

۱۵۰ نیاز فتح پوری

اقبال کے سیاسی رجحانات

(نگار لکھنؤ ۶۲ جنوری ۳۴-۴۱)

اقبال کے سیاسی افکار کا تذکرہ ہے

۱۵۱ نیاز فتح پوری

اقبال کا فلسفۂ خودی

(نگار لکھنؤ ۶۲ جنوری ۴۸-۵۴)

اقبال کے کلام میں ان کے فلسفہ خودی کو تلاش کیا ہے

۱۵۲ وقار عظیم

اکبر اور انگریز

(ماہ نو کراچی ۶۲ مارچ ۳۴-۴۰)

اکبر الہ آبادی کے انگریزوں سے متعلق خیالات کا احاطہ کیا ہے

۱۵۳ وہاب اشرفی

اختر قادری کی شاعری

(شاعر بمبئی ۶۲ مارچ ۱۵-۱۹)

اختر قادری کی شاعری کا تنقیدی جائزہ لیا ہے

متفرقات

۱۵۴ ڈار بشیر احمد

تصوف

(ثقافت لاہور ۶۲ جنوری ۲۴-۳۴)

تصوف کی تعریف اور اس کی خصوصیات

۱۵۵ سلامت اللہ

بنیادی قومی تعلیم کا سماجی کردار

(جامعہ دہلی ۶۲ جنوری ۱۱۵-۱۲۴)

قومی تعلیم پر ذاتی تاثرات ہیں

۱۵۶ سلطان احمد

کتب خانے اور ان کی اہمیت

(صبح نو پٹنہ ۶۲ مارچ - اپریل ۲۱-۲۲)

فن مطالعہ پر معلوماتی مضمون ہے

۱۵۷ ضیا الحسن فاورقی

ارسطو کے سیاسی افکار

(جامعہ دہلی ۶۲ مارچ ۲۸۵-۲۹۶)

مشہور فلسفی حکیم ارسطو کے سیاسی افکار کا بیان ہے

۱۵۸ محمد حسین حسّان

بچوں اور بالغوں کی کتابیں

(جامعہ دہلی ۶۲ فروری ۵۵-۶۱)

گزشتہ ایک سال میں بچوں اور بالغوں کے لئے اردو میں شائع ہونے والی کتابوں کا ذکر ہے

۱۵۹ محمد مجیب

مغربی دنیا پر ایک نظر (۱)

(جامعہ دہلی ۶۲ مارچ ۲۷۵-۲۸۲)

یورپ اور امریکہ کا مسلسل سفر نامہ ہے

۱۶۰ مفتی محمد شفع

رویت ھلال

(الفرقان لکھنؤ ۸۱ھ شعبان ۲۸-۴۸)

رویت ھلال کی حقیقت اور چاند دیکھنے کے لئے آلات کے استعمال پر بحث کی ہے

ایڈیٹر : نجیب اشرف ندوی

پرنٹر پبلشر حامد اللہ ندوی نے ادبی پرنٹنگ پریس ، ۸ شیفرڈ روڈ ، بمبئی ۸ میں چھپواکر انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی ۱ سے شائع کیا

نوائے ادب بمبئی

جلد ۱۳ | اکتوبر ۱۹۶۲ ع | شمارہ ۴

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	شذرات	پروفیسر نجیب اشرف ندوی	۲
۲	اردو الفاظ کا رومن إملا	پروفیسر ہارون خاں شروانی	۵
۳	امثال و اقوال	ایم . اے . حفیظ	۱۵
۴	سرمایۂ کلام غالب	پروفیسر این . ایل کے . طالب	۳۳
۵	علی اختر کی شاعری	جناب سعادت نظیر	۴۹
۶	[redacted]	رائے انیل پرشاد جلیل	۵۷
۷	مقالہ نما (ضمیمہ)	عبدالحلیم ساحل و دیگر مرتبین	۱-۲۱

شذرات

اردو دوست اصحاب اردو کے سلسلہ میں جیسے جیسے جذباتی دور سے گذرتے جاتے ہیں علمی و تعمیری حیثیت سے اس کی طرف زیادہ متوجہ ہونے لگے ہیں . اردو املاء کی اصلاح اور اعراب و مواقف کے تعین کے ساتھ ہی ساتھ طباعت کے ذریعہ اس کے حسن و افادیت میں اضافہ کی صورتوں پر سنجیدگی سے غور کیا جانے لگا ہے ، آج سے ساٹھ ستر سال پہلے بھی اعراب کے سلسلہ میں کوششیں کی گئیں تھیں اور پھر وقتاً فوقتاً بعض افراد اور ان کے افکار کے مشوروں کی روشنی میں انجمن ترقیٔ اردو نے اس طرف توجہ بھی کی تھی ، لیکن افسوس کہ ہم نے اجتماعی حیثیت سے ان چیزوں کی جانب دھیان نہیں دیا اور یہ معاملہ جہاں تھا وہیں رہا . اب ادھر ڈیڑھ دو برسوں سے یہ مسئلہ پھر جاذب توجہ ہو رہا ہے ، اس کے ساتھ ہی طباعت کے سلسلہ میں نہ صرف ٹائپ اور لیتھو کا جھگڑا ہے بلکہ بعض حلقوں سے لاطینی حروف اختیار کرنے کی صدا بھی بلند ہو رہی ہے . اس لئے ضرورت ہے کہ اب جب کہ انجمن ترقی اردو (ہند) اپنا سالانہ اجلاس منعقد کر رہی ہے اس کام کی طرف پورے خلوص و سنجیدگی کے ساتھ متوجہ ہو کیوں کہ اسی ایک ادارہ کو اردو کے سلسلہ میں سب سے اہم ، سب سے وقیع اور سب سے ہمہ گیر مقام حاصل ہے . اسے چاہئے کہ اب وہ ایک ایسی کمیٹی مقرر کرے جس میں اردو کے ملکی اداروں کے نمائندوں کے ساتھ مطبعوں اور مکتبوں کے نمائندے بھی شریک ہوں اور اگر ممکن ہو تو اس سلسلہ میں ہندوستان سے باہر کی اردو دنیا سے بھی استصواب کیا جائے تاکہ جو فیصلہ ہو وہ ساری اردو دنیا کے لئے ہو ، یہ اردو کی تعلیم و تحریر کی یکسانی کا سب سے بڑا کارنامہ ہوگا .

اس سہ ماہی میں ہم کو تین ادبی و علمی حادثوں کا سامنا کرنا پڑا . یہ مولانا حفظ الرحمن ، جناب شاہد صدیقی اور ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی ہم سے دائمی جدائی ہے . مولانا حفظ الرحمن ایک مجاہد تھے اور حق کے لئے خواہ وہ مذہبی ہو یا سیاسی ، لسانی ہو یا معاشی ہمیشہ سینہ سپر رہتے ، اگرچہ ان کی گفتگو جذباتی

گرمی سے خالی رہتی لیکن حق کا وزن و اثر اس کا سرمایۂ افتخار ہوتا . وہ تمام عمر ہر محاذ پر حق کے سچے سپاہی کی طرح لڑتے رہے اور اسی جہاد نے ان کے جسم کو مجروح کردیا اور اس طرح اندرونی زخم کی صورت میں ان کو اپنی حق گوئی کی قیمت ادا کرنا پڑی. اردو زبان کی حفاظت و ترقی کے سلسلہ میں انہوں نے ہر وقت اور ہر مقام سے آواز بلند کی ، وہ انجمن ترقی اردو ہند کے ممتاز و جاندار رکن اور اس کے لئے باعث عزت تھے. افسوس کہ اردو کا یہ مجاہد جس میں ایک سچے انسان کی خوبیاں بھی موجود تھیں ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا .

شاہد صدیقی نے شاعر و ادیب کی حیثیت سے ایک خاص حلقہ میں اپنا مقام پیدا کرلیا تھا. ایک طرف انہوں نے اپنے اخلاق سے اپنے تمام ملنے والوں کو گرویدہ بنا لیا تھا تو دوسری طرف شعری دنیا کو اپنی طرف معترفانہ حیثیت سے متوجہ کرلیا تھا. ان کی اچانک موت ایک صدمہ ہے جس کا اثر بزم شعر و ادب اور حلقہ احباب میں دیر تک رہے گا.

ڈاکٹر زور کی خبر وفات ایک بجلی تھی جو گری اور اس نے اردو دوستوں کے صبر و قرار کو خاک میں ملادیا . وہ چند دنوں پہلے بمبئی تشریف لائے تھے ، اس وقت ان کی صحت میں کسی قسم کا کوئی اضمحلال نہ تھا مگر اس کے تیسرے ہی دن دوش برق پر سوار اس ہوشربا و غمناک خبر نے سکتہ کی سی حالت پیدا کردی. ڈاکٹر زور اپنی طالب علمی ہی کے زمانے سے نہ صرف علمی حیثیت سے ممتاز تھے بلکہ اردو کی توسیع و ترقی کا جذبہ جو ان کے سینہ میں موجزن تھا ، اپنا اظہار کرنے لگا تھا. ان کا وقت ، خواہ وہ ہندوستان میں ہوں یا انگلستان و فرانس میں اسی زبان کے گیسو سنوارنے میں گذرا. اردو ادب میں شاید ہی کوئی فن ایسا ہوگا جس پر انہوں نے کام اور وہ بھی کامیاب کام نہ کیا ہو. دکنی ادب کو دلی و لکھنؤ کے برخود غلط ادعاء نے فراموش کردیا تھا اس کو ایک مرتبہ پھر زندہ کرنے کا سہرا بڑی حد تک انہی کے سر ہے. موجودہ لسانیاتی اصول پر زبان اردو کے مطالعہ کی کوشش میں بھی وہ پہلی صف میں نظر آتے ہیں. وہ ایک اچھے نقاد ، انشاء پرداز ، سوانح نگار ، مورخ ادب ، مرتب فہرست اور جفاکش اڈیٹر تھے. اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کی ایک اور بڑی خوبی ان کی تنظیمی صلاحیت تھی ، جس کا بین ثبوت ادارۂ ادبیات اردو اور

آزاد اکیڈمی کی صورت میں ملتا ہے۔ دوسروں کو ساتھ لےکر کام کرنے کا سلیقہ بھی خداوند تعالیٰ نے ان کو دیا تھا۔ ان کی حوصلہ مند روح ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہی، ان کی زندگی کا بیشتر حصہ بھاگ نگر کی رنگین فضا میں گزرا، اس کے بعد سری نگر کی جنت ارضی میں انہوں نے قدم رکھا لیکن شاید ان کی ترقی پسند، حسن دوست طبیعت اس جنت ارضی سے بھی مطمئن نہ رہ سکی اور ایک قدم اور بڑھاکر وہ یکایک اصلی و دائمی جنت میں داخل ہوگئے۔

مرحوم سے میرے تعلقات تقریباً تیس برس سے تھے ان میں زمانہ کے ساتھ ہی ساتھ زیادہ استحکام و خلوص پیدا ہوتا گیا۔ اب ایسے کام کے دھنی شاید کم ملیں گے۔ ان کا نقصان صرف دکن کا، صرف ہندوستان کا نہیں بلکہ ساری اردو دنیا کا نقصان ہے۔

اللہ پاک ان تینوں مرنے والوں کو اپنی آغوش رحمت میں جگہ عنایت فرمائے۔

اس مہینہ کے آخر تک انشاءاللہ ادارہ کی دو کتابیں شائع ہوجائیں گی۔ ان میں ایک «دیوان عزلت» ہے جسے ہمارے رفیق کار عبدالرزاق قریشی نے مرتب کیا ہے اور دوسری «لغات گجری» ہے، جس کے متعلق خیال ہےکہ اردو کا سب سے پہلا لغت ہے اور گجرات میں مرتب ہوا ہے۔ اسے راقم‌الحروف نے مرتب کیا ہے۔

*

* پروفسر ہارون خاں شروانی

اردو الفاظ کا رومن املا

میں ڈاکٹر گیان چند کا ممنون ہوں کہ انھوں نے اپنے مضمون میں، جو اسی موضوع پر اردو نامہ، کراچی، بابت اپریل تا جون ۱۹۶۲ع میں شائع ہوا ہے، میرے کتابچے «اردو رسم خط اور طباعت» کو مفید اور بصیرت افروز فرمایا ہے. ڈاکٹر گیان چند ہندوستان کے ان بزرگوں میں سے ہیں جن پر اردو دوستوں کو فخر ہے، اور ان کے قلم سے کتابچے کی بابت یہ الفاظ نکلنا میرے لئے تشکر اور امتنان کا باعث ہے. یہ ایک توارد ہے کہ جنوری ۱۹۶۲ع کے رسالہ نوائے ادب، بمبئی، میں اردو زبان کے مشہور مفکر جناب شہاب الدین دسنوی کا مضمون، «اردو ٹائپ میں تلفظ کا مسئلہ: ایک نئی تجویز» کے عنوان سے چھپا ہے. چند ہفتے ہوئے جناب دسنوی صاحب حیدرآباد آئے تھے تو انھوں نے مجھ سے فرمایا تھا کہ آپ اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کیجئے، مگر بد قسمتی سے میں اب تک اس بارے میں کچھ نہ لکھ سکا. میری دانست میں دونوں مضمون ایک اعتبار سے اردو رسم خط کی کم مائگی پر دلالت کرتے ہیں. اور خصوصیت کے ساتھ حروف علت اور علامات علت[1] کے لئے رومن علامتوں کا آسرا ڈھونڈتے ہیں. اس کے علاج کے لئے دونوں فاضل مصنفون نے رومن علتی حروف سے مدد لی ہے، مگر جہاں ڈاکٹر گیان چند نے اردو الفاظ کا صحیح اور علتی دونوں قسم کے رومن حرفوں کا سہارا لیا ہے وہاں دسنوی صاحب نے صحیح حروف تو اردو ہی کے رکھے ہیں

---

* جناب پروفیسر ہارون خان شروانی ایم. ایل. سی حمایت نگر حیدرآباد دکن.

۱ میں ایسے الفاظ جیسے «مصوتے» اور «مصمتے» کو اردو زبان کے لئے بوجھل اور نامناسب سمجھتا ہوں.

مگر علتی حروف اور علتی علامتوں کے لئے رومن حروف کا استعمال جائز قرار دیا ہے۔

میں ڈاکٹر گیان چند صاحب کی اس رائے سے پوری طور پر متفق ہوں کہ بہترین رسم خط وہ ہے جو صحیح بھی ہو اور سہل بھی ہو۔ صحت سے مراد صرف ایک ہی ہوسکتی ہے وہ یہ کہ جہاں تک ممکن ہو، کسی زبان کی آوازیں اس زبان کے رسم خط کے ذریعے سے ادا کی جاسکیں۔ ایک بڑی مشکل یہ پیش آتی ہے کہ کسی رسم خط میں لہجے کے اتار چڑھاو کا اظہار نہیں کیا جاسکتا، گو معمولی بول چال میں بھی کسی لفظ پر زور دینے یا کسی لفظ کو ذرا جھٹکے کے ساتھ ادا کرنے سے معنوں میں زمین آسمان کا فرق ہوجاتا ہے۔ بہر حال کم سے کم یہ تو لازم ہے کہ رسم خط کے ذریعے سے صرف الفاظ کو صحیح طور پر ادا کیا جاسکے۔ اعراب محض مصنوعی علامتیں جو مختلف زبانوں کے مخارج اور ان کے باھمی ربط کو ظاہر کرنے کی غرض سے وضع کیگئی ہیں۔ دو یا دو سے زیادہ زبانوں کے حروف اور اعراب کسی ایک زبان سے ٹکر کھاتے ہیں تو اس زبان کے مخرجوں کے اظہار کے لئے یا تو یہ حروف بجنسہ قائم رکھے جاتے ہیں ورنہ ان کی آوازوں میں تبدیلی ہوجاتی ہے، اور بعض مرتبہ کسی زبان کی آواز دو دو تین تین حرفوں کو ملاکر اس مجموعے سے لگالی جاتی ہے۔ ہمارے حرف ض کو لیجئے۔ اس کا تلفظ اردو میں کچھ ہے، عربی میں کچھ، فارسی میں کچھ، سندھی میں کچھ۔ اسی طرح ق کا مخرج حجاز اور مصر میں جداگانہ ہے اور مصر میں مسجد کو مسگد کہتے ہیں اور اس کے عکس کی طور پر قاہرہ والے کہینگے کہ ہم اس لفظ کا تلفظ مسجد کیوں کرتے ہیں! خود ہمارے ملک میں پنجاب میں ق کا تلفظ ک کیا جاتا ہے اور دکھنی عام طور پر اسے خاف۔ اور خ کو قے کہتے ہیں۔ دیوناگری श اور تلگو ష کا تلفظ شمالی ہند میں ش کا اور جنوبی ہند میں س کا کیا جاتا ہے۔ مغربی زبانوں کو لیجئے۔ حرف t انگریزی میں ٹ، اطالوی اور دوسری جنوبی زبانوں میں ت، فرانسیسی خاص کر پیرس اور اس کے نواح کی زبان میں ت اور ٹ کے درمیان کی آواز کے لئے لکھی جاتی ہے۔

یہ حال تو صحیح حرفوں کا ہے۔ علتی حرفوں کے تلفظ میں تو اس سے بھی زیادہ فرق نمایاں ہے۔ انگریزی زبان کا تو کچھ کہنا ہی نہیں، وہاں تو ہر علتی حرف کا تلفظ گویا ہر لفظ کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ فرانسیسی میں u کا تلفظ «او» اور «ای» کے درمیان ہوتا ہے، اطالوی اور جرمنی میں u پیش کا کام دیتا ہے، شمالی زبانوں میں پیش کے لئے اور دوسرا مخروم و کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

ڈاکٹر گیان چند کا خیال ہے کہ «مفرد آوازوں کے لئے دو حروف کا استعمال بے اصولی ہے۔» میں ان کی اس رائے سے متفق نہیں۔ جب ہم نے یہ سمجھ لیا کہ حروف کی حیثیت ایک حد تک من مانی علامتوں سے زیادہ نہیں تو پھر دو یا دو سے زیادہ حروف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نام نہاد دو یا دو سے زیادہ حرف ایک دوسرے سے ادغام کے بعد اپنی اپنی حیثیت کو کھو کر گویا ایک ہی آواز کی علامت بن جاتے ہیں۔ مثال کی طور پر انگریزی میں بجائے اس کے کہ چ کی آواز کےلئے کوئی جداگانہ حرف بناکر انگریزی حروف تہجی میں اضافہ کیا جائے اس کےلئے عام طور پر ch لکھا جاتا ہے۔ یہ ch ایک جداگانہ آواز کی قائم مقام ہے اور اس میں گویا نہ c باقی رہتا ہے نہ h بلکہ دونوں کے ذریعے سے ایک نیا حرف بن جاتا جو نہ c کے آواز کا قائم مقام ہے نہ h کی آواز کا۔ اسی علامت ch کی آواز فرانسیسی میں ش کی، اطالوی میں ک کی، اور جرمن میں خ کی ہوتی ہے۔ بعض مرتبہ کسی خاص آواز کے اظہار کے لئے تین تین چار چار مفرد ملا دئے جاتے ہیں اور یہ حرف اپنی اپنی آواز کھو کر ایک نئی آواز کے لئے ایک مدغم حرف بن جاتے ہیں، جیسے ش کے لئے اطالوی میں sci اور چ کے لئے جرمن میں tsch پہلی حالت میں s اور c اپنی اپنی حیثیت کو کھو دیتے ہیں اور sci گویا ایک نیا حرف بن جاتا ہے۔ اور دوسری شکل میں tsch مرکب ہوکر ایک نئے حرف کی جگہ لے لیتا ہے۔ اسی طرح دیوناگری اور دوسری ہندی نما لپیوں میں سیکڑوں سندھیاں ہیں جن کے ذریعے سے دو یا دو سے زیادہ حروف کو ایک دوسرے سے ملا کر گویا ایک نئی آواز پیدا کردی جاتی ہے۔

اس اعتبار سے میری دانست میں بھ، پھ، تھ، ٹھ، دھ، وغیرہ میں ب، پ، ت، ٹ، د، اور ھ اپنی اپنی اصل کو ایک حد تک کھو کر ایک نئی آواز اور نیا مخرج پیدا کرتے ہیں اور اس طرح ان آوازوں کے لئے جداگانہ مفرد حروف کے بوجھ کو کم کردیتے ہیں. بہت سے ناگری پریمیوں کا کہنا ہے کہ بجائے ख، घ، ठ، छ، اور ایسے ہی دوسرے نفس حروف کے لئے اگر क، ग، ट، द، کے ساتھ ह کا ایک حصہ ملا دیا جائے تو ناگری حرفوں کی گنتی میں بہت کچھ کمی ہوجائے گی. ڈاکٹر گیان چند کا یہ فرمانا درست نہیں کہ چونکہ اردو رسم خط میں کھ، گھ، ٹھ، ڈھ، وغیرہ کے لئے دوسری مفرد علامتیں نہیں اس لئے ہم مخلوط شکلیں لکھنے پر مجبور ہیں. حقیقت یہ ہے کہ اردو لپی بنانے والوں کا یہ احسان ہے کہ نئی علامتیں بنانے کے کے بجائے انہوں نے ان آوازوں کو مخلوط حروف ہی سے لکھنے پر اکتفا کیا.

ڈاکٹر گیان چند اور دسنوی صاحب دونوں کے مضمونوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے اعراب اور ہمارے علتی حروف خود ہماری زبان کی آوازوں کو ادا نہیں کرسکتے. ایک دقت یہ بھی پیش آتی ہے کہ ہماری زبان ایک جاذب زبان ہے اور اسے دوسری زبانوں کے لفظوں کو اپنے سانچے میں ڈھالنے کا خاص ملکہ حاصل ہے. جیسے کسی زمانے میں عربی' فارسی اور ترکی کے لفظ اس میں آکر گھل مل گئے اسی طرح اب انگریزی اور بعض دوسری مغربی زبانوں کے لفظ اس میں شامل ہورہے ہیں، اور یہ رفتار روز بروز زیادہ تیز ہوتی جارہی ہے. اردو زبان کی ابتدائی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے ہندی کے الفاظ کو اردو میں لکھنے کے لئے بعض جدید حروف اختراع کئے جیسے ٹ، ڈ، ڑ، لیکن بہت جلد ہجائی اختراع کا دروازہ بند ہوگیا اور اردو والے اپنی لپی کو اتنا مکمل سمجھنے لگے کہ وہ اردو حروف میں کسی قسم کی اختراع کا نام بھی سننے کے روادار نہیں رہے. سب سے بڑی دقت اعراب کے مسئلے حل کرنے میں پڑی. ہمارے اعراب اور علتی حرف نہ صرف غیر زبانوں کے اعراب کی تاب نہیں لاسکتے بلکہ وہ خود اردو کے بعض اعراب کو ہُو بہو تحریر میں لانے سے عاری ہیں. یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر گیان چند اور دسنوی صاحب دونوں نے اعراب اور علتی

حروف دونوں کے صحیح تلفظ کے لئے « رومن » اور « بین قومی » علامتوں پر حصر کیا ہے۔

جناب شان الحق حقی نے اردو زبان کی آوازوں خصوصاً اعراب اور علتی آوازوں کا پورا مطالعہ کیا ہے، اور وہ اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ اردو میں تیرہ « مصوتے » یعنی علتی آوازیں ہیں۔ گیان چند صاحب ان کی تعداد چودہ بتاتے ہیں۔ ہماری لیپی کی کم مایگی کی یہ کیفیت ہے کہ معمولی طور پر معروف اور مجہول کے تحریری اظہار میں فرق نہیں کیا جاتا اور زبر، زیر، پیش کی لمبی، وسطی، اور چھوٹی آوازوں کے لئے کوئی اعراب نہیں۔ اردو زبان کو پنجاب کا ممنون ہونا چاہئے کہ اس نے نون غنہ کے لئے غیر منقوط « ں » اور مدغم « ہ » کے لئے « ھ » کو عام کردیا ہے، ورنہ پچاس برس پہلے تک تو مدغم اور غیر مدغم « ہ » کے درمیان فرق کرنا ناممکن تھا اور اب بھی اس صحت مند قاعدے کی کبھی پابندی کی جاتی ہے اور کبھی نہیں کی جاتی۔ جو انگریزی لفظ اردو میں آگئے ہیں ان میں متعدد ایسی آوازیں پنہاں ہوتی ہیں جن کے لئے ہمارے یہاں اعراب نہیں اور ان کی املا من مانی طرح سے کی جاتی ہے۔ cap کے « a » کو شمالی ہند اور پاکستان میں « کیپ » لکھا جاتا ہے اور جنوبی ہند میں « کیاپ »۔ اسی طرح pen میں e کی جو آواز ہے اس کے لئے اردو میں کوئی علامت نہیں۔

یہ دوسری مشکل تو اس وقت پیدا ہوگی جب ہم غیر زبانوں کے نامانوس الفاظ اردو میں لکھنے کی کوشش کریں گے۔ یہ کوشش میرے نزدیک ناممکن عمل ہوگی۔ جیسا کہ اوپر دکھایا جاچکا ہے کوئی ایسا حرف مشکل سے ایسا ہوگا جس کا تلفظ دو زبانوں میں یکساں ہو۔ رومن حروف کے لئے انگریزی کا سانچا ڈھونڈھنا ایسا ہی ہے جیسے اردو میں جو عربی حروف رائج ہیں ان کی آواز کے لئے عربوں کا سا تلفظ ڈھونڈھنا۔ اگر ہم ایسی علامتوں کے پیچھے پڑجائیں گے جو دو یا تین اہم یورپی زبانوں کے مخرج کو ادا کرسکیں تو ہمیں علامتوں کے ایسے گھنے جنگل میں سے گذرنا پڑے گا جس سے ہم کبھی بھی نہ نکل سکیں گے۔ پچیس برس کے قریب ہوئے اس وقت جامعہ عثمانیہ میں اس کی کوشش کی گئی تھی کہ مختلف زبانوں کے اعلام کو اردو کے سانچے میں ڈھالا جائے۔ اس پر بہت کچھ محنت کی گئی اور علتی حروف ہی کے لئے نہیں بلکہ بعض صحیح حروف

کے لئے بھی دو تین یورپی زبانوں کے تلفظ کو اردو کا جامہ پہنانے پر وقت صرف کیا گیا۔ مگر انتہائی پیچیــــدگی اور تنوع کی وجہ سے یہ کوشش بالکل ناکام ثابت ہوئی۔

ہمیں اردو تحریر میں دو طرح کے بیرونی لفظوں سے سابقہ پڑے گا۔ ایک وہ جو ہماری زبان کا گویا جزو بن گئے ہوں اور دوسرے وہ اعــلام اور دوسرے لفظ جو اتفاقاً ہماری تحریر میں آ جائیں۔ پہلے قسم کے لفظوں کو ایک طرح کی ٹکسالی شکل دی گئی ہے۔ Station کا صحیح انگریزی تلفظ تو Steyshn ہے مگر اسے اسٹیشن کہتے ہیں۔ اسی طرح Council کا انگریزی تلفظ Khownsl ہے مگر اسے محض کونسل کہتے ہیں۔ انگریز جب اپنے کسی لفظ میں علتی حرف کا تلفظ کرے گا تو وہ لازماً دو علتی آواز Dephthong سے ادا کرے گا مگر ہم اسے روا نہیں رکھتے۔ غرض غیر زبانوں کے جو لفظ ہمار زبان کا جزو بن گئے ہیں ان کی بابت تو وہی مسئلے پیش آئیں گے جو خود اردو کے ٹکسالی لفظوں کی تحریر میں پیش آتے ہیں۔ باقی جو غیر زبانوں کے لفظ خصوصاً اعلام ایسے ہیں جو اردو سے بے گانہ ہیں ان کی بابت میری رائے ہے کہ بجائے اس کے کہ ان کے اصل لفظ کو کھوجا جائے اور اسے مسخ کیا جائے یہ بہتر ہوگا کہ انہیں ہُو بہو رومن حروف میں لکھ دیا جائے۔

مروجہ اردو رسم خط کی ایک کمزوری یہ بھی ہے کہ جب تک ہم کسی لفظ سے پہلے سے آشنا نہ ہوں اس وقت تک اسے صحیح نہیں پڑھ سکتے۔ سب سے پہلے صحیح حرفوں کے چار مجموعوں کو لیجئے: [۱] ح، ہ، [۲] ث، س، ص، [۳] ذ، ز، ض، ظ، [۴] الف، ع، ھمزہ۔ اردو زبان میں ان میں سے ہر مجموعے کے حروف کا مخرج بالکل ایک سا ہوتا ہے اور تاوقتیکہ کوئی شخص ان کی ماہیت اور ان کے ماخذوں سے واقف نہ ہو اس وقت تک محض اس کے سننے سے اس کی املا سے متعلق کوئی نتیجہ نہیں نکال سکتا۔ علتی حروف کی املا کی دقت صحیح حروف کی املا سے کئی گنا زیادہ دقت طلب ہے۔ ہم نے عربی زبان سے صرف تین اعراب، یعنی زیر، زبر، پیش، [فتحہ، کسرہ، ضمہ] لے لیے مگر اس کا خیال نہیں کیا کہ یہ تین اعراب اردو زبان کے چڑھاؤ کے لئے کافی نہیں ہوں گے، اور اردو میں ایسی بہت سی دوسری آوازیں بھی ہیں جن کا اظہار صرف

یہ تین اعراب نہیں کرسکتے. اس کے علاوہ ان اعراب کا تلفظ عربی میں معروف کی حیثیت سے کیا جاتا ہے تو اردو میں یہ مجہول سمجھے جاتے ہیں. ہم نے صحیح حرف کی حد تک ٹ، ڈ، ڑ، کا اضافہ کرلیا مگر اعراب میں جو اضافہ ہوا ہے وہ حال حال میں ہوا اور وہ صرف اتنا ہے کہ کھچی ہوئی آوازوں کے لئے الٹا پیش اور سیدھا زیر استعمال کیا جائے. ان کے علاوہ اعراب میں کبھی کسی اضافے یا ترمیم کی کوشش نہیں کی گئی. اس کے برعکس ہم نے تنوین کو بھی اپنالیا اور اس کی وجہ اپنے رسم خط میں ایک اور دقت پیدا کردی. اگر اردو لپی کے مؤسس اردو کی ضرورتوں کے پیش نظر صحیح حرفوں کی طرح علتی علامتوں کا بھی اضافہ کرلیتے تو جو دقتیں اردو تلفظ کے اعراب میں پیش آ رہی ہیں ان میں بہت کچھ کمی ہوجاتی. دسنوی صاحب اور ڈاکٹر گیان چند «بہترین رسم خط» کی تعریف میں صحت کے علاوہ اس کے سہل ہونے کو بھی ضروری سمجھتے ہیں. ذرا ان لپیوں پر غور کیجئے جن کے رسم خط حال ہی میں بدلے گئے ہیں. ان میں ترکی، انڈونیشیا، اور ملایا پیش پیش ہیں. مگر پہل کرنے کا سہرا وسطی ایشیا کے سوویت جمہوریوں ہی کو حاصل ہے جنھوں نے ۱۹۲۰ ع میں ترکی اور فارسی رسم خط کی جگہ رومن حروف کو اختیار کرلیا اور چند علامات لگاکر ان زبانوں کو ان کے سانچوں میں ڈھال لیا. ۱۹۲۰ ع سے ۱۹۳۶ ع تک ترکمنستان، ازبکستان، آذربائیجان، قزاقستان، وغیرہ میں ترکی اور فارسی کے لئے رومن حروف ہی رائج رہے، لیکن ۱۹۳۶ ع میں انھیں ان زبانوں کے لئے روسی حروف اختیار کرنے پڑے اور اب ارمنستان کے علاوہ سویت روس کے جمہوریوں میں روسی رسم خط ہی کا رواج ہے.

ترکی، اور اب حال میں انڈونیشیا اور ملایا نے بھی اپنے اپنے قدیم رسم خط کی جگہ رومن رسم خط اختیار کرلیا ہے. ان تینوں ملکوں میں رسم خط کو آسان بنانے کے لئے تلفظی (phonetic) طریقے کو اختیار کیا ہے، یعنی بلا لحاظ حرف کی اصل کے، جیسے بھی ملک والے کسی لفظ کو بولتے ہیں اس طرح اس حرف کے لئے رومن حرف مقرر کیا گیا ہے. مثال کے طور پر چونکہ ترکی میں خ کا تلفظ ح ہی کیا جاتا ہے اس لئے «ینی ترکچہ» یعنی نئے ترکی رسم خط (رومن) میں صرف h کو کافی سمجھا گیا ہے اور خ کے لئے کوئی علامت

نہیں. اس کے برعکس غ کا ترکی میں بہت کچھ استعمال ہے اور اس کے لئے Ğ کا حرف رکھا گیا ہے. اس طرح چ کے لئے c (جو اس آواز کی بین قومی علامت ہے،) ج کے لئے ç ، ڈ ترکی میں مفقود ہے اس لئے د کے لئے d ہے، اور علتی حروف اور علامتوں کے لئے رومن علتی حروف پر ۸ یا .. لگاکر ترکی زبان کی ضرورتیں پوری کی گئی ہیں. اس طرح طباعت کی اغراض کے لئے بجائے ۱۷۶ علامتوں کے فرمے کے (جن کی عربی نسخ میں ضرورت تھی) اب رومن ترکی رسم خط کے فرمے کے لئے ۱۰۰ علامتوں کی ضرورت باقی رہ گئی ہے. ترکوں نے اپنی زبان کی کسی آواز کے لئے مخلوط حروف کی ضرورت نہیں سمجھی، مگر انڈونیشی اور ملائی زبانوں میں مخلوط اور مدغم حروف کو ہی استعمال کیا گیا ہے.

اس تفصیل کی اس لئے ضرورت ہوئی کہ ہم خود اردو زبان کو بعض خاص حالات میں رومن املا میں لکھنے کی کوشش کر رہے ہیں. چونکہ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ غیر زبان والوں کے لئے اردو تلفظ کو پیش کیا جائے اس لئے جہاں تک ہوسکے نئی علامتوں میں پیچیدگی پیدا نہیں کرنی چاہئے ورنہ جو مقصد ہے وہ حاصل نہیں ہوگا. ہمارا موجودہ رسم خط لفظوں اور شوشوں سے بھرا پڑا ہے اور یہ نقطے محض بے کار نمائشی چیز نہیں بلکہ حروف کا جزو ہیں، چنانچہ اردو کی رومن املا میں بھی لفظوں اور شوشوں کے ذریعے سے بعض حروف کو دوسرے حروف سے ممتاز کیا جاسکتا ہے.

پہلے صحیح حرفوں کو لیجئے. دسنوی صاحب نے جو اسکیم پیش کی ہے اس میں صحیح حرفوں کی موجودہ شکلیں برقرار رکھی ہیں اور علتی حروف کے لئے رومن شکلیں اختیار کی ہیں. جو مثالیں دسنوی صاحب نے دی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس قسم کی عبارت لکھنے پڑھنے میں بہت تکلف ہوگا. رومن حروف کی کشش بائیں سے دائیں طرف اور اردو حروف کی کشش دائیں سے بائیں کو ہوتی ہے. ساتھ ہی ڈیشوں اور الٹے واو سے بھی جو ٹھہراو کی علامتیں قرار دی گئی ہیں اور جو ہر لفظ کی املا کا گویا جزو بنادی گئی ہیں لفظ دوگنی بلکہ چوگنی جگہ گھیرلینگے. ایک معمولی لفظ «کتاب» کو «ک i ت a ب» لکھا گیا ہے! اس کے کمپوز کرنے لکھنے اور پڑھنے ہر کام میں دقت ہوگی اور

طباعت کے لئے حروف کا فرق دوگنا چوگنا رکھنا پڑے گا. ڈاکٹر گیان چند کی اسکیم منطقی اعتبار سے بہتر ہے اس لئے کہ اس میں صحیح اور علتی دونوں قسم کے حروف کے لئے رومن حروف کو ترجیح دی گئی ہے اور نفس حروف کے لئے صحیح حرف کے ساتھ h کا اضافہ کیا گیا ہے. نیز ٹ، ڈ، ڑ کے لئے بنیادی حرفوں پر نقطے لگائے گئے ہیں جیسے ṭ، ḍ، ṛ، لیکن انھوں نے ن، گ، کے لئے ایک خاص علامت ŋ کا اضافہ کیا ہے حالانکہ اس کے واسطے ng عام فہم بھی ہوگا اور ن، گ، کی مخصوص آواز پر حاوی بھی. اس طرح ش کے لئے s̤، ژ کے لئے zh، اور غ کے لئے (لا کی جگہ جس سے بے کار التباس ہوگا) gh، کافی ہوگا. یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ ڈاکٹر صاحب نے بعض آوازوں کے لئے بڑے رومن حرف اور بعض کے لئے چھوٹے رومن حرف کیوں تجویز کئے ہیں. ممکن ہے کہ یہ طباعت کا کرشمہ ہو. سہولت تو اس میں ہے کہ رومن اردو میں بڑے حروف capital letters بالکل استعمال نہ کئے جائیں.

اس طرح صحیح اور نیم صحیح حروف کی رومن شکلیں یہ ہونگی:

الف a، ب b، پ p، ت t، ٹ ṭ، ث س ص s، ج j، چ c، ح ہ h، خ x، [یہ بین قومی علامت ہے اور ڈاکٹر گیان چند نے خ کے لئے یہی علامت رکھی ہے] د d، ڈ ḍ، ذ ز ظ ض، z، ر r، ڑ ṛ، ژ zh، ش sh یا s̤، ع کے لئے الٹا پیش، غ gh، ف f، ق q، ک k، ل l، م m، ن n، و w.

علتی حروف کے اتار چڑھاو کی رعایت سے کچھ نئی علامتیں نکالنی پڑینگی، زبر کے لئے سادہ a زیر کے لئے سادہ i، پیش کے لئے سادہ u کے بارے میں بحث کی کوئی گنجایش نہیں. کشیدہ آوازوں کے لئے انھی حروف پر ایک چھوٹی سی لکیر کردی جائے تو جگہ بھی نہیں گھرے گی اور کام بھی نکل جائے گا جیسے ā، ī، ū. یہ تو چھ اعراب ہوگئے. ان کے علاوہ اَے اَو کے واسطے آسانی اس میں ہے کہ ان کا اظہار ai اور au سے کیا جائے. اب یائے مجہول اور و مجہول کو لیجئے. ان کے لئے e اور o مناسب ہونگے اور انھیں کھینچ کر پڑھا جائے جیسے [دیر اور روز] تو ان آوازوں کے لئے ē اور ō کو خط کیشدہ لکھا جاسکتا ہے، جیسے rōz, dēr جس حرکت کو دسنوی صاحب واو اوسط کہتے ہیں اور جن کی

مثالیں انہوں نے ڈوپٹہ اور عہدے سے دی ہیں وہ اصل میں او کشیدہ ہی کی مثالیں ہیں اور انہیں dopațța اور ŏhda لکھا جائے گا. اب صرف ایک حرکت اور رہی جسے دسنوی صاحب اے اوسط کہتے ہیں اور جو «پہلا» کی پ اور «محفل» کی م کے اعرابوں سے ملتی ہے. اس کے لئے ایک نئی علامت نکالی جاسکتی ہے جس سے زیادہ جگہ بھی نہ گھرے اور تلفظ بھی ادا ہوجائے اور وہ دونقطوں والی e ہے، جیسے pëhla اور mëhfil .

اس طرح بغیر کسی بڑے اختراع کے اردو علتی حروف اور اعراب کی رومن شکلیں یہ ہوئیں :-

a، ā، i، ī، u، ū، ai، au، e، o، ē

اس اسکیم کے بموجب ڈاکٹر گیان چند کی علامات ū، u، n، e، ɘ، Ɛ، سے واسطہ نہیں پڑے گا اور بین السطور جگہ بڑھنے کا بھی اندیشہ نہیں رہے گا.

آج کل بہت سے اردو رسالوں میں خط کی اصلاح اور اسے رومن حروف کے سانچے میں ڈھالنے کی طرح طرح کی اسکمیں نکل رہی ہیں. اس بارے میں دو باتیں نہایت ضروری ہیں: ایک تو یہ کہ ہم فی الفور اس دقیانوسی طرز طباعت کو خیر باد کہیں جسے لیتھو کہتے ہیں. دنیا بھر میں اردو ہی ایک ایسی زبان ہے جسے لیتھو میں چھاپا جاتا ہے اور اس کی وجہ سے ہمارے بہترین اخبار، کتابیں رسالے بدترین طور پر طبع ہوتے ہیں. دوسرے اب وقت آگیا ہے کہ ہندوستان پاکستان کے چیدہ چیدہ اہل فکر سر جوڑ کر بیٹھیں اور یہ طے کریں کہ اردو زبان کے لئے رومن املا میں کیا کیا تصورات کئے جائیں کہ دوسری بیسیوں بلکہ سیکڑوں زبانوں کی طرح اردو بھی بشرط ضرورت اس لپی میں ڈھل سکے. اگر اس قسم کا اجتماع نہ ہوا اور کوئی متفقہ اسکیم نہ نکلی تو بڑے سے بڑے مفکروں اور دانشوروں کے بہترین خیالات صدا بصحرا ثابت ہونگے.

وقت تیزی سے دوڑ رہا ہے اور کسی کا انتظار نہیں کرتا. کہیں ایسا نہ ہو کہ جب ہم اردو رسم خط کو سہل اور کارآمد بنانے کے لئے بٹھیں تو اس وقت یہ انکشاف ہوکہ اردو پڑھنے والے ہی نہیں رہے. اب اس کے رسم خط پر غور کرنے سے کیا فائدہ!

* ایم. اے. حفیظ

امثال و اقوال

(۲)

اگر غور کیا جائے تو دنیا میں جتنے فسادات یا جھگڑے ہوتے ہیں ان میں زیادہ تر « غلط فہمی اور بدظنی » کا ہاتھ ہوتا ہے، یہ بات شخصی زندگی سے لے کر ملک و قوم پر بھی عائد ہوتی ہے، اس لئے غلط فہمیوں سے بچنے کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ کسی پر کم سے کم بھروسہ کیا جائے، اور اپنی ذات پر زیادہ سے زیادہ بھروسہ کرے. غلط فہمی کی جڑ بدزبانی اور برا برتاؤ ہے. عقل مند کم سے کم بولتا ہے لیکن بات تول کر کرتا ہے. ذیل کے اقوال اس چیز کو سمجھنے میں بہت مدد دیتے ہیں.

بدظنی اور گرد بینی

۱ « عاقل کو اگر اپنی بہبودی' عمردرازی اور خوش بختی منظور ہو تو کسی پر بھروسہ نہ کرے.» [پنچ تنتر]

۲ « کمزور بھی اگر بدگمانی اپنا شیوہ کرے تو قوی سے قوی اس کو ہلاک نہیں کرسکتا اور زور آور اگر نیک ظن ہو تو کمزور اُس کو جلد مار ڈالتا ہے.» [پنچ تنتر]

۳ « جس دشمن سے پہلے کبھی لڑچکا ہو وہ اگر دوست بھی ہوجائے تو اس پر اعتماد نہ کرے.» [پنچ تنتر]

۴ « عاقل کو چاہئے کہ اپنا مال کسی کو نہ دکھائے مقدار میں وہ کیسا ہی کم کیوں نہ ہو، کیوں کہ مال کو دیکھ کر جوگی کے دل میں بھی ہلچل پڑجاتی ہے.» [پنچ تنتر]

۵ « زور آور سے لڑنا کمزور کی موت کا باعث ہوتا ہے. مثلاً جس پتھر سے

* جناب ایم. اے. حفیظ، دار الشفاء، حیدرآباد ۳ (دکن)

ہانڈی ٹوٹ جاتی ہے وہ کھڑے کا کھڑا رہتا ہے۔ [پنچ تنتر]

۶ جو شخص ایسے کام میں دخل دیتا ہے جس سے اسے کچھ سروکار نہ ہو وہ اپنے ہاتھوں ہلاک ہوتا ہے، جیسے وہ بندر جو پچڑ کو نکال لیتا ہے۔ [پنچ تنتر]

۷ سمجھدار آدمی تھوڑے کے پیچھے بہت کو نہیں گنواتا ہے اس دنیا میں دانائی یہ ہے کہ تھوڑا گنواکر بہت کو بچائے۔

۸ جو یقینی کو چھوڑ کے مشکوک کے پیچھے دوڑتا ہے وہ یقینی اور مشکوک دونوں سے منہ موڑتا ہے۔ [ہتھوپدیش]

۹ برے کام پر کمر باندھنا، کسی عزیز سے دشمنی رکھنا، جو اپنے سے طاقتور ہو اس سے مقابلہ کرنا اور عورتوں پر بھروسہ کرنا یہ موت کے چار کھلے دروازے ہیں۔ [ہتھوپدیش]

۱۰ اس دنیا میں عاقل سے جب کوئی سوال پوچھا جائے تو اس کو بیدھڑک ہوکر بولنا چاہئے جب کوئی نہ پوچھے تو بولنا ایسا ہے جیسا جنگل میں رونا۔ [پنچ تنتر]

۱۱ جو سودائی کسی ایسے شکاری سے بات کرے جس کی محنت رائگاں گئی ہو یا کسی ایسے احمق سے جو مصیبت میں گرفتار ہو وہ اپنے ہاتھوں سے اپنے اوپر خفت نازل کرتا ہے۔

۱۲ تیر کا چھدا گھاؤ بھر جاتا ہے، تلوار کا کٹا زخم اچھا ہوجاتا ہے، پر بدزبانی کا ایک لفظ نفرت کی آگ کو بھڑکا دیتا ہے۔ جو زخم تیغ زبان کے وار سے پیدا ہو وہ کبھی مندمل نہیں ہوتا۔

لیکن ان اقوال میں اس بات پر اہمیت دی گئی ہے کہ زندگی کو سکھی بنانے میں انسان کو ایک خاص قسم کی احتیاط لازمی ہے یہ احتیاط زبان و عمل دونوں پر منطبق ہوتی ہے۔ محتاط آدمی اپنی زندگی کو الجھنوں سے محفوظ رکھتا ہے اور بے احتیاط آدمی نئی نئی اور غیر ضروری مشکلات اپنے اوپر عائد کرلیتا ہے۔ زندگی کا سفر بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے، نت نئی الجھنوں، بدنظمیوں میں مبتلا ہونے سے پرہیز کرنا ایک کامیاب زندگی کے لئے شرط اول

ہے . حکماء اور دانشمندوں نے ہمارے لئے ایسے نشانِ راہ چھوڑ دئے ہیں جن پر عمل کرنے سے افراد و اقوام ایک پرسکون زندگی گذارسکتے ہیں اسی لئے غور و فکر انسان کا وہ ہتھیار ہے جس کا وار کبھی اوچھا نہیں ہوتا بلکہ ایسے نتائج برآمد ہوتے ہیں جو مثبت اقدار کی رہنمائی کرتے ہیں .

دنیا کے بہت سے کام صبر و شانتی سے انجام پاتے ہیں کسی نے سچ کہا ہے کہ « صبر تلخ است و لیکن بر شیرین دارد . » اور یہ بھی تو کہا گیا ہے کہ جو شکر سے مرسکتا ہے اسے زہر کی کیا ضرورت ہے . اس لئے نرمی و ملائمت سے جو بات بن سکتی ہے اور اتحاد و اتفاق سے جو کام آسانی سے نکل سکتے ہیں وہ نفاق اور تردد سے انجام نہیں پاسکتے . دوستی اور اتحاد میں بڑی طاقت ہے اور آپس میں صلح و آشتی ایک انمٹ جوہر ہے اس لئے دانشمند چند مشورے اقوال کی صورت میں ہمارے لئے چھوڑ گئے ہیں جو درج ذیل ہیں .

صبر اور شانتی

١ جو لوگ کار پردازی میں ماہر ہیں ان کو لازم ہے کہ ہر معاملہ میں اول ملائمیت سے کام لیں کیوں کہ جو کام ملائمیت سے طے ہوتا ہے اس میں کوئی خرابی نہیں پڑتی . [پنچ تنتر]

٢ انسان کے لئے اتحاد سے بہتر کوئی چیز نہیں ہوتی خصوصاً کسی دوست کے ساتھ . جب دھان کا چھلکا اتر جاتا ہے تو اس سے کچھ اگتا نہیں ہے . [پنچ تنتر]

٣ چھوٹی چھوٹی چیزوں کے اکٹھا ہونے سے بڑا نتیجہ پیدا ہوتا ہے . گھاس کے پتے جب بٹ کر رسی بن جاتے ہیں تو اس سے مست ہاتھی بھی بندھ سکتا ہے . [ہتھوپدیش]

یہ مختصر اور زرین امثال آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں کیونکہ یہ مشکل مسائل کے حل کرنے میں بڑے خلوص کے ساتھ مدد دیتے ہیں . ان کو اپنانا مشکل ہے لیکن ان پر عمل کرنے سے گہرے اور کارآمد نتیجے برآمد ہوتے ہیں . جس نے صبر و تحمل کا ساتھ دیا اور اتحاد و اتفاق سے کام لیا اس کا بیڑا پار ہے اور اس کی راہ میں کانٹے کم اور پھول زیادہ ہیں . اس کی زندہ مثال ہمارے دیش کی آزادی ہے . مہاتما گاندھی نے جس صبر و تحمل اور صلح و آشتی سے

کام لےکر ملک کو غیروں کے پھندے سے بچایا وہ بے مثال ہے ۔ عدم تشدد اور اہنسا کے استعمال نے دنیا میں ایک مثال قائم کردی کہ حق کی حفاظت بغیر ایک قطرہ خون بہائے بھی ہوسکتی ہے ۔ ایک ، دو نہیں چالیس کروڑ انسانوں کے حقوق کی حفاظت وہ بھی بغیر جنگ و جدال کے ایک معجزہ سے کم نہیں۔ جو صرف صبر و تحمل ، اتفاق و اتحاد کا ایک مظاہرہ ہے ۔ مہاتما اوز ان کے ساتھیوں کو اپنے اس بے ہتھیاری کے ہتھیار پر پورا پورا بھروسہ تھا اور جب یقین ایمان کی صورت اختیار کرلیتا ہے تو کامیابی خود قدم چوم لیتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ باپو کی زندگی امر ہوگئی جو آئندہ نسلوں کے لئے مشعل راہ ہے ۔

ایک شاعر کا قول ہے کہ

مے خور و مصحف بسوز و آتش اندر کعبہ زن
ساکن بت خانہ باش و مردم آزاری مکن

تسخیر قلوب اسم اعظم سے کم نہیں ہے ۔ دلوں کو توڑنا جتنا آسان ہے ان کو جوڑنا اتنا ہی مشکل امر ہے لیکن انسانی پیدائش کا مفہوم بھی یہ ہے کہ انسان ، انسان سے محبت کرے ۔ مگر یہ کام بہت محال و مشکل ہے کیوں کہ انسان کی طبعیتوں میں تضاد پایا جاتا ہے اس لئے تسخیر قلب حاصل کرنا ہو تو طبعیتوں کے رجحان کا اندازہ لگانا ضروری ہے ۔ بخیل کی دلجوئی روپیہ ، پیسہ سے ، ضدی آدمی کی اطاعت سے ، اور دولت مند کی خوشامد سے ، دل دہی کی جاسکتی ہے اور اسے قابو میں لایا جاسکتا ہے لیکن دلوں پر فتح پانے کے لئے ذیل کے اقوال ہمارا راستہ معین کرنے میں مددگار ثابت ہوں گے ۔

تسخیر قلب

۱ ہر ایک شخص سے اس کی طبعیت کے مناسب سلوک کرنا چاہئیے ۔ جب عاقل کو کسی دوسرے کے خیالات جذبات پر عبور ہوجاتا ہے تو وہ بہت جلد اس کو اپنے قابو میں کرلیتا ہے ۔ [پنچ تنتر]

۲ دوست کی دلجوئی اچھے جذبات سے ہوتی ہے ، والدین کی ان کی حرمت کرنے سے ، عورتوں اور نوکر چاکروں کی تحفہ تحائف دینے سے اور رعایت کرنے سے اور اوروں کی اپنے سلیقہ سے ۔ [ہتوپدیش]

۳ بخیل کی دلجوئی روپیہ سے کرنی چاہئیے ۔ سخت گیر آدمی کی اطاعت سے ،

جاہل کی ملائمیت سے اور تعلیم یافتہ آدمی کی کشادہ دلی سے ۔ [پنچ تنتر]

تالیف قلوب کی اہمیت مسلم و مقدم ہے اور اس راستہ میں جو بھی مشکلات پیدا ہوتے ہیں اس عظیم مقصد کے لئے انہیں گردِ راہ سمجھنا چاہئیے ۔ دلوں کے اتحاد سے بگڑی بات بن جاتی ہے ، ہر آدمی کچھ نہ کچھ انسانی نفسیات سے واقف ہوتا ہے اور یہ ایک نفسیاتی عمل ہے کہ کس طرح دلوں میں جگہ پیدا کی جاسکتی ہے ۔ بعض مرتبہ مخلص بھی دھوکہ کھا جاتا ہے اور نیت بخیر ہونے کے باوجود بھی اپنے نفسیاتی علم کی کمی کی وجہ سے وہ دوسرے کا دل توڑ بیٹھتا ہے اس لئے اس نازک معاملہ میں بہت احتیاط برتنے کی ضرورت ہے ۔

دنیا خود ایک مکر و فریب کی جگہ ہے اور یہاں کے کاروبار زیادہ تر سیاست اور مکاری سے آسانی کے ساتھ انجام پاتے ہیں ۔ فطرت پر بھی ہم غور کریں ، تو اس بات کا اندازہ ہوجاتا ہے کہ شکاری کو تھوڑے بہت فریب سے کام لینا ضروری ہے ورنہ وہ شکار سے محروم رہے گا ۔ بہ الفاظ دیگر یہی دنیا سازی ہے اور یہی دنیا کی ریت ہے ۔ صاف باطنی ایک اچھی صفت ہونے کے بعد بھی ہرجگہ کامیابی حاصل نہیں کرسکتی کیوں کہ وہ ایسا آئینہ ہے جس میں ہر صورت حال کی تصویر اصلی شکل میں ظاہر ہوجاتی ہے اور یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ اپنے محاصل کو بڑھا چڑھاکر دیکھ سکتا ہے لیکن نقائص و عیوب سے منہ موڑ لیتا ہے اور بنتا کام بگڑ جاتا ہے ۔ اس لئے وہ ہتھیار ہی کیا جو اپنے وار کو کھودے اس لئے دنیاوی کاموں میں تھوڑا بہت مکر و فریب ناگزیر ہے ، یہ پرانی ریت ہے جو ہر عہد اور ہر زمانے میں کارگر ثابت ہوئی ہے ۔ اس لئے کہ شوگر کوٹیڈ (Sugar Coated) کونین حلق سے اتر سکتی ہے لیکن سادہ کونین کا پینا محال ہوجاتا ہے ۔ ذیل کے مقولے انسانی فطرت کی اس کمزوری یا خوبی کی گواہی دیتے ہیں ۔

صاف دلی اور مکر و فریب

۱ صاف دلی جوگیوں ہی کے لئے بہت خوب ہے جو ہمیشہ دھیان میں مصروف رہتے ہیں مگر جو دولت کے طلب گار ہیں ان کے لئے اور خصوصاً بادشاہوں کے لئے نازیبا ہے ۔ [پنچ تنتر]

۲ جو شخص عورت سے ، دشمن سے ، یا نالائق دوست سے ، صاف باطنی کرے وہ زندہ نہیں رہتا ۔

۳ مینڈھا جب پیچھے ہٹتا ہے تو حملہ کرنے کو۔ شیر ببر بھی جب غصہ میں سکڑ جاتا ہے تو جست کرنے کی نیت سے، جب عاقل کے دل میں عداوت بھری ہوتی ہے اور وہ خفیہ طور پر سونچتا رہتا ہے تو جب کوئی منصوبہ وہ ٹھان لیتا ہے تو اس کو ہر چیز کی برداشت ہوتی ہے۔ [ہتوپدیش]

۴ جس عاقل میں یہ مادہ ہو کہ جس سے وہ مخاطب ہوا کرے اس کی طبیعت کو فوراً پہچان جائے وہ جلد اپنی حکومت اس پر جما لے گا۔ [ہتوپدیش]

لیکن باوجود ان اقوال کی اہمیت کے مکر و فریب کا حد سے گذر جانا خود شکاری کو شکار بنا دیتا ہے اور اپنی مقصد برآری کے لئے جو کنواں وہ دوسروں کے لئے کھودتا ہے خود اسی میں گرجاتا ہے۔ کیوں کہ نظام کائنات میں ہر چیز میں توازن لازمی ہے اس توازن کو قائم رکھنے کے لئے جو بھی حربے استعمال کئے جائیں وہ متناسب و متوازن ہوں ورنہ شکر جیسی میٹھی چیز جب حد سے زیادہ کسی شئے میں ڈالی جاتی ہے تو اس کو کڑوا کردیتی ہے۔ انار کی مٹھاس ہی اس کے اندر کیڑے پیدا کرتی ہے اور مکاری و دنیا سازی ایسا حربہ ہے جو وقتی طور پر دنیاوی کاموں کو بنا ڈالتا ہے لیکن اس میں یہ طاقت نہیں ہوتی کہ منفی کو مثبت سے بدل دے۔

روایت ہے کہ نپولین نے اپنی لغت سے ناممکن کے لفظ کو نکال دیا تھا کیوں کہ انسان کی ہمت اور ارادہ ہی ایک ایسی چیز ہے جو باوجود دشوار گزار راستوں پر سے جانے کے اسے منزل مقصود تک پہنچاتا ہے۔ ثابت قدمی اور استقلال جو اٹل قانون ہیں کبھی ناکامی کا منہ نہیں دیکھتے۔ اسی کی بدولت انسان نے زمین کے چپہ چپہ کا نشان دریافت کیا، ہوا و پانی کی قوت کو آزمایا، ہمالیہ کی سب سے اونچی چوٹی پر ٹین سنگھ نے جھنڈا گاڑ دیا۔ یہ بھی روایت ہے کہ تیمور جب اپنے ملک میں ناکام و نامراد ہوکر ایک درخت کے نیچے بیٹھا تھا تو اس نے ہمت و استقلال کا سبق ایک چیونٹی سے سیکھا تھا۔

تیمور نے ایک مورچہ زیرِ دیوار دیکھا کہ چڑھا دانہ کو لے کر سو بار
آخر سر بام لے کے پہنچا مشکل نہیں پیش ہمت دشوار

پایہ ثبات اور استقلال کی کہانی انسانی ارتقاء کی کہانی ہے جس کا عزم اور ہمت جوان ہو وہ ہمیشہ جوان رہتا ہے۔ اس باب میں چند مقولے پیش کئے جاتے ہیں۔

ثابت قدمی اور ہمت

۱ . ..کسی کام کا شروع کرنا عقلمندی کی پہلی نشانی ہے اور جو کام شروع ہوچکا ہو اس کو اختتام پھونچانا دانشمندی کی دوسری نشانی ہے ۔ [پنچ تنتر]

۲ کاروبار میں کامیابی کوشش سے ہوتی ہے نہ مراد مانگنے سے ۔ سوتے شیر کے منہ میں ہرن آپ سے آپ نہیں بیٹھہ جایا کرتے ہیں ۔ [پنچ تنتر]

۳ وہ کونسا بوجھہ ہے جس کو طاقتور نہ اوٹھاسکے ؟ کونسی مسافت ایسی لمبی ہے جسے ہمت والا طے نہ کرسکے ؟ تعلیم یافتہ آدمی کے نزدیک کونسا ملک بالکل اجنبی ہے ؟ جو ملائمت سے بات کرے اس کا کون دشمن ہے ۔
[پنچ تنتر]

۴ جس آدمی کا دل مضبوط ہو وہ بدوں دولت کے بھی دوسروں پر سبقت لے جاتا ہے اور لوگ اس کی عزت کرنے لگتے ہیں ۔ ضعیف آدمی کے پاس کتنی ہی دولت کیوں نہ ہو لوگ اس کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں ۔
[پنچ تنتر]

۵ جو شخص کسی بلا میں مبتلا ہوجائے اور اس حالت میں اس سے سوائے بیہودہ گلہ شکوہ کے کچھہ نہ ہوسکے تو اس کی مصیبت بڑھتی ہی جائے گی اور کبھی ختم نہ ہوگی ۔ [پنچ تنتر]

لیکن دنیا کے بڑے بڑے کام ہمت و استقلال کے رہین منت ہیں ۔ شہسوار وہی ہے جو گرنے کے باوجود اٹھہ کر کمر ہمت باندھہ لیتا ہے ۔ ناکامی اس کا منہ چڑاتی ہے لیکن وہ کامیابی کی طرف رواں دواں ہے جب وہ اس جذبہ پر فتح پا لیتا ہے تو اس کے عزم و ارادے کی کہانی اس کی زندگی بن جاتی ہے ۔ اس لئے یہ امثال و اقوال زندگی کی راہوں میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور آج کے انسان کے ارادوں کی داد دیتے ہیں کیونکہ بیسویں صدی کا نوجوان اپنے ہمت و ارادے کی مستقل مزاجی کی وجہ سے کائنات خلا پر فتح پانے کے خواب کو پورا کردیا ہے ۔ اس کا اگلا قدم چاند و مریخ پر ہوگا کیا ایک بزدل سے یہ کام ممکن ہے ؟ نہیں ! یہ کام تو صرف باہمت لوگوں کا ہے کہ عدم کو وجود میں لائیں ۔ اور خلا کو پر کریں ۔

انسانی جذبات میں غصہ ہی ایک ایسا جذبہ ہے جس میں انسان کو نیک و بد کی تمیز نہیں رہتی اور اس سے ایسے افعال سرزد ہوجاتے ہیں جو کہ وہ خود کرنا نہیں چاہتا ہے، اسی لئے غصہ کو حرام کہا گیا ہے۔ جہاں تک ہوسکے انسان کو اپنے آپ پر قابو پانا چاہئیے تاکہ اس سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہو جس کے لئے بعد میں اس کو پشیمان ہونا پڑے غصہ میں اکثر نقصان ہی ہوا کرتا ہے۔ فائدہ کی کم امید رہتی ہے۔ پھر بھی ہر جاندار کے لئے غصہ اس کے بچاؤ کا ہتھیار ہے لیکن یہاں بھی یہی سوال پیدا ہوجاتا ہے کہ غصہ کا حد سے گزر جانا کسی قیمت میں مفید نہیں۔ ذیل میں چند امثال دئیے جاتے ہیں جو غصہ کی منفی حیثیت کو پیش کرتے ہیں۔

غصہ

۱ مدہ ماچھی جب غصہ میں جھلائی ہوئی اس رس کی لالچ میں جو اس کے چھتہ کے اندر ہوتا ہے منڈلاتی پھرتی ہے اور ہاتھی کو ڈستی ہے تو ہاتھی گوکہ بہت طاقتور ہے غصہ نہیں کرتا۔ جو زور آور ہوتا ہے وہ جب ہی جھنجھلاتا ہے جب اس کے مقابل والا زور میں اس کے برابر ہو۔ [پنچ تنتر]

۲ کمزور کا غصہ اس کی بد بختی کا باعث ہوتا ہے۔ جو پتیلی آگ میں حد سے زیادہ دہک جاتی ہے اس کے اپنے ہی کنارے اکثر جل جایا کرتے ہیں۔ [پنچ تنتر]

۳ جو شخص آزار رسانی نہ کرسکتا ہو وہ اس دنیا میں کیوں ایسی بیہودہ حرکت کا مرتکب ہوتا ہے جیسے غصہ کرنا۔ مٹر کے دانے کو جب تلتے ہیں تو وہ ناحق اچھلتا ہے، اس سے کڑاہی نہیں ٹوٹ سکتی۔ [پنچ تنتر]

۴ جب کوئی ڈھیٹھ کتا پہاڑ پر بھونکتا ہے تو کس کا کچھ بگڑ جاتا ہے پہاڑ کا یا کتے کا (؟)۔ [پنچ تنتر]

لیکن غصہ کی آگ کے شعلے جب بھڑک جاتے ہیں تو ان کو بجھانا مشکل ہوجاتا ہے اس لئے اپنے آپ سے انصاف کرنے کا تقاضہ یہ ہے کہ جہاں تک ہوسکے اس آگ کو مشتعل ہونے سے بچایا جائے کیونکہ غصہ دو دھاری تلوار کا کام کرتا ہے اس کی زد میں وقت واحد میں دونوں فریق آجاتے ہیں۔ اسی لئے دانشمندوں نے

اس کے جواز کا فتویٰ نہیں دیا۔ مگر غصہ سے بالکل محروم ہوجانا بھی بزدلی کی نشانی ہے۔ ہر خوددار و غیور طبیعت یہ کبھی گوارا نہیں کرتی کہ اس کی حق تلفی ہو یا اس کی ہتک و ذلت ہو اور اس کی خودداری کو ٹھیس نہ لگے یہ ایک ناممکن العمل بات ہے اس لئے انسانی فطرت کو غصہ سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔ پھر بھی اس کے حدود غیر متوازن نہ ہوں ورنہ نتیجہ غیر مفید رہیگا۔ غصہ افراد و اقوام دونوں کے لئے زہر ہے گو زہر کبھی کبھی تریاق کا کام بھی کرجاتا ہے۔

رقیب مد مقابل ہوتا ہے، یہاں دونوں فریق کے جذبات میں ٹکراؤ ہونا ضروری ہے۔ جس کے نتیجہ میں برتن بھی کھنکھنا اٹھتے ہیں اور پھر انسان انسان کے مقابل کھڑا ہوجاتا ہے۔ رقیب سے مقابلہ کی صورت میں جذبات کا مشتعل ہوجانا فطری ہے۔ بڑی بڑی ہستیاں اس مقابلہ میں سوکھی ٹہنی کی طرح ٹوٹ کر گرجاتی ہیں۔ اردو شاعری رقیب کے گلے شکوہ سے بھری پڑی ہے۔ مقابل کمزور ہو یا طاقت ور، بھلا ہو یا برا، حسین ہو یا بد صورت، تعلیم یافتہ ہو یا جاہل، مستعد ہو یا نکما، ہر صورت میں قابل برداشت نہیں ہوسکتا وہ جو مقولہ ہے «اپنی آنکھ کا شہتیر اور دوسروں کی آنکھ کا تنکا» والی بات یہاں صادق آتی ہے۔ ہر چھوٹی بات بڑی بن جاتی ہے اور کبھی بڑی بات بھی چھوٹی بن جاتی ہے۔ انسانی فطرت کے آبگینہ کو رقابت کی ٹھیس کچھ ایسی درد انگیز ہوتی ہے کہ آبگینہ کے آنسو بھ جاتے ہیں۔ یہ جذبہ انسانی جذبات کے نازک ترین گوشہ سے تعلق رکھتا ہے۔ رقابت میں انسان حد درجہ حساس بن جاتا ہے اس کی مثال اس شمع کی مانند ہے جو اپنی ہی تپش میں آپ گھل جاتی ہے اور بھڑک بھی نہ سکے۔ ان احساسات کی تشریح ذیل کے اس ایک مقولہ ہی سے کی جاسکتی ہے۔

رقابت

۱ عالم جاہل کو کراہت سے دیکھتا ہے۔ امیر غریب کو، پرہیزگار بے دین کو، پارسا عورت فاسقہ کو۔ [پنچ تنتر]

رقیب کی تائید میں چند شعر درج ذیل ہیں۔

۱ تجھے وہ شاخ سے توڑیں زہے نصیب تیرے
تڑپتے رہ گئے گلزار میں رقیب تیرے [اقبال]

۲ رات کے وقت مے پئے ساتھ رقیب کو لئے
آے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں [غالب]

۳ سرمہ رقیب جب سے بنا ان کی آنکھ کا
آنسو کی طرح گر پڑے ان کی نظر سے ہم [نا معلوم]

۴ کبھی ہے مجھ سے کبھی ہے رقیب سے وعدہ
خجل کرے نہ کسی دن تری زبان تجھکو [جلیل]

۵ رقیب تھا وہ مرا رازداں کے دھوکے میں
ہماری جان گئی پاسباں کے دھوکے میں [اختر]

۶ جدا ہوں یار سے ہم اور نہ ہو رقیب جدا
ہے اپنا اپنا مقدر جدا نصیب جدا [ذوق]

۷ ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا [غالب]

۸ جور رقیب آخر و ظلم فلک کا نہیں خیال
تشویش ایک خاطر نامہرباں کی ہے [داغ]

۹ تم بھی اچھے رقیب بھی اچھا
میں برا تھا مری گزر نہ ہوئی [ایاس یگانوی]

۱۰ رونا ہے یہ کہ آپ بھی ہنستے ہیں ورنہ یاں
طعن رقیب دل پہ کچھ ایسا گراں نہ تھا [نا معلوم]

۱۱ باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب
نظارہ و خیال کا ساماں کئے ہوئے [غالب]

۱۲ وہ آئے، وعدہ پہ، آئے مگر رقیب کیساتھ
عجب مذاق کیا مجھ سے غم نصیب کیساتھ [تاباں]

۱۳ روشن کیا جمال سے بزم رقیب کو
اے ماہ، داغ دل کے سوا ہم کو کیا دیا [روشن]

۱۴ فرقت قبول، رشک کا صدمہ نہیں قبول
کیا آئیں ہم، رقیب تری انجمن میں ہے [ناسخ]

۱۵ ذکر سن کر تیرا رقیب سے آج
ہم خفا ہو گئے نصیب سے آج [جعفر شیرازی]

کہا جاتا ہے کہ ہم مذاق اور ہم عمر آدمی ہم پرواز ہوتے ہیں۔ اس لئے دوستوں کا انتخاب ایک نازک مسئلہ ہے، طبیعتوں میں نشیب و فراز ہو تو دوستی باقی نہیں رہتی، یا اگر دولت اور غربت کا ملاپ ہو تو تب بھی دوستی خطرہ میں رہتی ہے دنیا میں دوست سے زیادہ قیمتی چیز کوئی نہیں اور کہا جاتا ہے کہ شیطان کو بھی ساتھی کی ضرورت ہے لیکن لفظ دوست بہت وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے جس کی وجہ سے دوستوں کی کئی قسمیں بن جاتی ہیں۔ دنیا میں اس سے زیادہ خوش قسمت آدمی کوئی نہیں جس کے مخلص اور سچے دوست ہیں، لیکن مخلص، دوست کا ملنا بہت مشکل ہے، وہ دنیا کے تمام خزانوں سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے اور حق دوستی کے ادا کرنے میں چھوٹے بڑے نقصان کی پرواہ نہیں کرتا۔ مخلص، مصلحت اور کاروبار سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتا لیکن وقت پڑے اپنی بے لوثی اور بے نفسی کا پورا پورا ثبوت دیتا ہے اور اس کی یہ بے لوثی اس کے تمام نقصان کی تلافی کر دیتی ہے اس لئے دنیاوی کاروبار میں ایک مخلص دوست بہت بڑی طاقت ہے ایسی بڑی قوت جس کا مقابلہ دنیا کی کوئی قیمتی چیز نہیں کرتی۔ اس لئے دوستوں کا انتخاب بہت سونچ سمجھ کر کرنا چاہئے اور جب ایک مرتبہ کسی ہستی کو چن لیا گیا تو شرافت کا یہ تقاضہ ہے کہ موت ہی اس کو جدا کرے۔

بھارت کے دانشمندوں نے اس باب میں اپنے جن خیالات کو اقوال و امثال کی صورت میں جمع کیا ہے وہ درج ذیل ہیں۔

دوستی اور تعلقات

۱ جس کسی کی طاقت سے، خاندان سے، چال چلن سے، واقفیت نہ ہو اس سے کوئی ربط نہیں پیدا کرنا چاہئے۔ [پنچ تنتر]

۲ جو دو شخص تمول میں برابر ہوں یا نسبت میں برابر ہوں ان میں دوستی ہوسکتی ہے شادی بیاہ ہوسکتا ہے لیکن زبردست اور ناتواں کے درمیان نہیں ہوسکتا۔ [پنچ تنتر]

۳ دوستی اور ہمدردی انہیں میں پائی جاتی ہے جو یا دولت میں یا علمیت میں برابر ہوں نہ ایسوں کے درمیان جن میں سے ایک نے اعلیٰ درجۂ حاصل کرلیا اور دوسرا ادنیٰ درجہ پر رہ گیا ہو۔ [مہا بھارت]

۴ جو احمق ایسا بے وقوف ہوکہ اپنے سے ادنیٰ یا اپنے سے اعلیٰ کو دوست بنائے اوس پر تمام دنیا ہنستی ہے۔ [پنچ تنتر]

۵ اپنے کو آفت سے بچانے کے لئے عاقل کو چاہئے کہ اخلاص مند دوستوں سے دوستی کرے۔ اس دنیا میں جس کسی کے دوست نہ ہوں وہ اپنی کسی مصیبت پر غالب نہیں ہوتا۔ [پنچ تنتر]

۶ شیطان کو بھی ساتھی درکار ہوتا ہے۔ [تامل مثل]

۷ اس دنیا میں کوئی اس شخص سے زیادہ خوش نصیب نہیں ہے جس کا کوئی ایسا دوست ہو جس سے وہ باتیں کرسکے جس کے ساتھ وہ رہ سکے جسکو وہ ہر قسم کا سہارا دے سکے۔ [ہتوپدیش]

۸ ہرن ہرن کا ساتھ ڈھونڈتا ہے، بیل بیل کا، گھوڑا گھوڑے کا، احمق احمق کی صحبت چاہتا ہے۔ عاقل عاقل کی برائیوں اور بھلائیوں کی مشابہت سے سے دوستی پیدا ہوتی ہے۔ [ہتوپدیش]

۹ جو لیاقت کی قدر جانتا ہے وہ لائق آدمی سے خوش ہوتا ہے جو خود اوصاف سے مبرا ہوتا ہے وہ ہنر مند کو پسند نہیں کرتا۔ [ہتوپدیش]

۱۰ بداطواروں کے ساتھ اختلاط ایسی غلطی ہے جس سے نیک آدمی بھی بدل جاتا ہے اسیوجہ سے اشراف آدمی کم ظرف سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ [ہتوپدیش]

۱۱ اپنے سے ادنیٰ کی صحبت سے آدمی کم عقل ہوجاتا ہے۔ ہم پلہ کی صحبت سے اس کے برابر رہتا ہے اپنے سے اعلیٰ کی صحبت انسان کو اعلیٰ درجہ کو پہونچاتی ہے۔ [ہتوپدیش]

۱۲ گھوڑا ، ہتھیار ، کتاب ، بات مرد ، عورت ، ان سب کا بگڑنا یا بننا اس پر منحصر ہے کہ ان کو کیسے آدمی سے سابقہ پڑا ہے ۔ [پنچ تنتر]

۱۳ جو گرم پانی لوہے پر پڑتا ہے اس کا کوئی نام بھی نہیں جانتا. وہی پانی جب کنول کے پتے پر ہوتا ہے تو موتی کی صورت ہوکر جگمگاتا ہے اور جب سواتی ستارہ کے اثر کے نیچے وہ سمندر کی سیپ کے پیٹ میں پڑتا ہے تو موتی بن جاتا ہے ۔ عموماً جس صحبت میں آدمی آیا جایا کرتا ہے ۔ اسی کے حساب سے اس میں اعلیٰ یا اوسط یا ادنیٰ رویّہ کے اوصاف پیدا ہوتے ہیں ۔

روایت ہے کہ جب دو بے لوث دل ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور مستقبل میں ساتھ دینے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہیں تو خدا بھی مسکرا دیتا ہے ۔ اس لئے کہ شائد ان کی تخلیق کا مقصد ہی یہ ہو کہ دو دل شفاف آئنہ کی طرح ایک دوسرے کی شبیہ بن جائیں تاریخ تمدن میں ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں جس سے دوستوں کی بے لوثی ، حق رفاقت ، ہمدردی ، ہمدمی اور خلوص نے ایک عظیم کارنامہ انجام دیا ہے اور دنیا کی تاریخ میں کثرت سے ایسی بھی بے مثالیں ملتی ہیں جو خود غرضی ، دھوکہ اور مردم ناشناسی کا ثبوت بن جاتی ہیں. اس شہادت نے انسانوں کو مجبور کردیا کہ لفظ دوست کی قیمت کو نبھائیں اور جہاں تک ممکن ہو اس لفظ میں جو تقدس اور خلوص کا رشتہ ہے اس کو بدنام نہ ہونے دیں. فی زمانہ اخلاقی قدروں کی تبدیلی نے دوست کی اہمیت کو بہت گھٹا دیا ہے کیونکہ جب سے دنیا میں مشین اور کلوں نے انسانی دل و دماغ پر قبضہ جما لیا ہے تب سے انسان بڑی حد تک بے حس ہوگیا اور اس کا زاویہ نظر ایثار اور قربانی سے ہٹ کر کاروباری بن گیا. آج کی اس بھری پڑی دنیا میں مخلص کا ملنا کارے دارد ہے اور جس کسی کو یہ نعمت عطا ہو اس کی خوش قسمتی پر جتنا فخر کیا جائے کم ہے. کسی نے سچ کہا ہے ع کوئی دکان کا سودا ہے کیا محبت بھی.

بھارت میں سیاسی لحاظ سے جو کچھ تجربات ہمیں ملتے ہیں وہ سب کے سب بادشاہت سے متعلق ہیں. ان میں کہیں جمہوری طرز حکومت کا ذکر نہیں، بادشاہ کو خدا کا سایہ تصور کیا گیا ہے اور اس کے اختیارات وسیع سے وسیع تر ہیں.

اس ایک آدمی کے ہاتھ میں کڑوڑوں مخلوق خــدا کی قسمت بند ہیں اور اس کی ایک عقل و تدبر پر عوام کی بھلائی و برائی کا انحصار ہے۔ شاہی میں مرکزی حیثیت وزیر کو حاصل ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بادشاہ مورکھ اور وزیر عاقل ہوتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جو اختیارات وزیر کو حاصل ہیں وہ بادشاہ کو بھی نہیں یا جو کچھ وزیر چاہتا ہے وہ بادشاہ سے منواکر رہتا ہے۔ سیاست گتھیوں کی ایک زنجیر ہوتی ہے جو صرف مصلحت اور دانشمندی سے سلجھائی جا سکتی ہے، خصوصاً شاہی سیاست بری خطرناک چیز ہے کیونکہ بادشاہ پر مختلف قوتیں اثر انداز ہوتی ہیں جو رعایا کے لئے فائدہ مند بھی ہو سکتی ہیں اور نقصان دہ بھی، اس لئے کہ رعایا کی آواز کا بادشاہ تک پہنچنا بہت مشکل ہے۔ درمیانی کڑیاں جو بادشاہ اور رعایا کے بیچ میں حائل ہیں وہ رعــایا کے مطالبات کو بادشاہ وقت تک پہنچانے میں نفی کا کام کرتی ہیں اسی لئے شاہی حکومت میں انقلابات عجیب اور اتفاقی طور پر رونما ہوتے ہیں۔ پھر بھی بھارت کے قدیم دانشوروں نے بادشــاہ اور وزیروں کے لئے چند ہدایات بطور اقوال ورثے میں چھوڑی ہیں جو درج ذیل ہیں۔

سیاست

۱ فن حکومت کی ابتدا ملائمت سے ہوتی ہے اور انتہا سزائے جسمانی سے۔ [پنچ تنتر]

۲ اگر بادشاہ بلا غفلت کے جو کوئی سزا کے قابل ہو اس کو سزا نہ دے تو طاقتور ناتوان کو ایسا کباب کرے جیسے سیخ پر مچھلیاں ہوتی ہیں۔ [نمو شاستر]

۳ جو کوئی ظلم نہ کرتا ہو اس کو شان و شوکت کی امید فضول ہے آدمی سانپ کا لحاظ کرتا ہے پر گردا کی حرمت نہیں کرتا گو وہ سانپ کا مارنے والا تھا۔ [پنچ تنتر]

۴ جس راجہ کا بید اور گرو اور دیوان اس کی خوشامد کرے وہ بہت جلد اپنی تندرستی اور اپنا دھرم اور اپنا مال و گنج کھو بیٹھتا ہے۔ [ہتو پدیش]

۵ اگر تم اختیار ایسے آدمی کے ہاتھ میں دیدو جس نے تمہاری بہت خدمت کی ہو تو وہ سمجھنے لگتا ہے کہ تم اس سے کبھی ناراض نہ ہوگے۔ ایسا

وزیر اپنی خدمتوں کو ایک جھنڈا بنا لیتا ہے اور راج کے اندر ہر چیز کو درہم برہم کردیتا ہے [ہتو پدیش]

۶ کسی وزیر کو، وہ کوئی بھی ہو، مالدار نہ بنانا چاہئے. دولت آدمی کی طینت کو بدل دیتی ہے. [ہتو پدیش]

۷ وزیروں کو اگر دباؤ تو ان میں سے بادشاہ کا مال بہہ نکلتا ہے اکثر ان میں سے ایسے ہوتے ہیں جیسا پھوڑا، روئے زمیں کے بادشاہوں کو چاہئے کہ اپنے وزرا کو لگاتار ایذا دیتے رہیں. نہانے کی لنگی کو اگر ایک ہی مرتبہ نچوڑیں تو کیا اس میں سے بہت پانی نکلے گا. [ہتو پدیش]

۸ جو شخص ایسے خادم کو قتل نہ کرے جو دولت میں اس کا برابر ہو، طاقت میں اس کا برابر ہو، دانشمند اور دل کا مضبوط ہو اور آدھی سلطنت پر اپنا قبضہ کئے ہوئے ہو وہ خود ہی قتل ہوجاتا ہے. [ہتو پدیش]

۹ راجہ کی ماں اور رانی اور راج کمار اور دیوان اور پروہت اور دربان سے ویسا ہی برتاؤ کرنا چاہئے جیسا راجہ سے. [پنچ تنتر]

۱۰ جو راجہ علم سیاست میں لایق ہو اس کو ویسا کرنا چاہئے جیسے کچھوا کرتا ہے کہ دشمن کے حملہ کا صدمہ برداشت کرنے کو اپنی سنگی سپر کے اندر سما جاتا ہے اور جب وقت آئے تو اس کو ایسا سر اٹھانا چاہئے جیسے مہیب ناگن. [ہتو پدیش]

۱۱ تالیف قلوب، رشوت اور پھوٹ ڈالنا، یہ وہ ذرائع ہیں جن کو دشمن پر فتح مندی حاصل کرنے کے لئے چاہئے کہ بادشاہ علیحدہ علیحدہ یا اکٹھا استعمال کرے مگر اس کو قوت بازو سے مغلوب کرنے کا ارادہ ہرگز نہ کرے. [ہتو پدیش]

۱۲ انسان دشمن پر ہتھیاروں سے ایسی فتح نہیں پاتا ہے جیسی کہ حیلہ سازی سے. جو حیلہ ساز ہوتا ہے وہ اگر پست قد بھی ہو تو خود رستم وقت اس کو مغلوب نہیں کرسکتا. [پنچ تنتر]

۱۳ دشمنوں میں نااتفاقی کا بیج بونے میں وارث تخت و تاج سے بہتر مشیرکار

نہیں مل سکتا. پس اپنے دشمن کے وارث کو بڑہانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھنا چاہئے. [ہتو پدیش]

۱۴ چال چلن کے یہ تین اصول جن کی پیروی لازم ہے. یعنی بھلائی ، اپنی غرض اور عیش و عشرت ان کو جو کوئی جانتا ہو اس کو بہت رحمدل نہیں ہونا چاہئے. حقیقت میں جو کوئی بامروت ہوتا ہے وہ اس چیز کو بھی نہیں بچا سکتا جو اسکے قبضہ میں موجود ہے. [ہتو پدیش]

۱۵ ناتواں دشمن کو اس سے پہلے قتل کرنا چاہئے کہ وہ توانا ہوجائے جب وہ اپنی پوری قوت حـــاصل کرلیتا ہے تو اس کو مغلوب کرنا مشکل ہوجاتا ہے. [پنچ تنتر]

۱۶ دشمن کے ساتھ بہت مضبوط عہد و پیمان ہی نہیں کرنا چاہئے ، پانی کیسا ہی گرم ہو آگ کو بجھا دیتا ہے. [ہتو پدیش]

۱۷ جو دشمن ہتھیار سے مارا جاتا ہے وہ در حقیقت قتل نہیں ہوتا. مگر جو عقل کے زور سے مارا جاتا ہے وہ پوری طرح سے قتل ہوتا ہے. ہتھیار سے آدمی کا جسم ہی قتل ہوتا ہے عقل سے اس کا گھرانہ اس کی دولت اس کی نیک نامی سب کا خون ہو جاتا ہے. [پنچ تنتر]

۱۸ زمین اور دوست اور سونا یہی تین چیزیں ہیں جن کے واسطے لڑائی لڑی جاتی ہے. ان میں سے ایک بھی موجود نہ ہو تو ہرگز نہیں لڑنا چاہئے. [پنچ تنتر]

۱۹ چھوٹی سی فوج چنے ہوئے آدمیوں کی بہتر ہے ایک بڑے سے لشکر سے جس کو جنگ کی تعلیم نہ دیگئی ہو ، نکمے سپاہی دشمن سے مغلوب ہوجاتے ہیں اور بہادروں کی شکست کے باعث ہوتے ہیں. [پنچ تنتر]

۲۰ جب لڑائی شروع ہوجائے تو بادشاہ کو لازم ہے کہ اپنے ان خادموں کو بھی جن کو وہ دوست رکھتا ہے اور جن کی خبر گیری اور پرورش کرتا ہے سوکھی لکڑی کے برابر سمجھے.

لیکن آج بھی دنیا میں شاہی حکومت کے چند ممالک واقع ہیں مگر وہاں

کے بادشاہ شاہ شطرنج سے بڑھ کر نہیں، جس کی صرف پرستش کی جاتی ہے لیکن اسے اختیارات نہیں دئیے جاتے۔ انگلستان کی ملکہ الزبتھ دوم اور جاپان کا شاہ ان کی اچھی اور تازہ مثالیں ہیں، کیونکہ انسان کے بڑھتے ہوئے شعور نے عوام کو بڑی حد تک ذہین بنادیا ہے اور ان میں بھلے برے کی تمیز تعلیم و تجربے نے پیدا کردی ہے اس لئے فی زمانہ بادشاہ سے زیادہ جمہوریت عام ہے جس کو مختلف صورتوں میں ڈھال کر ممالک اپنے اپنے دور حکومت میں تجربے کر رہے ہیں پھر بھی دنیا میں جو کچھ ہورہا ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ جمہوری حکومت بھی اپنے اندر بہت سی خامیاں رکھتی ہے اور وقت پڑے کھوکھلی ثابت ہوسکتی ہے اسے پتہ نہیں کہ مستقبل کا نظام حکومت کیا ہو جس میں عوام بھلائی کے ساتھ ساتھ نظم و ضبط بھی موجود رہے۔

ذیل میں چند چیدہ چیدہ امثال و اقوال دئے جاتے ہیں جوزندگی کی راہوں میں سونچ سمجھ کر چلنے میں مدد دیتے ہیں۔ جس زمانے میں اندلس عربوں کے تحت تھا اور عرب اپنی ایک خاص معاشرت و تہذیب یورپ میں پھیلا چکے تھے ان کا علمی سرمایہ بھی بام عروج پر پہنچ چکا تھا۔ یہ مقولے مشرق و مغرب کے اتصال تہذیب پر دلالت کرتے ہیں اور انسان کی طاقت پرواز بڑھانے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ اقوال در حقیقت وہ موتی ہوتے ہیں جو چن چن کر سلیقہ سے پروئے گئے ہیں اور اپنی ایک خاص قیمت پیدا کرچکے ہوں۔ ان میں وقت اور زمانے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہ ہر زمانے کے رہنما ہیں، ہر جنگ کے سپہ سالار ہیں اور ہر مشکل کے خضر ثابت ہوسکتے ہیں۔

متفرق

۱ مکھی کے پر کے نیچے زندہ رہنا قبر کے سونے سے بہتر ہے۔
۲ جو کچھ کرنا ہے جوانی میں کرلے زندگی بس ایک پل کی ہے۔
۳ اپنے رنج کو آج دور کرلے نہیں معلوم کل کیا ہوگا۔
۴ اگر تو لہار کے پاس کھڑا ہوگا تو تیرے کپڑوں کو کالک لگے گی۔
۵ اور اگر عطار کی دکان پر کھڑا ہوگا تو کپڑے معطر ہوجائیں گے۔

۶ عشق وہ چیز ہے جو ایک سوکھی ہوئی لکڑی کے ٹکڑے پر بھی سلگ اٹھتا ہے۔

۷ جو کسی عورت کے حسن پر شادی کرے وہ بے وقوف ہے اور جو زر کے لئے شادی کرے وہ لالچی ہے مگر جو کوئی اس کی عقل و فہم پر شادی کرے وہی اصل شوہر ہے۔

۸ اگر عورت تجھے چاہے تو بند دروازہ کو تیرے لئے کھول دے اور اگر نہ چاہے تو مکڑی کے جالے سے لوہے کی دیوار کھڑی کردے۔

۹ ایک متوسط حالت خاطر جمعی کے ساتھ اس دولت سے بہتر ہے جو رنج کے ساتھ ہو۔

۱۰ جس منہ سے بات ظاہر نہ ہو اس میں بھنگا بھی نہیں جاسکتا۔

۱۱ خوش تدبیری نصف زندگی ہے بلکہ کہتے ہیں کہ پوری زندگی ہی ہے۔

۱۲ تبسم ہی سے تبسم پیدا ہوتا ہے۔

۱۳ جس درخت میں گلاب ہوتا ہے اس میں کانٹے بھی ہوتے ہیں۔

۱۴ مشورہ اس سے کر جو تجھے رلائے اور اس سے نہ کر جو تجھے ہنسائے۔

۱۵ موقع پر کام کرنا ہی کامیابی ہے۔

۱۶ تین صفتیں ہیں جو تیس صفتوں کے برابر ہیں۔ حسن، تقویٰ اور عفت۔

۱۷ دو شخص ہیں جو کبھی زیر نہیں ہوتے وہ شخص جس کو علم ہو اور وہ شخص جس کے پاس مال ہو۔

عربی لٹریچر امثال و حکایات سے بھرا پڑا ہوا ہے۔ بات کرنے کا موثر انداز قدیم زمانے میں وعظ و نصیحت ہی کو سمجھا گیا تھا اس لئے تجربوں کا نچوڑ اقوال کی صورت میں جمع کرنا اور قصص و حکایات کی صورت میں پیش کرنا عربی لٹریچر کا شعار رہا ہے۔ اس لئے مندرجہ بالا اقوال و امثال مختلف ہوتے ہوئے بھی خیالات کی اہمیت کے مد نظر ایک خاص مقام رکھتے ہیں جو ہمارے لئے مشعل راہ ثابت ہوتے ہیں۔

* پروفیسر ان. ال. کے. طالب، ایم. اے.

سرمایۂ کلام غالب

(۶)

مرزا کا شاعرانہ ماحول

یہ بات مسلم ہے کہ انسان قدرت سے جس قسم کا دل و دماغ لے کر دنیا میں آتا ہے اسی کے مطابق بقدر استطاعت وہ اپنے طرز عمل سے زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنے جوہر دکھانے کے قابل ہوتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ان حالات سے بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا جن سے اس کو واسطہ پڑتا ہے۔ کوئی قومی رہنما ہو یا محب وطن، باخلوص کارکن ہو یا خاموش رضا کار، امن پسند سیاست داں ہو یا ہنگامہ آفریں باغی، مصور نادرکار ہو یا جاذب توجہ فنکار، صاحب استعداد مصنف ہو یا بیعدیل نکتہ سنج، مغنی سامع نواز ہو یا شاعر سحر طراز، غرض ایسا کوئی صاحب کمال بمشکل نظر آئےگا جو اپنے گرد و پیش کے حالات کا اثر قبول کرنے سے بےنیاز رہا ہو۔ مرزا کے خیالات پر بھی ایسے حالات کا اثر پڑنا ناگزیر تھا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے کلام کی چند اہم خصوصیات کا ذکر کرنے سے پہلے ان کی افتاد طبع اور شاعرانہ ماحول کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کیا جائے تاکہ ان کی بھر پور شخصیت اور افکار عالیہ کا کچھ اندازہ لگایا جاسکے۔

مرزا اس بحرانی دور کی یادگار تھے جس میں ایک طرف سے پرانی جاگیردارانـــہ شان و عظمت اور مغلیـہ سلطنت کی تہذیب و تمدن کا چراغ گل ہو رہا تھا اور دوسری طرف مغرب کی تجارتی سرمایہ داری کے بڑھتے ہوئے اقتدار کا ایک نیا نظام وجود میں آ رہا تھا۔ ان کا بچپن ایک رئیس زادے کی طرح ناز و

* پروفیسر نند لال کول طالب کشمیری، ایم. اے. ایم. او. ایل. جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹس، کلچر اینڈ لینگویجز سری نگر.

نعمت اور عیش و عشرت میں گزرا اور جوانی کم و بیش خوش حالی میں بسر ہوئی. پھر حالات نے پلٹا کھایا، ان کی تنخواہ اور سرکاری پنشن بند ہوئی اور وہ تنگدستی و عسرت کا شکار ہوئے. اس طرح زندگی کے مختلف ادوار میں ان کو غیر معمولی حالات کا سامنا کرنا پڑا. مغلیہ دور کی معاشرت اور خاندانی پس منظر نے ان میں خود پسندی و انانیت اور آزاد روی و وضعداری کا جذبہ پیدا کردیا تھا. بدلتے ہوئے حالات میں گزشتہ آسودہ حالی اور وجاہت کی حسرت بھری یاد اور غیر متوقع پیش آنے والے واقعات کی تلخئ ماحول نے ان کے جذبات میں ایک تلاطم برپا کردیا، اگرچہ وہ تمام شدائد کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرتے رہے، یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان پر آلام و مکروہات روزگار اثر انداز نہ ہوئے، یہ اور بات ہے کہ چوں کہ وہ فطرتاً رجائیت پسند تھے اور طربیہ جذبات میں ڈوبے رہتے تھے وہ ان سے مغلوب نہ ہوئے. دل شکستگی کی حالت میں بھی عزم تازہ پیدا کرنے کا خیال انھیں ہمیشہ دامن گیر رہا. ان نامساعد حالات نے ان کو ایک ذہنی اور جذباتی کشمکش میں ضرور مبتلا کردیا. اور وہ اپنی قوتِ ادراک سے اس کشمکش کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہے. ذاتی احساسات اور تجربے کی بنا پر جو اشعار انھوں نے کہے ہیں ان میں انھوں نے اپنی رنگا رنگ اور ادبی شخصیت سمودی ہے. پروفیسر آل احمد سرور کا یہ فرمانا بالکل بجا ہے کہ مرزا کے پیشرو شعراء میں سے کسی کے ہاں اتنی رعنائی اور رنگینی نہیں پائی جاتی جتنی کہ ان کے ہاں. ان کے ہاں امید و بیم' عیش و غم، آرزو و شکستِ آرزو، حسرت و مسرت اور شاعرانہ لطافتوں کے پردے میں فکر کا گہرا سرمایہ ملتا ہے. ان کا مطالعہ ہمارے اندر ایک وسعت نظر پیدا کرتا ہے. وہ اپنے خیالات کی ترجمانی میں کبھی کبھی انداز فکر کے پہلو اس طرح بدل دیتے ہیں کہ ایک عام بات بھی انوکھی معلوم ہوتی ہے. نوحۂ غم ہو یا نغمۂ شادی، اس کے بیان کرنے میں اپنی فنکارانہ محاکات کا ثبوت دیتے ہیں. کبھی خوشنوائی سے کام لیتے ہیں تو کبھی تلخ نوائی پر اتر آتے ہیں. عالم خیال میں وارد ہوکر اپنی فکری اور ذہنی صلاحیتوں سے افسردگی میں وارفتگی اور غم میں لذت کی کیفیت پیدا کرتے ہیں. نیرنگئ کائنات کی بوقلموں منظر کشی اور انسانی جذبات کے مد و جزر کا سماں گونا گوں دلفریبی کے رنگ میں دکھاتے ہیں. بعض اوقات تخیل کی پرواز ان کو معنی آفرینی کے شوق میں ایک ایسے

عالم میں پہنچا دیتی ہے جہاں خود ان کے الفاظ اور وسیع المعنی اچھوتی ترکیبیں مطلب کی تہ تک پہنچنے میں مساعدت نہیں کرتیں اور ان کے خیالات پیچیدگیوں میں الجھ کر رہ جاتے ہیں یہاں تک کہ تمام تر قوتِ فکر سے کام لینے کے باوجود ایک تعلیم یافتہ مذاق بھی ان کے مافی الضمیر تک رسائی حاصل کرنے سے قاصر رہتا ہے اور ان کے ذہن اور شعور کا پتہ لگانا دشوار ہوجاتا ہے۔

(۷)

عشقیہ شاعری

جس طرح مرزا نے بحیثیت مجموعی اپنے کلام میں جدت طرازی اور ندرت پسندی سے معنی آفرینی کی ایک نئی دنیا آباد کی ہے اور پابستگی رہ و رسم عام کو نظر انداز کرکے اپنے منفرد اسلوب بیان کی ایک جداگانہ راہ اختیار کی ہے وہ عشقیہ شاعری میں بھی اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہیں۔ ان کا تصور عشق اوروں سے مختلف ہے جو متنوع پہلوؤں پر مشتمل ہے۔ اور جس میں آفاقیت کی شان اور کائناتی رنگ کی بہار جلوہ گر ہے۔ شروع شروع میں ان کے ہاں عشق کا روایتی تصور ضرور ملتا ہے جو بندھے ٹکے خیالات اور فارسی و اردو کی روایتی شاعری کی خصوصیات تک محدود تھا لیکن امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ وہ اس کے پابند نہ رہے۔ انفرادیت پسند جذبے کے تحت انھوں نے ایسے اشعار بھی کہے ہیں جن میں ان کی روح بولتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ان کی دنیائے عشق و عاشقی بہت وسیع ہے، اس میں خیالات کا تنوع بھی ہے، رنگینی و رعنائی کی بہار بھی اور کیف و سرمستی کا لطف بھی۔ جن اشعار میں وہ حسن و عشق کے جذبات و احساسات اور دل پر گزری ہوئی واردات کی مختلف حالتوں کا نقشہ کھینچتے ہیں۔ ان سے ان کے ذہنی میلانات و رجحانات کا پتہ چلتا ہے۔ ان کے ہاں عشق حقیقی کا تصور کمیاب ہے۔ کبھی عالم روحانیت کی سیر کرتے ہیں تو ایک چھچھلتی ہوئی نظر سے، تصوف یا معرفت پر قلم اٹھاتے ہیں تو رسمی طور پر اور خود بقول ان کے محض آرائش شعر کے لئے۔ در حقیقت اس قسم کا بیان ان کی ذہنی عشق یا جنسی تصور عشق کا رد عمل کا نتیجہ ہے۔ ان کے اکثر عشقیہ اشعار میں جسمانی لذت پرستی و تعیش اور عشق کے جنسی و مادی تصور کا رنگ صاف جھلکتا ہے جس سے

نفسیاتی حقیقتوں پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان کا معشوق طوائف کے بھیس میں نظر نہیں آتا ہے لیکن ان کے عشق مجازی کا بیان ایسا ہے کہ اس میں وہ تمام لوازمات پائے جاتے ہیں جن سے اس کے مختلف پہلو ہمارے سامنے آ جاتے ہیں۔ معشوق کا ناز و انداز، عشو و ادا، شرم و حیا، چھیڑ چھاڑ، راز و نیاز، درد ہجر، کیفیت وصل، خواہش بوس و کنار، لذتِ دشنام، عاشق کی سادگیٔ تمنا، جوش جنوں، ذوق صحرانوردی، بےاثریٔ آہ و نا رسائی نالہ وغیرہ سب کچھ ان کے ہاں موجود ہے۔ غرض فطرت انسانی کے اکثر تقاضے جو جذبۂ عشق سے متعلق ہیں اور معاملہ بندی کے محرک ہوتے ہیں وہ اپنی فنکاری سے اس طرح اجاگر کرتے ہیں کہ ان کی مثال اوروں کے ہاں بمشکل ملےگی۔ ان میں حسن پرستی کا شدید احساس ہے، وہ ذوقِ نظارہ میں گم ہوکر ذوقِ جمال کی مجسم تصویر بن جاتے ہیں، خالص جذبۂ عشق اور بوالہوسی میں امتیاز کرتے ہیں، عاشق کو راہِ عشق میں جن دشوار گزار مقامات اور کٹھن منزلوں کو طے کرنا یا جن حالات و واقعات سے دو چار ہونا پڑتا ہے ان کی ترجمانی بوجۂ احسن کرتے ہیں۔ جن ناکامیوں سے مقابلہ کرنے میں عاشق صبر و شکیب، ضبط و تحمل اور عزم و حوصلہ کا ثبوت دیتا ہے ان کے بیان کرنے میں جو رنگا رنگ تصویریں پیش کرتے ہیں وہ انہی کا حصہ ہیں۔ دورِ حیات کی دھوپ چھاؤں میں ان کے تنعم اور افسردگی سے جو مختلف الاثر نقوش ان کے ذہن پر مرتسم ہوئے چوں کہ ان کا ہمرنگ یا ہم آہنگ ہونا ممکن نہ تھا ان کا تصور عشق بھی پلٹے کھاتا رہا اور اس میں یکسانیت قائم نہ رہ سکی۔ اسی وجہ سے بعض لوگ کہتے ہیں کہ ان کے ہاں ایک مربوط تصورِ عشق نہیں ملتا۔ پروفیسر سرور لکھتے ہیں کہ ان کے کلام میں جذباتی سطحیت نہیں۔ عام طور پر یہ درست ہے لیکن اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مرزا کے بعض اشعار میں رکاکت اور سوقیانہ پن بھی پایا جاتا ہے۔

کہتے ہیں کہ ان کے کلام میں سوز و گداز نہیں، یہ بات حقیقت سے بعید ہے۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ اس میں وہ شدت نہیں جو فارسی کے بعض شعراء اور اردو میں خصوصاً میر کے ہاں پائی جاتی ہے۔ اس کے دو سبب ہیں، اول یہ کہ بخلاف دیگر شعراء کے ان کے کلام میں زندگی کا سوز و گداز زیادہ ہے جس میں ان کی بلندیٔ تخیل کے ساتھ ساتھ ان کے بےپناہ جذبۂ خود داری اور غیرت

کو کافی دخل ہے دوسرا یہ کہ اس میں انسانی نفسیات سے وابستہ ان کے تخیل انداز فکر و جذبہ کی دلفریب آمیزش کار فرما ہے.

اب عشقیہ مضامین سے متعلق مرزا کے خیالات اور اسلوب بیان کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے: ان کے نزدیک مجنوں جیسا اور کوئی عاشق کامل پیدا نہیں ہوا. اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ اس کے سوا کوئی اور عاشق مردِ میدان بن کر سامنے نہ آیا. شاید صحرائے عشق حاسد کی طرح تنگ نظر تھا، اس نے کسی اور کا اس صحرا میں قدم بڑھانا گوارا نہ کیا:

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار صحرا مگر بہ تنگیِ چشم حسود تھا

اس کے برخلاف وہ فرہاد کو عاشق کامل نہیں مانتے کیوں کہ وہ مرنے کے لئے بھی رسم و راہ کا پابند رہا، تیشہ سے سر پھوڑا تو کہیں مرا، اس کا جذبۂ عشق کامل ہوتا تو سر پھوڑے بغیر مرگیا ہوتا:

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد سرگشتۂ خمار رسوم و قیود تھا

وہ زندگی کو ایک درد سمجھتے ہیں اور عشق کو اس کی دوا، حالانکہ عشق خود ایک درد بے دوا ہے:

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا درد کی دوا پائی درد بےدوا پایا

وہ آہ میں اثر اور نالہ میں رسائی اس واسطے نہیں پاتے کہ دل دشمن یعنی معشوق کا دوست بنا ہوا ہے اور اس پر کوئی بھروسا نہیں:

دوستدارِ دشمن ہے اعتمادِ دل معلوم آہ بے اثر دیکھی نالہ نا رسا پایا

وہ عشق کو نبرد پیشہ قرار دیتے ہیں جس کے لئے مرد نبرد آزما کی ضرورت ہے، جو مرد میدان عشق نہیں وہ اس کی دھمکی ہی میں مرجاتا ہے:

دھمکی میں مرگیا جو نہ باب نبرد تھا عشق نبرد پیشہ طلب گار مرد تھا

دنیا میں لوگ لفظ وفا کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ اس سے تسلی ہوسکتی ہے، جب وفا کرکے تسلی نہ ہوئی تو لفظ وفا کچھ معنی نہیں، لہذا ان کے خیال میں وفاداریِ عشاق ایک بےمعنی بات ہے:

دہر میں نقش وفا وجہ تسلی نہ ہوا ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

دل افسردہ میں خیال یار کے رہنے کی گنجائش نہ ہو وہ اس کو بھلا نہیں سکتے، اس کا پرتو باقی رہتا ہے:

ہنوز اک پرتو نقش خیال یار باقی ہے
دل افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

عاشقوں کو قتل گاہ میں سامان قتل دیکھ کر بیحد مسرت ہوتی ہے۔ شمشیر کا عریاں ہونا ان کے لئے ہلال عید کا نظارہ ہے:

عشرت قتل گہ اہل تمنا مت پوچھ عید نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

معشوق نے انہیں قتل کیا تو اس کے بعد جفا سے توبہ کی اور پشیمانی کا اظہار کیا، دیکھئے اس خیال کو طنزاً کس طرح ادا کرتے ہیں:

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

عاشق وحشت ہجر میں اپنے گریباں کو پھاڑ ڈالتا ہے اور وصل کی حالت میں شوخیِ معشوق کے ہاتھوں اس کے پرزے اڑائے جاتے ہیں، گریباں عاشق کا یہ چار گرہ کپڑا بھی کس قدر بدنصیب ہے:

ہائے اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

معشوق کا ہاتھ مہندی اور اس کا رخسار غازہ کا منت پذیر ہے، آرائش حسن کو ایسی چیزوں کی احتیاج ہے اور یہ حسن کے استغنا کی رسوائی کا باعث ہیں:

پوچھ مت رسوائی انداز استغنائے حسن دست مرہون حنا رخسار رہن غازہ تھا

وہ کہتے ہیں کہ وصال یار ان کی قسمت میں لکھا ہی نہیں تھا اس لئے اچھا ہوا کہ مرگئے، اور زندہ رہتے تو بھی انتظار ہی کرنا پڑتا، وصل میسر نہ ہوتا:

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

وہ دل کے لئے غم کا ہونا بہرحال لازم سمجھتے ہیں، کہتے ہیں غم عشق نہ ہوتا تو غم روزگار ہوتا:

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے غم عشق اگر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا

شب غم میں ان کو ہزار بار مرنا پڑتا ہے، ایک دفعہ مرنا ہوتا تو برا نہ مانتے:

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شب غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

رقیب کا عشق محض ہوس ہے جو شعلہ خس کی طرح بےثبات ہے، اسے ناموس وفا کا کچھ خیال نہیں:

فروغ شعلۂ خس یک نفس ہے ہوس کو پاس ناموس وفا کیا

عشق کا ذکر ایسا بے اثر نہیں کہ ہر بُن مو سے خون نہ بہ نکلے:

ہر بُن مو سے دم ذکر نہ ٹپکے خوننناب حمزہ کا قصہ ہوا عشق کا چرچا نہ ہوا

محض محبوب کی جھلک دیکھ کر ان کی تسلی نہیں ہوتی، وہ اس سے ہمکلام ہو کر ہی مطمئن ہوسکتے ہیں:

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

محبوب کو ان کے عشق کا اعتبار آگیا تو ان کی تباہی کا باعث ہوا، غیر بھی آہ کرتا ہے تو محبوب ان سے منسوب کرتا ہے اور خفا ہوتا ہے:

اعتبار عشق کی خانہ خرابی دیکھنا غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

وہ معشوق سے کسی نہ کسی قسم کا تعلق رکھنے کے آرزومند ہیں خواہ وہ دشمنی ہی کا کیوں نہ ہو:

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

وہ کسی حالت میں درِ معشوق سے ہٹنے والے نہیں:

موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا

وہ شکایت کرتے ہیں کہ معشوق اربابِ وفا سے اسقدر دشمنی رکھتا ہے کہ لطف و کرم تو درکنار ان پر ستم کرنا بھی اسے ناگوار خاطر ہے:

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ اس قدر دشمن ارباب وفا ہو جانا

ان کا خیال ہے کہ جب تک وہ زندہ رہے حسین محض ان کی خاطر ناز و غمزہ کی کشمکش میں مبتلا تھے، مقام شکر ہے کہ ان کے مرنے کے بعد حسینوں کو اس کشمکش سے رہائی ہوگئی:

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد

مرزا کے نزدیک صرف عاشق ہی مستحق جفا ہے، اگر جفا عام ہو تو عشق کی آبرو باقی نہیں رہتی:

کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا رکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر

معشوق کا یہ دعویٰ کرنا کہ وہ کسی پر فریفتہ نہیں ہوتا غلط ہے، آئنہ میں اپنی صورت دیکھ کر خود عاشق ہوگیا:

آئنہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہگئے صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

غمِ عشق کا داغ عاشق کے لئے بے انتہا خوشی کا باعث ہے :
نشاط داغِ غم عشق کی بہار نہ پوچھ شگفتگی ہے شہیدِ گل خزانی شمع
وہ کہتے ہیں کہ خیال میں رعنائی تھی محبوب کے تصور سے :

تھی وہ اک شخص کے تصور سے اب وہ رعنائی خیال کہاں

وہ عشق کو رونقِ ہستی کا راز سمجھتے ہیں :
رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں
معشوق ان سے بات تو کرتا نہیں لیکن ان کی خبر کا طالب رہا کرتا ہے ، وہ اس کی اس خاص مہربانی کا شکریہ ادا کرنے سے قاصر ہیں :

کس منہ سے شکر کیجئے اس لطفِ خاص کا
پُرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

وہ جادۂ راہِ وفا کو تلوار کی باڑھ قرار دیتے ہیں جو انسان کو فوراً قتل کرڈالتی ہے راہِ وفا ایک دم میں طے ہوجاتی ہے یعنی پہلے ہی قدم پر موت آتی ہے اور لذت آزار کی حسرت دل ہی دل میں رہ جاتی ہے :

حسرتِ لذتِ آزار رہی جاتی ہے جادۂ راہِ وفا جز دمِ شمشیر نہیں

محبوب آئنہ میں اپنے حسن و جمال کا تماشا دیکھنے میں مصروف ہے تو اس کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہیں :

تماشا کر اے محو آئنہ داری تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

وہ مرجانے میں کوئی قباحت نہیں دیکھتے لیکن اس طرح راز معشوق کے فاش ہوجانے کا اندیشہ ہے ، ان کا جان دینا معشوق کی رسوائی کا باعث ہوگا ، اور یہ انہیں گوارا نہیں :

رازِ معشوق نہ رسوا ہو جائے ورنہ مرجانے میں کچھ بھید نہیں

ان کے نزدیک محبوب کا آنکھ چرانا لگاوٹ اور عتاب میں بگڑنا بناؤ سنگار سے کم نہیں :

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

وہ اپنی بے زبانی کی وجہ سے معشوق کو اپنی محبت کا یقین نہیں دلا سکتے ، رقیب کی چکنی چپڑی باتیں کام کرگئیں اور معشوق اس کو اپنا عاشق سمجھنے لگا ،
ہوگئی ہے غیر کی شیریں زبانی کار گر عشق کا اس کو گماں ہم بے زباں پر نہیں

وہ نالہ کرتے ہیں تو اس لئے کہ محبوب اسے ظلم و ستم کے خلاف شکایت سمجھ کر کر غصے ہوجائے اور زیادہ ظلم کرنے پر آمادہ ہو:

نالہ جز حسنِ طلب اے ستم ایجاد نہیں ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں

کہتے ہیں کہ جوشِ اختلاط اور کثرتِ بوس و کنار میں محبوب کے ساتھ ہم آغوش ہونے سے بڑھکر عاشق کے لئے اور کوئی چیز نہیں ہوسکتی:

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں

عشق کی غارت گری نے گھر کو بھی برباد کرڈالا، اب اسے تعمیر کرنے کی حسرت کے سوکچھ باقی نہیں رہا. انھیں اسبات کی شرمندگی ہے کہ اب عشق غارت کیا کریگا:

ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں

محبوب کا حسنِ تابناک قوت نظارہ کو جلاکر رکھدیتا ہے، کوئی اس کو دیکھ ہی نہیں سکتا، کہتے ہیں پھر اسے پردے میں رہنے کی کیا ضرورت ہے:

جب وہ جمالِ دلفریب صورتِ مہر نیم روز
آپ ہی ہو جب نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

معشوق کا غمزہ جان لینے والے خنجر اور اس کا ناز ایک بے پناہ تیر، کسی کو اس کے سامنے نہ آنا چاہئے، اگرچہ وہ خود اس کا عکسِ رخ ہی کیوں نہ ہو.

دشنۂ غمزہ جانستان ناوکِ ناز بے پناہ تیرا ہی عکس رخ سہی سامنے تیرے آئے کیوں

محبوب کو اپنے حسن پر اعتماد ہے یعنی جانتا ہے کہ وہ کون ہوگا جو اس پر فریفتہ نہ ہوگا، پھر رقیب پر حسن ظن بھی ہے کہ وہ بھی ضرور اس کا چاہنے والا ہوگا اس لئے وہ رقیب کو آزماتا نہیں، اسی میں اس کی شرم رہگئی.

حسن اور اس پہ حسن ظن رہگئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں

عاشق باوجود محبوب کی بے رخی اس کی محبت سے باز نہیں آتا، لوگ اسے سمجھا رہے ہیں کہ محبوب خدا پرست نہیں. وہ بے وفا ہے اس کا خیال چھوڑ دو، عاشق اس کی برائی سننے کی تاب نہیں لاسکتا اور بگڑ کر جواب دیتا ہے، چلو وہ خدا

پرست نہیں نہ سہی بیوفا ہے تو اچھا ہی سہی، جس کو دین و دل عزیز ہو وہ اس کی گلی میں نہ جائے، مجھے ایسی نصیحت کی ضرورت نہیں:

ہاں وہ نہیں خــدا پرست جاؤ وہ بیوفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز اسکی گلی میں جائے کیوں

وہ عاشق کا فریاد کرنا شانِ عشق کے خلاف سمجھتے ہیں:

کسیکو دے کے دل کوئی نوا سنج فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی پہلو میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

انھوں نے عشق و وفا کا دعوٰے کیا تو معشوق نے اسے غلط قرار دیا اور کہا کیسی وفا اور کہاں کا عشق؟ اس کے جواب میں کہتے ہیں تم کہتے ہو کیسی وفا اور کہاں کا عشق! اگر مجھ میں عشق و وفا نہیں تو اے سنگدل پھر سر پھوڑنے کے لئے تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں تلاش کیا جائے اور کسی پتھر سے بھی سر پھوڑا جاسکتا ہے:

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

معشوق ان کے جذب دل کی بنا پر کشاکش کی شکایت کرتا ہے تو اس کی وجہ وہ خود معشوق کا کھچ کے رہنا بتاتے ہیں۔

غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے
نہ کھینچو تم گر اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو

وہ اس دن کی تمنا کرتے ہیں کہ دوست سے شوق وصل اور شکایت ہجر کا اظہار کرسکیں۔

مرے دل میں ہے غالب شوق وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے جو اس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

ان کے نزدیک غمگین دلوں کی فریاد بے اثر ہے حسینوں کی اپنے چاہنے والوں کے ساتھ وفا داری کرنا ایک اتفاقیہ امر ہے:

وفائے دلبراں ہے اتفاقی ورنہ اے ہمدم
اثر فریادِ دلہائے حزین کا کس نے دیکھا ہے

وہ چاہتے ہیں کہ کسی صورت میں یار سے چھیڑ کی راہ نکل آئے اگر انہیں وصل نصیب نہ ہو تو اظہار حیرت ہی سے ایسی صورت پیدا ہوجائے:

یار سے چھیڑ چلی جائے اسد گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

محبوب کی طرفداری کرتے ہوئے اس کو بدخو قرار دینے والوں کی تردید اس طرح کرتے ہیں:

ضد کی ہے اور بات مگر خو بری نہیں
بھولے سے اس نے سینکڑوں وعدے وفا کئے

محبوب اس واسطے انداز تغافل اختیار کرتا ہے کہ راز عشق کی پردہ پوشی ہو لیکن وہ اس کے سامنے جاکر ایسے بدحواس ہوجاتے ہیں کہ اس پر رازِ عشق کھل جاتا ہے۔

گرچہ ہے طرزِ تغافل پردہ دارِ راز عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پاجائے ہے

ان کا محبوب ایسا نازک ہے کہ اگر کسی اور کے عشق میں مبتلا ہوکر اس کا رنگ اڑا جاتا ہے تو زیادہ نکھر جاتا ہے:

ہو کے عاشق وہ پری رخ اور نازک بن گیا
رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اڑتا جائے ہے

معشوق ساز و سامانِ قتل سے آراستہ نہ ہو تو اس میں سادگی کی شان پائی جاتی ہے، وہ ایسی سادگی پر جان فدا کرنا چاہتے ہیں، مگر وائے بدقسمتی! معشوق نے پھر خنجر ہاتھ میں لے لیا، سادگی پر مر جانے کی حسرت ان کے دل میں رہ گئی:

سادگی پر اس کی مر جانے کی حسرت دل میں ہے
بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کف قاتل میں ہے

معشوق کی لذت تقریر کا اثر یوں بیان کرتے ہیں:

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

کہتے ہیں کہ لذت فراق سے چھاتی پھٹ جاتی ہے تو زخم جگر کو چھپانے کی تکلیف سے نجات مل جاتی ہے :

شق ہوگیا ہے سینہ خوشا لذت فراق تکلیف پردہ داریٔ زخم جگر گئی

شوخ رفتاری میں معشوق کے نقش پا کا انداز کس قدر دلفریب ہوتا ہے :

دیکھو تو دلفریبی انداز نقش پا موج خرام یار بھی کیا گل کتر گئی

بوالہوس کے حسن پرستی اختیار کرنے پر عاشقان صادق کی آبرو باقی نہیں رہتی :

پر بوالہواس نے حسن پرستی شعار کی اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

ہر نگاہ رخ یار تک پہنچ کر ایسی مست ہوجاتی ہے کہ اس کے تار بکھر بکھر کر نقاب کی صورت اختیار کرتے ہیں، یعنی خود نظارہ مانع دیدار ہوتا ہے :

نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

آسمان کی گردش بھی عاشق کے حق میں سست رفتار ہے :

عشق کی راہ میں ہے چرخ بکوکب کی یہ چال سست رو جیسے کوئی آبلہ پا ہوتا ہے

معشوق کو غم سنانا چاہیں تو بات نہیں بنتی، اس کو باتوں کے پھیر میں الجھا کر بھی مقصد برآری نہیں ہو سکتی، وہ بات کاٹ دیتا ہے :

نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

وہ اس بات کے متمنی ہیں کہ جذب دل معشوق کو آنے پر مجبور کرے :

میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

وہ چاہتے ہیں کہ ان کے ستائے بغیر معشوق کو چین نہ آئے :

کھیل سمجھا ہے کہیں چھوڑ نہ دے بھول نہ جائے
کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے

مرزا موت کا انتظار کرنا ضروری نہیں سمجھتے کیونکہ وہ آئے بغیر نہ رہیگی، وہ معشوق کو چاہتے ہیں، اگر وہ نہ تو آئے اس کا بلانا بھی ممکن نہیں، اس کا بلانا موت کے آنے سے دشوار تر ھے :

موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے نہ بنے
تم کو چاھوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے

عشق اختیــاری شے نہیں، یہ وہ آگ ہے کہ لگائے لگ نہیں سکتی اور بجھائے بن نہیں پڑتی یعنی اگر چاہیں کہ محبوب کے دل میں بھڑکائیں تو یہ ممکن نہیں اور اگر یہ چاہیں کہ اپنی لگی کو بجھادیں تو نہیں بجھا سکتے:

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھـائے نہ بنے

ان کے معشوق کی طرح اور کوئی معشوق تیغ نگاہ کو آب دینا نہیں جانتا:

کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا
تیری طرح کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے

ان کو بوسہ نہ ملے تو نہ سہی وہ اس بات پر بھی راضی ہیں کہ معشوق آخر کچھ جواب تو دے خواہ وہ انکار ہی ہو اور جنبش لب ہی سے ان کا کام تمـام کردے:

دکھا کے جنبشِ لب ہی تمام کر ہم کو
نہ دے جو بوسہ تو منہ سے کہیں جواب تو دے

ان کو معشوق کے پاؤں دبانے میں بے انتہا خوشی حاصل ہوتی ہے کیوں کہ اس طرح ان کے ہاتھوں کو معشوق کے قدموں تک پہنچنے کا فخر حاصل ہوگا:

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جب اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

وہ اس بات پر افسوس ظاہر کرتے ہیں کہ ان کے معشوق کا خنجر تیز ہے جو دم بھر میں فیصلہ کردیگا۔ وہ چاہتے ہیں کہ یہ کند ہوتا تا کہ ان کا گلا رک رک کر کٹتا اور جتنی دیر میں گلا کٹتا اتنی دیر ان کو معشوق کو دیکھنے کا موقع ملتا اور حسرت دیدار پوری ہوجاتی:

مرتے مرتے دیکھنے کی آرزو رہ جائے گی
وائے نا کامی کہ اس کافر کا خنجر تیز ہے

انہیں عشق کی مجبوریوں کا احساس ہے اس لئے اپنے نامہ بر کو جو معشوق کے حسن پر فریفتہ ہوکر ان کا رقیب بن گیا خطـاوار نہیں ٹھہراتے:

دیا ہے دل اگر اس کو بشر ہے کیا کہئے
ہوا رقیب تو ہو نامہ بر ہے کیا کہئے

وہ اس قدر سخت جاں ہیں کہ تیغِ نگاہِ یار کے متواتر واروں سے ان کی زندگی کا خاتمہ نہیں ہوتا گویا تیغ نگاہ کے لئے وہ سنگ فساں بن گئے ہیں جو تلوار کے بار بار رگڑنے سے کٹتا نہیں :

بن گیا تیغِ نگاہِ یار کا سنگ فساں
مرحبا میں کیا مبارک ہے گرانجانی مجھے

وہ امتحانِ عشق میں اپنی آزمائش کو مجنوں و فرہاد سے زیادہ مشکل پاتے ہیں . اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ مجنوں و فرہاد کے لئے لیلیٰ و شیریں کا قد و گیسو فتنہ و بلا ہے لیکن ان کو ایک ایسے ظالم سے پالا پڑا ہے جو عشق قامت کی سزا میں سولی اور سودائے زلف کی سزا میں پھانسی کے پھندے کے تجربے کرتا ہے :

قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

ان کی داستان عشق اس قدر طویل ہے کہ قاصد بھی سن کر گبھرا جاتا ہے پھر معشوق اسے سننا کب گوارا کریگا :

وہ بد خو اور میری داستان عشق طولانی
عبارت مختصر قاصد بھی گھبرا جائے ہے مجھ سے

معشوق انہیں منہ نہیں دکھاتا تو نہ سہی ، کم از کم آنکھ تو دکھائے یعنی خفگی ہی سے ان کی طرف دیکھے :

منہ نہ دکھلاوے نہ دکھلا پر بہ انداز عتاب
کھول کر پردہ ذرا آنکھیں ہی دکھلادے مجھے

وصل میں سبھوں کو خوشی ہوتی ہے مگر کوئی مر نہیں جاتا ، معلوم ہوتا ہے کہ شب ہجر میں انھوں نے مرنے کی تمنا کی تھی وہ شب وصل میں ان کے سامنے آئی یعنی شادی مرگ ہوئے :

خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے
آئی شبِ ہجراں کی تمنا مرے آگے

ان کے نزدیک معشوق کی بے رخی کی شکایت کرنا مناسب نہیں، اس کی خوبیوں کا ذکر کرنا چاہئے آخر وہ معشوق ہے:

نہیں نگار کو الفت نہو نگار تو ہے   روانئ روش و مستئ ادا کہئے

وہ کہتے ہیں کہ عشق میں رونے سے رسوائی ہو تو بے باکی اور بڑھ جاتی ہے:

رونے سے اور عشق میں بے باک ہوگئے
دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہوگئے

عاشق زخم عشق کھا کر ہی التفاتِ معشوق کی توقع رکھ سکتا ہے:

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ تجھ سے راہ سخن وا کرے کوئی

عاشق کی تمام عمر بھی معشوق کے ایفائے وعدہ کے لئے کافی نہیں:

سر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عمر
فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی

حالتِ جنوں میں عاشق سے بیکار نہیں بیٹھا جاتا، کچھ نہیں تو سر پیٹنے ہی کا مشغلہ اختیار کرتا ہے:

بیکارئ جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل
جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی

محبوب آئے یا نہ آئے، وہ وعدہ خلافی ہی کیوں نہ کرے، لیکن مرزا اپنی بات کو نباہنا ضروری سمجھتے ہیں اور برابر اس کا انتظار کرتے ہیں:

بچ آ پڑی ہے وعدۂ دل دار کی مجھے
وہ آئے یا نہ آئے پہ یاں انتظار ہے

عشق مجبوری کا معاملہ ہے، ارادے کے ساتھ پیدا نہیں کیا جاسکتا، گرفتارئ عشق کا دعویٰ کرنا ایسا ہے کہ ہاتھ بھاری پتھر کے نیچے دب جانے کی وجہ سے نکل نہ سکتا ہو اور یہ کہا جائے کہ پتھر سے عہد وفا باندھا ہے اور محبت کو نباہ رہے ہیں:

مجبوری و دعوئ گرفتارئ الفت   دست تہ سنگ آمدہ پیمان وفا ہے

وہ اپنے دم آتشیں کے شرر برسانے والے نالوں سے چراغاں کا نظارہ پیش کرتے ہیں

اور اس تماشا سے محظوظ ہوتے ہیں :

پھر گرم نالہ ہائے شرر بار ہے نفس
مدت ہوئی ہے سیر چراغاں کئے ہوئے

وہ جذبۂ عشق کے تحت خریدار یعنی معشوق کی تلاش کرتے ہیں اور عقل اور دل و جان کو اس کے لئے بیچنے کو تیار ہیں :

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب
عرض متاع عقل و دل و جاں کئے ہوئے

وہ معشوق سے قرب حاصل کرنا چاہتے ہیں ، کہتے ہیں اگر قاتل کی دراز دستی کا امتحان لینے کے لئے انہیں اس سے دور رکھا جاتا ہے تو یہ کوئی وجہ نہیں ، اس کے لئے صرف ایک وہی تو نہیں رہ گئے ہیں ، اس کے لئے اوروں کا بھی انتخاب ہوسکتا ہے :

فلک نہ دور رکھ اس سے مجھے کہ میں ہی نہیں
دراز دستیٔ قاتل کے امتحاں کے لئے

(باقی آئندہ)

* از جناب سعادت نظیر

علی اختر کی شاعری

تکلف برطرف مردہ پرستی بھی انسان کی دوسری خصوصیات کی طرح ایک ایسی خصوصیت ہے جو ہر قوم اور ہر طبقے میں کم و بیش پائی جاتی ہے. شاید ایسے ہی مشاہدات و تجربات کے نتیجے کے طور پر «قدر نعمت بعد از زوال» کا مقولہ وضع کیا گیا ہوگا. بدقسمتی سے یہ خصوصیت اہل مشرق میں زیادہ نظر آتی ہے کہ یہاں کسی شاعر، ادیب یا فنکار کی زندگی میں اس کی مناسب اور ضروری حوصلہ افزائی کی جاتی ہے اور نہ اس کی جگر کاوی کی کما حقہ قدر. وہ نکبت و افلاس کا شکار ہوکر فاقوں کے مارے ادھ موا اپنی کٹیا میں سسکتا پڑا رہتا ہے اور اس بےکسی کے عالم میں کوئی جھوٹے منہ آدھی بات بھی پوچھنے والا نہیں ہوتا. ہاں! جب وہ مرجاتا ہے اور منوں مٹی تلے دب کر مٹی ہوجاتا ہے تو اس کی مرقد پر پھول چڑھتے ہیں، میلے لگتے ہیں، سوگ منایا جاتا ہے، ماتمی مجلسیں منعقد ہوتی ہیں، یادگاریں قائم کی جاتی ہیں، خوشنما قبر اور قبر پر شاندار گنبد بنایا جاتا ہے، اس کی تخلیقات اور شاہکاروں کی چھان بین کی جاتی ہے، ان کو آنکھوں سے لگایا جاتا ہے، ان پر مقالے لکھے جاتے ہیں اور قصہ مختصر یہ کہ وہ سب کچھ کیا جاتا ہے جو انسان کرسکتا ہے اور ان سارے مادی افادوں کے استفادے سے مرحوم فنکار محروم ہی رہتا ہے. اتنی پیش بینی اور «قدر نعمت قبل از زوال» کی صلاحیت ہم میں ہے ہی نہیں اور شاید ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ صاحبان فن کی ناقدردانی سے فن کی ترقی محدود اور فن پامال ہوجاتا ہے مگر علی اختر مرحوم ان چند خوش نصیب ارباب کمال سے ایک ہیں جن کی اور جن کے فن کی قدر خاطر خواہ نہ سہی پھر بھی کچھ نہ کچھ ضرور کی گئی، مرنے سے پہلے بھی اور مرنے کے بعد بھی. چنانچہ ان کی زندگی کے اوسط زمانے میں قیاس غالب ہے کہ ان کا کمال ہی ان کی خوش حالی کا باعث رہا اور

* جناب سعادت نظیر، ایم. اے. حیدرآباد، ۲

۱۹۳۲ع و ۱۹۳۳ع میں جب کہ وہ بقید حیات تھے، حضرت نیاز نے «ماہنامہ نگار» میں مسلسل مضامین لکھ کر یہ ثابت کرنے کوشش کی تھی کہ ان کی شاعرانہ عظمت جوش ملیح آبادی سے کہیں زیادہ ہے اور جب انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہا تو مختلف رسالوں میں متعدد مضامین کے ذریعے ان کی ادبی خدمات کو خراج عقیدت بھی ادا کیا گیا۔

۱۷ اپریل ۱۹۰۸ع کی صبح کو علی اختر نے رام پور جیسے مرکز شعر و ادب میں آنکھ کھولی، تعلیم کی غرض سے آگرہ گئے، پھر اٹاوہ گئے اور ایک مدت تک علی گڑھ میں بھی رہے۔ انھوں نے وہاں کی علمی و ادبی دنیا میں اپنا ایک خاص مقام پیدا کیا، شعری مذاق ورثے میں ملا تھا اس لئے بچپن ہی سے شعر کہنے لگے اور اپنے والد جناب کاظم علی باغ مرحوم تلمیذ داغ دہلوی کی رہنمائی میں اپنے ذوق سلیم کو فروغ دیتے رہے۔

علی گڑھ کی آب و ہوا راس نہ آئی تو صاحب فراش ہوگئے اور نظیر حیدرآبادی کا بیان ہے کہ ان کی اس علالت میں بیماریٔ دل بھی شامل تھی اس کا مداوا یوں کیا گیا کہ ان کی ایک نہیں، تین تین شادیاں یکے بعد دیگرے رچائی گئیں۔

میٹرک کامیاب کرکے اپنے والد کے ہمراہ حیدرآباد آئے، سررشتۂ آبکاری میں ملازمت حاصل کرلی لیکن کثرت عیال و قلت مال کے سبب پریشان رہے، ان کی نظم «فاقے کی ایک شام» جو بہت ہی درد انگیز ہے، اسی درد کی ایک یادگار ہے، اگرچہ ان کا حلقۂ احباب وسیع تھا اور اس میں کئی متمول اور صاحب ثروت بھی تھے مگر ع «مصیبت سے ہے یہ مصیبت زیادہ» اس خود دار فطرت نے کبھی کسی پر اپنی مصیبت ظاہر ہونے نہ دی اور کہہ اٹھے:

خدا شاہد! بھنور میں ڈوب جانا اس سے بہتر ہے
اگر ساحل ملے منت پذیر ناخدا ہوکر

جب محکمۂ تعمیرات میں مددگار معتمدی کے عہدے پر فائز ہوئے تو تنگدستی سے نجات ملی، معاشی مشکلات رفع ہوئیں اور چین سے بسر ہونے لگی۔

پھر بہار آئی، نشاطِ روح کا منظر کھلا
ساز جاگے، جام چھلکے، میکدے کا در کھلا

۱۹۴۸ع کی بات ہے کہ گردش روزگار نے انھیں حیدرآباد سے پاکستان پہنچا دیا جہاں وہ عزلت گزیں ہوگئے اور سکون و سرور کھو بیٹھے:

عشرتِ منزلِ سکوں، اختر! اک غریب الدیار کیا جانے؟

اور دس سال کے بعد ۱۱ جنوری ۱۹۵۸ع کو ابدی نیند سوگئے:

موت آئی خواب شیریں کی طرح ہم نے آنکھیں بند کیں اور سوگئے

وہ زمانہ جب کہ حیدرآباد کی فضا شعر و سخن کے پُرکیف نغموں سے معمور تھی، اور باغ کے مشاعرے بہار پر تھے، ان کی ہر محفل کو جلیل مانک پوری، وحید الدین سلیم، مرزا ہادی رسوا، آزاد انصاری، عبد اللہ عمادی، ظفر علی خاں، جوش ملیح آبادی اور صفی اورنگ آبادی جیسے مشاہیر ادب اپنے دل فروز و روح پرور شعروں سے گرماتے رہے، انہی تاریخی مشاعروں میں علی اختر بھی مدتوں اپنے جوہر دکھاتے رہے اور داد حاصل کرتے رہے:

نغمۂ درد چھیڑ کر انجمن حیات میں عشق نے جان ڈال دی پیکر کائنات میں

علی اختر نے ۱۹۱۳ع سے نظمیں لکھنی شروع کیں، جب ۱۹۱۶ع میں پہلی بار «رسالہ ذخیرہ» کے مئی نمبر میں ان کی نظم «بہار کا آخری پھول» شائع ہوئی تو «ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات» سارے ملک نے یہ جان لیا کہ اختر کا مستقبل کیا ہوگا؟

سلیقہ تھا کسے انجمن میں سوزِ باطن کا؟ حقیقت کردیا میں نے محبت کے فسانے کو

اس کے بعد اردو زبان کا شاید ہی کوئی معیاری رسالہ ایسا ہوگا جس میں ان کی کاوشوں کے کچھ نقوش نہ ہوتے ہوں۔

بے پردہ جو وہ جلوۂ پنہاں نظر آیا اٹھتا ہوا اک حسن کا طوفاں نظر آیا

انھوں نے بہت سی عمدہ عمدہ نظمیں لکھی ہیں، جن میں سے اکثر تاثراتی ہیں۔ ان کے موضوعات میں الجھاؤ نہیں، سیدھا سادہ انداز ہے، کیفیات کی بوقلمونی کے ساتھ ساتھ ایک سنجیدہ ہم آہنگی بھی ملتی ہے جس کی تان سطحیت پر نہیں ٹوٹتی۔ «کفر اور شاعر، شعر جدید، حیات ناتمام، ماضی و حال اور اپنے بچے سے آخری باتیں» ان کی شاہ کار نظمیں تصور کی جاتی ہیں، ان کی طویل نظمیں ان کی طباعی اور پُرگوئی کا بہترین مظہر ہیں جن میں کہیں کہیں ان کا اپنا انفرادی رنگ پھیکا پڑتا ہوا نظر آتا ہے مگر لفظوں کی روانی اور بندش کی چستی میں شاید ہی

کہیں فرق آتا ہو ، طرزِ ادا میں جگہ جگہ ان کا اپنا درد دل نمایاں معلوم ہوتا ہے اور کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اوروں کے پردے میں بےتابانہ اپنا ہی غم بیان کررہے ہیں ، الفاظ و معنی کا تناسب قدرتِ کلام کو ظاہر کرتا ہے اور اکثر اشعار آورد کے الزام سے بری ہوجاتے ہیں ، ان ہی گونا گوں خصوصیات کے اعتبار سے ان کی شاعرانہ شخصیت وقیع ہوجاتی ہے ۔

اس شخص کے سوا جو ان کی زندگی کے اول و آخر سے واقف ہے ، اوروں کے لئے اس کا تجزیہ کرنا مشکل ہے کہ ان کی افتاد طبیعت پر ان کے اپنے ماحول کے نامور افراد میں سے کس کس کا اور کتنا اثر مرتب ہوا؟ جس نے مجموعی طور پر ان کے مزاج کو ایک خاص رنگ دیا اور جو ان کے ہم عصروں سے جدا ہے ۔ شاید انھوں نے کچھ تو اپنے فطری تقاضے اور کچھ اپنے گرد و پیش کے حالات سے متاثر ہوکر اپنے لئے ایک نئی راہ نکالی اور اپنی اسی ڈگر پر سب سے ذرا ہٹ‌کر نشیب و فراز کا لحاظ کئے بغیر منزل مقصود کی طرف تیز گام دکھائی دیتے ہیں ۔

۱۹۳۱ ع میں ان کی نظم « منکرانِ خدا سے خطاب » شائع ہوئی ، اس سے ان کے مذہبی عقاید پر اچھی روشنی پڑتی ہے ۔

جوش ملیح آبادی کی نظم « حرفِ آغاز » کے جواب میں بارہ سو ابیات کی ایک طویل اور معرکۃ الآرا نظم « قولِ فیصل » لکھی جو لکھنؤ سے ۱۹۴۸ ع میں زیور طباعت سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آئی ، اس کے متعلق محترم نیاز رقم طراز ہیں کہ « قولِ فیصل » میں بحث و استدلال کے تمام پہلو سامنے آگئے ہیں ، ایسے دقیق مسائل کو نظم کرنا آسان نہ تھا لیکن اختر اپنی زبردست قوتِ شاعرانہ سے کام لےکر مشکل سے مشکل مقامات کو بھی اس خوبی سے طے کرگئے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے ۔

علی اختر صاحب کا کہنا ہے کہ ان کی زندگی پامالِ گردشِ دوراں ہی رہی ، چنانچہ وہ اپنی نظم « اپنے بچے سے آخری باتیں » میں لکھتے ہیں :

زندگی بھر کشتۂ بےمہریٔ دوراں رہا   میں رہا لیکن رہینِ کاوشِ پنہاں رہا

ان کا ابتدائی اور آخری زمانہ مصیبتوں میں گزرا ، ان کی زندگی ایک مسلسل تڑپ سے عبارت رہی :

کیا زمانے کو یاد رکھیں گے چار دن چین سے بسر نہ ہوئی

اختر مرحوم کے جذبات میں کیف و سرور ، عیش و نشاط اور مستی و رندی کا فقدان ہے . وہ بادۂ شبانہ کی سرشاریوں سے چور تھے اور نہ ان کی نظر حسن و شباب کے جلووں سے معمور ہی تھی بلکہ وہ تھے اور زمانے کی تلخیاں ، اور جب یہی تلخیاں شدید ہوگئیں تو ان میں « دنیاگریزی » کا وہ جذبہ موجزن ہوا جس کا ثبوت ان کی اکثر نظموں اور غزلوں سے ملتا ہے :

عیاں جتنی زمانے کی حقیقت ہوتی جاتی ہے
خود اپنی زندگی سے مجھ کو نفرت ہوتی جاتی ہے

بقول ماہرالقادری ان کی نگاہ میں ہر حقیقت ایک فریب ، دنیا کی ہر لذت ایک سراب اور ہر خیال ایک دھوکا ہے :

جہاں ہے اک افسانۂ دل فریب سبھی کچھ ہے لیکن حقیقت نہیں ہے

علی اختر کی نظم « موج گہر » کے ماحصل کو کہ شاعر کھویا کھویا سا رہتا ہے مگر اس کے کلام میں بیدردئ دل انگڑائیاں لیتی ہے ، بظاہر وہ اپنی خوش بیانی اور شیریں زبانی سے اپنی تخلیق میں جادو جگاتا نظر آتا ہے ، لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا کیونکہ شاعری الہام کے سوا کچھ بھی نہیں ، جب عہد رفتہ کی رنگینیاں فضائے یاد میں پرکشا ہوتی ہیں تو وہ گم کردۂ ہوش و حواس ہوجاتا ہے اور اس کو انسانی ہستی ایک اڑتا ہوا سا سایہ معلوم ہوتی ہے » ان کے جذباتی پس منظر کی عکاسی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا .

اس میں شک نہیں کہ علی اختر نے اپنی وسعت خیال سے ایک پہناور و نظر افروز فضا پیدا کردی ہے اور ندرتِ بیان کی دل فریبیوں سے نئی نئی عنوانی گنجائشوں کی تخلیق میں اپنی جولانئ طبع کے قابلِ قدر جوہر دکھانے کی مقدور بھر کوشش کی ہے ، زندگی اور اس کے متعدد پہلوؤں کو جو صرف حکیمانہ و فلسفیانہ اور خشک و سادہ پیرائے ہی میں اچھے رونما ہوسکتے ہیں ، شعر کے رنگین و دلفریب لباس میں امکانی حد تک موثر طور پر جلوہ گر کیا ہے اور اس خصوص میں وہ اپنے مایہ ناز معاصرین سے کچھ کم نہیں ، تعمقِ فکر و نظر کے تقاضوں سے قطعِ نظر بیان میں رنگینی ، خوش اسلوبی میں جدت اور ادائیگی خیال میں انوکھا پن بھی

بڑی بات ہے اور مسائلی عنوانوں کو داخلی و شخصی رنگ دینا اور ان کو نظر فریب و دل کش انداز میں پیش کرنا قابل ستائش ھے .

اک صبر شکن احساس ملا ، اک درد بھری تقدیر ملی
جو خواب ازل میں دیکھا تھا ، اس خواب کو یہ تعبیر ملی
اک نہ اک دن زندگی سے ہاتھ دھونے ھی تو ہیں
قصر وایواں کیا ہیں ؟ مٹی کے کھلونے ھی تو ہیں

(اپنے بچے سے آخری باتیں)

ہر چند کہ مٹھی میں ہوائیں ہیں اسیر
ھے پیش نظر شمش و قمر کی تسخیر
دنیا کو بنانے کے جنوں میں لیکن
انسان نے بھلا دی ھے خود اپنی تعمیر

طرزِ سخنِ عام نہ آیا ، نہ سہی　میں قابل تسلیم نہ ٹھیرا نہ سہی
ایسے بھی تو ہیں ، عقل ھے بالغ جن کی　لڑکوں نے اگر مجھکو نہ سمجھا ، نہ سہی

علی اختر کی شاعری کے بارے میں پروفیسر کلیم الدین احمد کا خیال ہے کہ وہ کچھ مناسبت رکھتے ہیں ، غور و فکر کی عادت کچھ زیادہ ھے لیکن جذبات نوخیز و خام ہیں ، کلام میں کوئی جدت ، باریکی یا گہرای بھی نہیں ھے .

پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں کہ اقبال کی نادر ترکیبیں ، اصغر کا لطیف تغزل اور ہلکا تصوف اختر کے یہاں پایا جاتا ہے ، خیالات کے اظہار کا سلیقہ حاصل ھے .

پروفیسر مجنوں گورکھپوری کی راے ھے کہ علی اختر کے کلام میں ھمکو ایک نئے انداز کا فلسفیانہ تعمق ملتا ھے لیکن نظموں میں وہ اپنی شخصیت شعری کو زیادہ اچھی طرح ظاہر کرسکتے ہیں ، غزل میں وہ کچھ کمزور پڑ جاتے ہیں .

حضرت نیاز فتح پوری تحریر فرماتے ہیں کہ علی اختر صاحب اس جماعت سے تعلق رکھتے ہیں ، جو غزل کے حدود کو بہت وسیع دیکھنا چاہتے ہیں ، یہاں تک کہ اگر کائنات کے تمام جھگڑے اس سے طے ہوسکتے ہیں تو « بیان حسن و عشق » کے ترک کردینے میں بھی مضائقہ نہیں .

ان کی غزل سے ہم کو کسی جگہ یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ انھوں نے واقعی کبھی کسی سے محبت کی ھے اور اسی لئے جب وہ بر بنائے رسم و رواج معاملات

محبت بیان کرتے ہیں تو ان میں مطلق جان نہیں ہوتی ، ان کا فطری میلان تفلسف کی طرف زیادہ ہے اور ظاہر ہے کہ ایسا شخص بیان حسن و عشق میں کبھی لوچ اور درد مندی پیدا نہیں کر سکتا .

علی اختر نظمیں خوب لکھتے تھے اور ان کے فکر کی بلندی ان میں بہت کامیاب نظر آتی ہے لیکن چونکہ غزل کی زبان اور غزل کے انداز بیان دونوں نظموں سے مختلف ہیں اس لئے تغزل میں کامیاب نہیں ہیں اور مشکل ھی سے کوئی شعر ان کی غزل کا ایسا ھوتا ھے جو ھمارے دل پر دیر پا اثر چھوڑ جاے اور جب ان کے ایسے ھی شعروں پر نظر پڑتی ھے تو ھم ان کی شعریت اور تغزل کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتے :

ڈوبی ہوئی پاتا ہوں نبض دل دیوانہ
ہلکی سی پھر اک جنبش! اے جلوۂ جانانہ

جب میں نے سنا ھے نام ان کا
دل پر اک چوٹ سی لگی ھے

بہت دنوں کی خموشی کے بعد آیا ھے
مری زباں پر ترا نام، دیکھئے کیا ہو ؟

رہ گئے کانپ کے کھلتے ہوے لب
نالہ تا حد شکایت نہ گیا

ستانے سے میرے فرصت تو مل جاے زمانے کو
چلوں ، خود بجلیوں کی نذر کر دوں آشیانے کو

بقدر شوق نہ تھا اہتمام سوز و گداز
خمیر خاک میں بھر دی ہیں بجلیاں میں نے

حریم کعبہ بنا دی وہ سر زمیں میں نے
تیرے خیال میں رکھ دی جہاں جبیں میں نے

چٹک میں غنچے کی وہ صوت جانفزا تو نہیں
سنی ہے پہلے بھی آواز یہ کہیں میں نے

تم نے ہر ذرے میں برپا کردیا طوفان شوق
اک تبسم اس قدر جلووں کی طغیانی کے ساتھ !

علی اختر کے کلام «اسرار» اور «انوار» دونوں مجموعوں کے دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ وہ سنجیدہ اور متوازن شعر کہتے تھے اور افکار عالیہ کو پیش کرنے کے خواہاں تھے، کہیں کہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اقبال کے مقام پر پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں.

اہل ہمت حلقۂ امواج میں رہتے نہیں   رخ بدل دیتے ہیں، طوفانوں کا خود بہتے نہیں
(اپنے بچے سے آخری باتیں)

مختصر یہ کہ علی اختر کی شاعری میں ہیجان ہے نہ طوفان، بولی ٹھولی ہے نہ محاورہ بندی، سوقیانہ پن ہے نہ ابتذال، نعرہ بازی ہے نہ گروہ بندی، ہلکا سا فلسفۂ حیات ہے، متین لب و لہجہ ہے، غزلوں اور رومانی نظموں میں وہی آہنگ وہی، انداز اور وہی آب و رنگ ہے جو ان کی سنجیدہ اور فلسفیانہ نظموں میں ہے.

مقالـــہ نمـا

مرتب:

عبدالحلیم ساحل

معـاونین:

سید مجاہد حسین حسینی

علاؤ الدین جینابڑے

محمد شعیب اعظمی

فہرست عنوانات

۱	مذہبیات	۱
۲	تذکرہ و سیرت نگاری	۴
۳	تاریخ و سیاسیات	۸
۴	ادب، تنقید، لسانیات	۹
۵	تعلیمات	۲۰
۶	متفرقات	۲۱

مذہبیات

۱ ابوالحسن علی ندوی
ہندوستان کی روحانی تسخیر
(الفرقان لکھنؤ ۶۲ مئی ۱۵-۲۵)
چشتی سلسلـــہ کے اکابر و شیوخ کا بیان ہے۔

۲ ابومحفوظ الکریم
مصحف عثمانی کے تاریخی نسخے
(مجلہ علوم اسلامیہ علی گڑھ ۶۱ دسمبر ۱-۲۹)
حضرت عثمان کے جمع کردہ قرآن پاک کا تفصیلی ذکر ہے۔

۳ ادارہ فیض الاسلام
صدیق کا جمال و جلال
(فیض الاسلام راولپنڈی ۶۲ مئی)
دوسری قسط۔ حضرت سیدنا ابوبکر کے خطوط نقل کرکے ان کے ایمان، حسن سیاست اور خدا کی راہ میں ان کی مستقل مزاجی کا ذکر کیا ہے۔

۴ اللہ بخش قریشی
اسلام میں عورت کا مقام
(فیض الاسلام راولپنڈی ۶۲ مئی)
سماجی حیثیت سے عورت کی مختلف حیثیتوں پر بحث کی ہے اور اس ضمن میں اسلام کا نقطۂ نظر واضح کیا ہے۔

۵ امتیاز علی خاں عرشی
طبقات الفقہاء
(مجلہ علوم اسلامیہ علی گڑھ ۶۱ جون ۱۲۹-۱۳۹)
تاج الدین ابونصر کے طبقات الفقہاء الشافعیہ الوسطیٰ کا تنقیدی مطالعہ ہے۔

۶ امین محمد تقی
لامذہبی دور کا علمی تاریخی پس منظر
(برہان دہلی ۶۲ اپریل و مئی)
مذکورہ مضمون کی پانچویں اور چھٹی قسط۔

۷ انیل پرشاد جلیل
کمیائے سعادت حجۃ الاسلام امام غزالی کے ادبی مقام و مرتبہ کا مطالعہ
(معارف اعظم گڑھ ۶۲ مئی)
کیمائے سعادت مصنفہ غزالی پر مختلف حیثیتوں سے بحث کی ہے۔

۸ بشارت علی
مذہب، ثقافت، معاشرت پر

اسلامی تبصرہ
(عارف ، لاہور ۶۲ مئی ۱۹ـ۲۸)

۹ جلال الدین عمری
خدا کی صفات
(زندگی رامپور ۶۲ اپریل و مئی)
دو قسطوں میں صفات الٰہ پر سیر حاصل بحث کی گئی۔

۱۰ جیمس اے مشنر
اسلام اور اہل مغرب
(الفرقان لکھنؤ ۶۲ جون ۴۱ـ۵۰)
ایک انگریزی مضمون کا ترجمہ ہے۔

۱۱ چودھری محمد اسمٰعیل
مسئلہ سود کا اسلامی حل
(ثقافت لاہور ۶۲ مئی ۵۰ـ۵۶)
سود کے مسئلہ کو اسلامی نقطہ نظر سے دیکھنے اور حل کرنے کی کوشش کی ہے۔

۱۲ حسام اللہ شریفی
زوال امت کے اسباب
(عارف لاہور ۶۲ جون ۲۵ـ۳۲)
مذکورہ موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

۱۳ سلطان مبین
رہبانیت کے شاخسانے
(زندگی رام پور ۶۲ جون)
خانہ داری اور رہبانیت کے عنوان سے شائع ہونے والے مقالہ کا تتمہ ہے۔

۱۴ سلطان مبین
خانہ داری اور رہبانیت
(زندگی رامپور ۶۲ اپریل)
ہندو دھرم میں رہبانیت کا نقطۂ آغاز اور اس کے رچاؤ ، نیز اس کے سماجی نتائج سے بحث کی گئی ہے۔ کہیں کہیں اسلامی تعلیمات کی امتیازی شان بیان کی گئی ہے۔

۱۵ سید محمد الحسنی
دنیا اور آخرت
(الفرقان لکھنؤ ۶۲ اپریل ۲۵ـ۳۴)
دنیا و آخرت کے بارے میں اسلامی نظریات پیش کئے ہیں۔

۱۶ شاہ محمد جعفر
مسلم خاندانی قوانین اور اسلام
(ثقافت لاہور ۶۲ اپریل ۱۴ـ۵۵)
عائلی کمیشن کی سفارشات سے متعلق ہے۔

۱۷ صدرالدین اصلاحی
مسلمان اور اسلامی نظام اجتماعی
(زندگی رام پور ۶۲ مئی)
اسلام کے نظام اجتماعی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی ہے۔

۱۸ عبدالحمید صدیق
دین میں سنت رسول کی اہمیت
(ترجمان القرآن ۶۲ جون)
حافظ ابن قیم رح کی تصنیف

اعلام الموقعین کے جزء اول کا ترجمہ کیا ہے۔

۱۹ عبدالحمید صدیقی

نبوت کی ضرورت

(ترجمان القرآن ۶۲ اپریل مئی و جون)

مذکورہ مقالہ کی تیسری، چوتھی اور پانچویں قسط

۲۰ عبدالرشید میاں

مقصد حیات

(ثقافت لاہور ۶۲ مئی ۷-۲۳)

زندگی کے مقصد کو مذہبی نقطۂ نظر سے سمجھایا ہے۔

۲۱ علی ملک غلام

فقہی مسائل میں رواداری اور توسع

(فاران کراچی ۶۲ اپریل)

۲۲ علی ناصر زیدی

ہر تاجر اور دوکاندار کے لئے

(عارف، لاہور ۶۲ جون ۳۳-۳۹)

اسلامی نکتۂ نظر سے تجارتی اصول سمجھائے ہیں۔

۲۳ غوری شبیر احمد خاں

خیام کا تذکرہ تفسیر کبیر میں

(مجلہ علوم اسلامیہ علی گڑھ ۶۰ دسمبر ۱۰۰-۱۱۲)

ثابت کیا ہے کہ تفسیر کبیر میں خیام کا ذکر قدیم ترین نہیں ہے۔

۲۴ غوری شبیر احمد خاں

اسلام میں علم و حکمت کا آغاز

(معارف اعظم گڑھ ۶۲ اپریل و مئی)

دوسری اور تیسری قسط۔

۲۵ فضل الرحمن

کمرشیل انٹرسٹ کی فقہی حیثیت کا تنقیدی جائزہ

(برہان ۶۲ مئی وجون)

مذکورہ مضمون کی چوتھی اور پانچویں قسط۔

۲۶ محمد عمر

ہفت تماشای مرزا قتیل

(برہان دہلی ۶۲ مئی و جون)

پہلی و دوسری قسط ہفت تماشای کا تعارف ہے۔ یہ کتاب ہندوستانی مذاہب کے بارے میں معلومات فراہم کرتی ہے۔ مضمون مذکور میں اس کتاب کے باب اول کا ترجمہ بھی دیا گیا ہے۔

۲۷ محمد عزیر

سیرۃ النبی کی جھلکیاں

(الفرقان لکھنؤ ۶۲ جون ۵۱-۵۴)

۲۸ محمد اویس

قانون نصرت

(الفرقان لکھنؤ ۶۲ جون ۳۲-۳۹)

نصرت کے بارے میں اسلامی نظریات کی وضاحت کی ہے۔

۲۹ محمد فاروق

انسانی جبلتوں کا مطالعہ

(زندگی رام پور ۶۲ جون)

فرائڈ اور مارکس کے نظریات کو پیش کرنے کے بعد، ان کے نقائص

ظاہر کئے ہیں. بحث کے آخر میں بتایا ہے کہ نفس انسانی کا مقصود، بلند حقائق کے اصل سرچشمہ سے وابستگی ہے۔

۳۰ محمد نجات اللہ صدیقی
اسلامی ریاست کی معاشی ذمہ داریاں
(برہان ۶۲ مئی و جون)
مذکورہ مضمون کی پہلی قسط۔

۳۱ ندوی محمد حنیف
قرآن میں رمز و اشارہ کی چند مثالیں
(ثقافت لاہور ۶۲ مئی ۲۴-۳۶)

۳۲ ندوی محمد حنیف
اسلام اور تصوف
(ثقافت لاہور ۶۲ جون ۷-۱۴)
تصوف کی ابتدا اور ارتقائی مدارج کا ذکر ہے۔

۳۳ نعیم صدیقی
مطلق العنان اقتدار کے تحت مذہبی مناصب
(ترجمان القرآن ۶۲ اپریل)
مذکورہ مقالہ کی ۸ ویں قسط۔

۳۴ یوسف سید محمد
جبر و قدر
(ثقافت لاہور ۶۲ جون ۱۵-۱۹)
مسئلہ جبر و قدر کی افادیت اور اہمیت بتائی ہے۔

تذکرہ و سیرت نگاری

۳۵ ابو الحسن علی ندوی
مولانا احمد علی
(الفرقان لکھنؤ ۶۲ اپریل ۱۳-۲۴)
مولانا احمد علی لاہوری کا مفصل تذکرہ ہے۔

۳۶ ابو الحسن علی ندوی
مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی
(فاران کراچی ۶۲ اپریل ۳۵-۴۲)
عبدالرزاق ملیح آبادی اور ان کی عربی دانی پر بحث ہے،

۳۷ ابو الحسن علی ندوی
حضرت خواجہ نظام الدین اولیا
(الفرقان لکھنؤ ۶۲ جون ۲۲-۳۱)
خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کے اخلاق و صفات کا بیان ہے۔

۳۸ ابوذر باقی
ابن سینا
(فروغ اردو لکھنؤ ۶۲ جون ۳۹-۵۰)
شیخ بو علی سینا کے متعلق کچھ غلط فہمیوں کا ازالہ ہے۔

۳۹ ابو محفوظ الکریم معصومی
رسالہ عرام
(مجلہ علوم اسلامیہ علی گڑھ، ۶۲ جون ۷۳-۱۰۱)
مشہور عرب جغرافیہ داں مصنف

عرام بن الاصبغ کا تذکرہ ہے۔

۴۰ اختر رشید
مسلمان مورخین
(ثقافت لاہور ۶۲ اپریل ۳۵-۴۵)
پچھلی تیسری قسطوں سے متعلق ہے۔

۴۱ اختر رشید
مسلمان مورخین
(ثقافت لاہور ۶۲ جون ۳۸-۴۹)
گذشتہ سے پیوستہ۔

۴۲ ارشد کاکوئ
بابائے اردو کی شخصیت کے دو اہم پہلو
(قومی زبان کراچی ۶۲ اپریل ۲۰-۲۵)
مولانا عبدالحق مرحوم کی چاق و چوبند طبیعت، نفاست پسندی، بذلہ سنجی اور بےباکی پر روشنی ڈالی ہے۔

۴۳ اقبال احمد
سفیان بن سعید ثوری
(الفرقان لکھنؤ ۶۲ جون ۵۵-۵۶)
عہد عباسی کے ایک ولئ خدا کا ذکر ہے۔

۴۴ ام. ہانی بیگم
کامی قزوینی
(مجلہ علوم اسلامیہ علی گڑھ ۶۰ جون ۱۱۱-۱۲۲)
میر علاء الدولہ کامی قزوینی کا تذکرہ ہے۔

۴۵ بھٹاچاریہ شانتی رنجن
منشی تارینی چرن متر
(آجکل دہلی ۶۲ مئی ۳۸-۴۰)
فورٹ ولیم میں منشی تارینی چرن متر اور ان کے ہمعصروں کا تذکرہ ہے۔

۴۶ خواجہ راحت حسین
فتنہ تاتار کا خاتمہ، معرکہ عین جالوت
(فاران کراچی ۶۲ جون ۳۲-۳۴)
تاتاری طاقت کا عروج و زوال بتایا ہے۔

۴۷ سید نعیم الدین
نفعی اور جہاں گیر
(مجلہ علوم اسلامیہ علی گڑھ، ۶۰ جون ۴۹-۵۵)
ترکی شاعر نفعی کا ذکر ہے جو اگرچہ ہندوستان کبھی نہیں آیا مگر اس نے ایک ہندوستانی بادشاہ کا قصیدہ کہا،

۴۸ شاہد حسین بخاری
بابائے اردو کے ساتھ چند لمحے
(قومی زبان کراچی ۶۲ اپریل ۲۶-۲۹)

۴۹ شریفی محمد حسام اللہ
اسباب زوال امت
(فاران کراچی ۶۲ مئی ۲۷-۲۸)
زوال امت کے اسباب بتائے گئے ہیں۔

۵۰ شکیل عبدالغفار
مولانا ابو النصر (مولانا ابو الکلام آزاد کے بڑے بھائی)
(آجکل دہلی ۶۲ اپریل ۳-۷)

۵۱ صابر مٹھیالوی
تذکرہ بزرگان اسلام
(عارف، لاہور، ۶۲ اپریل ۱۱-۱۳)
حضرت خواجہ احمد گل صاحب رحمۃاللہ علیہ

۵۲ صابر مٹھیالوی
تذکرہ بزرگان اسلام
(عارف، لاہور، ۶۲ جون ۱۱-۱۷)
بابا سائیں حافو سہروردی رحمۃاللہ علیہ

۵۳ صباح الدین عبدالرحمن
ہندوستان کے سلاطین علما اور مشائخ
(جامعہ دہلی، ۶۲ مئی ۳۹۱-۳۹۹)
ایک طویل معلومات افروز مقالہ کا آخری حصہ ہے۔

۵۴ صباح الدین عبدالرحمن
ہندوستان کے سلاطین علما اور مشائخ (مسلسل)
(جامعہ دہلی، ۶۲ جون ۴۴۳-۴۵۶)

۵۵ ضیاءالحسن فاروقی
شیخ محمد عبدہ
(جامعہ دہلی، ۶۲ جون ۴۵۷-۴۶۴)
مشہور مفکر و سیاست داں کا تذکرہ ہے

۵۶ عابدی پروفیسر رضی
غالب کی ہمہ گیر شخصیت
(نگار لکھنؤ ۶۲ مئی ۴۴-۴۸)
غالب کی فنکارانہ صلاحیت اور عظمت کا ذکر کیا ہے

۵۷ عبدالحکیم خلیفہ ڈاکٹر
رومی اور اقبال
(ثقافت لاہور ۶۲ اپریل ۷-۱۲)
اقبال اور رومی کے مشترک اور مماثل نظریات پیش کئے ہیں

۵۸ فارق ڈاکٹر خورشید احمد
دارالکتب قاہرہ کی ایک قلمی تاریخ
(ثقافت لاہور ۶۲ اپریل ۵۶-۷۱)

۵۹ فتح پوری فرمان
انیسویں صدی کا ایک تعلیمی مصلح
(ثقافت لاہور ۶۲ جون ۲۰-۳۷)
مولانا سید ظہورالاسلام کی زندگی اور تعلیمی خدمات سے متعلق ہے

۶۰ فتح پوری فرمان
قدیم اردو ڈرامہ کے ایک اہم فنکار
(نگار لکھنؤ ۶۲ مئی ۹-۱۵)
صنف ڈرامہ میں سید عبداللہ فتح پوری کی خدمات کا تذکرہ ہے

۶۱ قاضی محمد عدیل عباسی
حضرت مولانا احمد علی
(الفرقان لکھنؤ ۶۲ مئی ۵۰-۵۶)
مرحوم مولانا احمد علی لاہوری کے بارے میں ذاتی تاثرات کا اظہار ہے

۶۲ قریشی ڈاکٹر اکبر حسین
اقبال اور صوفیائے کبار
(فاران کراچی ۶۲ اپریل ۲۲-۲۶)

صوفیا سے اقبال کی عقیدت بتائی ہے

۶۳ محمد شمعون اسرائیلی

اہلی خراسانی

(مجلہ علوم اسلامیہ علی گڑھ. ۶۰ دسمبر ۶۹-۸۰)

مولانا اہلی ترشیزی خراسانی کا ذکر ہے

۶۴ محمد عبدالجلیل

مولانا عبدالماجد دریابادی

(فروغ اردو لکھنؤ ۶۲ جون ۱۵-۲۱)

مولانا عبدالماجد کی حیات پر مجمل تبصرہ ہے

۶۵ محمد مسعود احمد

شیخ احمد سرہندی (مسلسل)

(الفرقان لکھنؤ ۶۲ اپریل ۳۵-۴۸)

حضرت مجدد الف ثانی کی وفات اور اس کے بعد کا تذکرہ ہے

۶۶ محمد مسعود احمد

الجواہر الخمسہ

(برہان دہلی ۶۲ اپریل)

الجواہر الخمسہ (مصنفۂ شیخ محمد غوث گوالیاری) کے بارے میں تحقیق کی ہے کہ اصل کتاب فارسی میں تھی بعد میں شیخ صبغۃ اللہ البروجی نے اسے عربی کا جامہ پہنایا ہے. شروع میں شیخ محمد غوث گوالیاری کے مختصر حالات پر روشنی بھی ڈالی گئی ہے

۶۷ محمد منظور نعمانی

مولانا عبدالشکور فاروقی

(الفرقان لکھنؤ ۶۲ مئی ۴۰-۴۹)

مولانا مرحوم سے متعلق ذاتی تاثرات کا بیان ہے

۶۸ مختارالدین احمد

محمود بن علی الاستادار

(مجلہ علوم اسلامیہ علی گڑھ. ۶۰ جون ۱۲۳-۱۴۶)

آٹھویں صدی ہجری کے جمال الدین محمود بن علی بن اصغر عینہ السودونی استادار الظاہری عمائد مصر کا ذکر ہے

۶۹ مسعود محمد الیاس

اقبال کی گھریلو زندگی

(نگار لکھنؤ ۶۲ جون ۳۲-۳۴)

اقبال کی زندگی ایک خادم کی زبان سے بیان کی گئی ہے

۷۰ مومن محی الدین

ملک جوینی

(مجلہ علوم اسلامیہ علی گڑھ ۶۱ جون ۱۴۰-۱۶۴)

علاءالدین عطا ملک جوینی کا ذکر ہے

۷۱ ندوی محمد حنیف

مشہور متصوفین

(ثقافت لاہور ۶۲ مئی ۵۷-۶۹)

چند مشہور صوفیائے کرام کا تذکرہ ہے.

۷۲ نذیر احمد

میر جمال الدین حسین انجوی شیرازی

(مجلہ علوم اسلامیہ علی گڑھ. ۶۰ جون ۱۷-۴۸)

فرہنگ جہانگیری کے مولف کا تفصیلی تذکرہ ہے.

۷۳　نسیم احمد فریدی
تجلیات مجدد الف ثانی
(الفرقان لکھنؤ ۶۲ اپریل ۴۹-۵۶)
شیخ سرہندی کے چند مکاتیب کا اردو ترجمہ ہے۔

۷۴　نسیم احمد فریدی
تجلیات مجدد الف ثانی
(الفرقان لکھنؤ ۶۲ جون ۱۳-۲۱)
حضرت سرہندی کے مکاتیب کا اردو ترجمہ پیش کیا ہے۔

تاریخ و سیاسیات

۷۵　احمد آتش
ترکی کا ایک غیر معروف کتبخانہ
(مجلہ اسلامیہ علی گڑھ ۶۰ جون ۱۴۷-۱۶۲)
ترکی کے قسطمونی (اناطولیہ) کے کتب خانہ عمومی کا تعارف ہے۔

۷۶　اشرف حسینی
مامون الرشید
خاندانِ بنی عباس کا جلیل القدر فرمانروا
(عارف لاہور ۶۲ اپریل ۳۳-۳۶)
مامون الرشید کے مختصر حالات

۷۷　انوار احمد سوپاروی
مہاراشٹر کا قدیم تاریخی پس منظر
(صبح امید بمبئی ۶۲ مئی ۱۱-۱۳)
مختصراً تاریخ مہاراشٹر پر روشنی ڈالی ہے۔

۷۸　ایوب خاں
ایک عوامی آئین
(جام نو کراچی ۶۲ آئین نمبر ۱۱-۱۹)
پاکستان کے نئے آئین پر ایک نشریہ ہے۔

۷۹　رزاقی شاہد حسین
انڈونیشیا کا عہد قدیم
(ثقافت لاہور ۶۲ مئی ۳۷-۴۴)
عہد قدیم میں مختلف مذاہب اور قوموں کے اثرات بتائے ہیں۔

۸۰　رشید الدین
حیدر آباد (ایک قدیم اور عظیم شہر)
(آجکل دہلی ۶۲ مئی ۱۷-۲۲)
حیدر آباد کی ادبی، تاریخ اور تہذیبی اہمیت بتائی ہے۔

۸۱　صباح الدین عبدالرحمن
ہندوستان کے سلاطین علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر
(معارف اعظم گڈھ ۶۲ اپریل، مئی، جون)
مذکورہ مضمون کی تین قسطیں

۸۲　صباح الدین عبدالرحمان۔
عہد مغلیہ کے شاہی خزانے کے جواہرات

(نگار لکھنؤ جون ٦٢ ص ١٨-٦١)
شاہی خزانوں کے جواہرات کی
تاریخ مفصل بیان کی ہے۔

۸۳ عباس طالب
دو نئے بت ـــ قوم اور کلچر
(صبح نو، پٹنہ ٦٢ جون ٧-٨)
تاریخ و سیاست کے حوالوں سے
قومیت اور کلچر کی مذمت کی ہے۔

۸۴ غلام حسین
تاریخ اورینٹل کالج
(اورینٹل کالج میگزین لاہور، ٦٢ فروری ١-١١٧)

۸۵ غلام حسین
تاریخ اورینٹل کالج حصہ دوم
(اورینٹل کالج میگزین لاہور ٦٢ مئی ١١٩-١٩٢)
اورینٹل کالج کے نامور اساتذہ کا
تذکرہ ہے۔

۸۶ غوری شبیر احمد خاں
تتمہ صوان الحکمۃ کا سال تصنیف
(فروغ اردو لکھنؤ ٦٢ اپریل ٢٤-٤٧)
تاریخی حوالہ جات سے ثابت کیا
ہے کہ تتمہ چہار مقالہ قروینی سے بھی
پہلے کی کتاب ہے۔

۸۷ قاضی اطہر مبارک پوری
نارجیل سے نخیل تک
(معارف اعظم گڑھ ٦٢ اپریل مئی جون)
مضمون مذکور کی دوسری، تیسری
اور چوتھی قسط

۸۸ محمد مجیب
مغربی دنیا پر ایک نظر
(جامعہ دہلی ـــ ٦٢ اپریل ٢٣١-٢٣٧)
یوروپین لوگوں کے مذہبی سماجی
نظریات پر روشنی ڈالی ہے۔

۸۹ مقبول احمد
مسعودی کی عجائب الدنیا
(مجلہ اسلامیہ علی گڑھ ٦٠ جون ص ١٠٢-١١٠)
عجائب الدنیا کے نسخۂ علی گڑھ
کا بیان ہے۔

ادب تنقید لسانیات

۹۰ آصف جاوید
بابائے اردو کی ایک تقریر
(قومی زبان کراچی ٦٢ اپریل ١٦-١٩)
مولانا عبدالحق مرحوم کی ایک
تقریر پیش کی ہے جو انھوں نے مارچ ۱۹۵۸
میں اسلامیہ کالج میں کی تھی۔

۹۱ آفتاب اختر
فردوسی کا عہد اور اس کی ادبی
خصوصیات
(برہان دہلی ٦٢ مئی)
محمود غزنوی کی علم پروری اور اس
کے درباری شعراء نیز ان کے ادبی
رجحانات کا مختصر جائزہ لیا ہے۔

۹۲ ابوعلی
مولانا آزاد کی یاد
(ادیب علی گڑھ ٦٢ جون ٤-١٥)

اپنی ذاتی ڈائری سے مولانا آزاد مرحوم کے متعلق بہت ہی معلومات افروز باتیں پیش کی ہیں

۹۳ احتشام احمد ندوی

فن موازنہ

(ادیب علی گڑھ ۶۲ اپریل ۳۸-۴۲)

فن موازنہ پر مسلسل تبصرہ کرتے ہوئے اس فن کے عناصر ادبی روایات شعر کے محرکات کی اہمیت بتائی ہے۔

۹۴ احتشام احمد ندوی

فن موازنہ

(ادیب علی گڑھ ۶۲ مئی جون ۳۸-۴۰)

آٹھویں قسط میں جودت شعر سے بحث کی ہے۔

۹۵ احمد اسحاق نعمانی

عبدالحق کی نثر

(ادیب ۶۲ مئی جون ۳۴-۳۷)

بابائے اردو کی نثر نگاری کی خصوصیات کا تاریخی، فنی اور نفسیاتی جائزہ ہے۔

۹۶ اسرار احمد سہاروی

علامہ اقبال مرحوم کے بعض تصورات

(تعمیر انسانیت لاہور ۶۲ مئی جون ۲۹-۳۲)

اقبال کے بعض تصورات مثلاً نیروان جنت اور ابلیس وغیرہ پر تنقید کی ہے

۹۷ اسلوب احمد انصاری

المیہ کیا ہے

(جامعہ دہلی ۶۲ اپریل ۳۳۹-۳۴۹)

ڈرامہ میں المیہ کی اہمیت اور اس کی ماہیت پر بحث کی ہے۔

۹۸ اکبر نقوی

واہی کی ظرافت نگاری

(شاعر بمبئی ۶۲ اپریل مئی ۲۵-۳۰)

وفا نقوی واہی کی ظرافت نگاری ہمارے آزاد جمہوری نظام، بعض فکری مسائل اور انسان کی کمزوریوں پر کڑی تنقید ہے۔

۹۹ الطاف الٰہی انصاری

اکبر الہ آبادی بحیثیت اسلامی شاعر

(ادیب علی گڑھ ۶۲ اپریل ۴۳-۴۶)

۱۰۰ امیر حسن عابدی

کامی شیرازی

(مجلہ علوم اسلامیہ علی گڑھ ۶۰ جون ۵۶-۴۷)

مثنوی فتح نامہ نور جہاں بیگم کے مصنف کا ذکر ہے

۱۰۱ امین چند شرما

اکبر۔ ایک مطالعہ

(نوائے ادب، بمبئی، ۶۲ اپریل ۵۷-۶۹)

۱۰۲ انیس سلطانہ

جگر اور تصور حسن و عشق

(فروغ اردو لکھنؤ ۶۲ جون ۳۱-۳۷)

۱۰۳ بابائے اردو

مقدمہ مسافر حجاز

(قومی زبان، کراچی ۶۲ مئی ۱۶-۱۸)

مولوی عبدالحق مرحوم کا ایک غیر

شائع شدہ مقدمہ پیش کیا ہے

۱۰۴ بریلوی عبادت

فراق کی غزل

(ماہ نو، کراچی ۶۲ اپریل ۲۹-۳۳)

فراق کی غزل کے جمالیاتی فن
پر بحث کی ہے

۱۰۵ بشیر محمود

ادب ۔ تنقید حیات

(ساقی کراچی ۶۲ اپریل)

ادب، زندگی اور تنقید کے بارے
میں مختلف زاویہ ہائے نظر پیش کئے ہیں ۔
اور ثابت کیا ہے کہ ایک ادیب در حقیقت
ادب کے پردے میں انسانی زندگی کا
نقاد ہوتا ہے

۱۰۶ بہزاد فاطمی

ذکر بیتاب

(صبح نو پٹنہ، ۶۲ جون ۱۳-۱۶)

شاد عظیم آبادی کے ایک شاگرد بیتاب
کے مختصر حالات زندگی کے ساتھ ان کے
دور کی ادبی مجلسوں کا ذکر کیا ہے

۱۰۷ بیدار عابد رضا

حسرت

(برہان دہلی ۶۲ اپریل، مئی)

اردوئے معلی مرتبہ حسرت کے مضامین
کی تفصیلات قسط ۱۰ اور ۱۱

۱۰۸ بیدار عابد رضا

ایک جوئے کہستان کی موج رواں

تیسری قسط

(ماہ نو کراچی اپریل ۱۵، ۲۱)

اقبال کے چند اور گہر پارے

۱۰۹ بیگم مصباح الدین

دکھنی ادب کو اجاگر کرنے والی
ہستیاں

(قومی زبان کراچی ۶۲ اپریل ۵۲-۵۳)

دکھنی ادب پر تحقیق کرنے والوں
کے نام گنائے ہیں

۱۱۰ پرشارتھی شاکر

پنجابی کے صوفی شعراء

(آجکل دہلی ۶۲ اپریل ۲۷-۳۴)

پنجابی شاعری اور ادب سے متعلق ہے

۱۱۱ تلوک چند محروم

میری ادبی زندگی اور شاعری

(فروغ اردو لکھنؤ ۶۲ جون ۷-۱۳)

شاعر نے خود اپنی حیات و افکار کا
جائزہ لیا ہے

۱۱۲ ٹونکی جوہر

اردو کی نایاب مثنویاں

(نگار لکھنؤ ۶۲ جون ۹-۱۷)

اردو کی نایاب مثنویوں کا تفصیلی
تذکرہ ہے

۱۱۳ جاوید نہال

محتشم کاشانی

(صبح نو پٹنہ ۶۲ جون ۹-۱۲)

محتشم کاشانی کے مختصر حالات لکھتے
ہوئے اس کے کلام کا سرسری تنقیدی
جائزہ لیا ہے

۱۱۴　جاوید نہال
نساخ کا ایک صاحب دیوان شاگرد
(شاعر بمبئی ۶۲ اپریل، مئی ۱۱-۱۴)
نساخ کے ایک غیر معروف شاگرد پروفیسر قاضی عبدالحمید صاحب حمید کا تعارف کرایا ہے

۱۱۵　جاوید نہال
ہمایوں کی شاعری
(جام نو کراچی ۶۲ مئی ۱۱-۲۲)
مغل تاجدار شہنشاہ ہمایوں کی فارسی کا جائزہ ہے

۱۱۶　چاند پوری کوثر
سہرا
(آجکل دہلی ۶۲ اپریل ۱۰-۱۴)
سہرے کی ادبی، تہذیبی اور تاریخی اہمیت بتائی ہے

۱۱۷　چودھری سبحان علی
تذکرہ بزرگان اسلام
(عارف لاہور ۶۲ مئی ۱۳-۱۴)
حضرت شاہ رکن عالم رحمۃ اللہ علیہ

۱۱۸　حسین اعجاز
غالب کا تنقیدی شعور
(آجکل دہلی ۶۲ جون ۳-۹)
غالب کے تنقیدی شعور کی مثالیں دے کر ثابت کیا ہے

۱۱۹　خالدی محمد یونس
آثار تیموری
(آجکل دہلی ۶۲ جون ۲۷،۳۲)
اردو زبان کی نشو و نما میں تیموریوں کی خدمات اور سرپرستی کا تذکرہ ہے۔

۱۲۰　خان سید احمد
تہذیب کیا ہے
(ثقافت لاہور ۶۲ اپریل ۴۶-۵۰)
تہذیب کی بنیادی حیثیت واضح کی گئی ہے۔

۱۲۱　خواجہ حسن نظامی
لاہور میں یوم اقبال
(تعمیر انسانیت لاہور ۶۲ اپریل ۱۸-۱۹)
خواجہ حسن نظامی اور اقبال کے باہمی تعلقات بیان کئے ہیں۔

۱۲۲　خورشید احمد شفقت اعظمی
فانی کی یاسیاتی شاعری
(فروغ اردو لکھنؤ ۶۲ اپریل ۴۲-۵۲)
ثابت کیا ہے کہ فانی کی غزلوں کو مرثیہ کا مترادف سمجھنا چاہئے۔

۱۲۳　دانش بریلوی
ادب و تنقید
(ادیب علی گڑھ ۶۲ ۵ ۳۵-۳۷)
ادب و تنقید کے باہمی رشتہ کو واضح کیا ہے۔

۱۲۴　رانا بھگوانداس
پانچ نامور ہندو شعرا
(صبح امید بمبئی ۶۲ مئی ۱۹-۲۱)
دو صدی قبل مہاراشٹر کے پانچ نامور ہندو شعرا یعنی شاداں، شاد، رنگیں، داغ، دزہ وغیرہ کا تذکرہ۔

۱۲۵ رئیس اجمیری
مخمور سعیدی
(صبح نو پٹنہ ۶۲ مئی ۲۱-۲۴)
راجستھان کے ایک مقبول عام شاعر کا تعارف کرایا ہے۔

۱۲۶ ساقی الحسینی
غالب کا ذہنی ارتقاء
(جام نو کراچی ۶۲ جون ۲۰-۲۶)
غالب کے کلام کو ان کے ذہنی ارتقاء کے ساتھ مطالعہ کا موضوع بنایا گیا ہے۔

۱۲۷ سبزواری شوکت
فروغ شمع سخن
(ماہ نو کراچی ۶۲ اپریل ۳۴-۳۹)
مجوزہ اردو لغت کے نمونے پر اعتراضات کا جواب دیا ہے۔

۱۲۸ سخاوت میرزا
حضرت سید قبول بادشاہ رح حیدرآبادی اور داغ دہلوی
(قومی زبان کراچی ۶۲ مئی ۲۳-۳۶)
ایک مشہور بزرگ کا مختصر تعارف کراتے ہوئے ان کا داغ کے حق میں دعا فرمانا بتایا ہے۔

۱۲۹ سلام مچھلی شہری
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں
(قومی زبان کراچی ۶۲ مئی ۲۲-۲٤)
شاگرد داغ متین مچھلی شہری کا ایک خط سلام مچھلی شہری کے نام۔

۱۳۰ سلام مچھلی شہری
میرا خیال — روزنامچے کے چند اوراق
(قومی زبان کراچی ۶۲ اپریل ۳۰-۳۳)

۱۳۱ سہاروی اسرار احمد
علامہ اقبال اور روایت
(فاران کراچی ۶۲ مئی ۱۹-۲۳)
اقبال کی شاعری میں روایت کی اہمیت اور اثر کی مثالیں دی ہیں۔

۱۳۲ سیال امیرحسن
شاعری میں موسیقی
(ماہ نو کراچی ۶۲ جون ٦-۱۵)
شاعری میں موسیقی کا عنصر اور اس کا دخل اور اثر ظاہر کیا ہے۔

۱۳۳ سید حسن
بیاض باسطی
(مجلہ علوم اسلامیہ علی‌گڑھ ۶۰ دسمبر ۲۰-۴۷)
بندہ علی خاں باسطی کی بیاض کا ذکر ہے۔

۱۳۴ سید شمیم احمد
اقبال کا نظریۂ تصوف
(ساقی کراچی ۶۲ اپریل)
اقبال پر تصوف شروع سے غالب تھا، نیز ان کا نظریۂ تصوف بہت صاف اور نکھرا ہوا تھا، اس لحاظ سے ان کے تصوف میں انفرادیت تھی۔

۱۳۵ سید محمد حسنین
کلام شاد اور جناب قاضی عبدالودود
(شاعر بمبئی ۶۲ اپریل - مئی ۲۰-۲۴)
تفصیل سے بتایا ہے کہ جناب

قاضی عبدالودود کے ہاتھوں کلام شاد کی تدوین و اشاعت سے شاد عظیم آبادی خوش نہ تھے۔

۱۳۶ محمد حسین

انشائیہ، ایک صنف ادب

(ساقی کراچی ۶۲ مئی)

انشائیہ کی ماہیت پر بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ وہ نثری ادب کا ایک جزو اور بالغ ذہن کی ایک ترنگ ہے۔

۱۳۷ سید محمود حسن قیصر

سید عبد اللہ جائسی لندنی

(نوائے ادب بمبئی ۶۱ اپریل ۳۹-۵۶)

سید عبد اللہ جائسی نے یورپین ممالک میں ہندوستانی ادب کی اشاعت میں حصہ لیا۔ مضمون نگار نے ان کے حالات قلمبند کئے ہیں۔

۱۳۸ سید نعیم الدین

بروصہ کے کتب خانے

(مجلہ علوم علیگڑھ ۶۱ جون ۱۶۵-۱۸۰)

بروصہ کے کتب خانوں کے چند فارسی مخطوطات کا ذکر ہے۔

۱۳۹ شفیق النساء بیگم

شاعر حسن

(ادیب علیگڑھ ۶۲ اپریل ۹-۱۷)

ولی دکنی کی شاعری پر تبصرہ ہے۔

۱۴۰ شفیق النساء بیگم

محمد قلی قطب شاہ ـــ شخصیت اور فن کے چند پہلو

(سب رس ۶۲ اپریل)

محمد قطب شاہ کی لسانی خدمات کا تذکرہ اور اس کی شاعری کی ہمہ گیری اور خصوصیات سے بحث کی گئی ہے۔

۱۴۱ شفیق النساء بیگم

شیر علی افسوس

(ادیب علیگڑھ ۶۲ مئی و جون ۴۱-۴۵)

افسوس کی تصنیف آرائش محفل کا تذکرہ ہے۔

۱۴۲ شوق سمت پرکاش

فراق سے ایک ملاقات

(آجکل دہلی ۶۲ مئی ۳۴-۳۷)

فراق کی شاعری کا نقطۂ نظر بتایا گیا ہے۔

۱۴۳ شہلا عاصمہ

شیفتہ کی شاعری

(قومی زبان کراچی ۶۲ اپریل ۶۰-۷۰)

تنقیدی مضمون ہے۔

۱۴۴ صدیقی آمنہ

جدید شاعری کا المیہ

(ماہ نو کراچی ۶۲ جون ۱۶-۱۹)

۱۴۵ صوفی ضیاء الحق

عربی ادب

(اوزینٹل کالج میگزین لاہور ۶۲ مئی ۱-۱۵)

عربی ادب سے متعلق چند بیانات اور ان کی تحقیق ہے۔

۱۴۶ طالب کشمیری

سرمایۂ کلام غالب

(نوائے ادب بمبئی ٦٢ اپریل ۲۱-۲۹)
شعر و شاعری کی حقیقت سے متعلق مشہور نقادوں کی رائیں پیش کرنے کے بعد کلامِ غالب کے محاسن و معائب کا جائزہ لیا ہے . (باقی)

۱۴۷ ظہیر ناشاد ، دربھنگوی
ایک آفتابِ تازہ - اویس احمد ذوراں
(صبح نو پٹنہ ٦٢ مئی ۲۵-۳۱)
کلکتہ کے ایک ابھرتے ہوئے شاعر کا تعارف کرایا ہے .

۱۴۸ عابد رضا بیدار
اقبال کی ایک نظم پر بحث
(جامعہ دہلی ٦٢ اپریل ۳۵۳-۳٦۰)
اقبال کی ایک نظم « نصیب ما زجہان است بقدر ہمت ما » مطبوعہ زمانہ کانپور ، جنوری ۱۹۱۹ پر کرنل بھولا ناتھ کی تنقید ہے .

۱۴۹ عابد رضا بیدار
بابائے اردو کا رسالہ افسر
(قومی زبان کراچی ٦٢ اپریل ۹-۱۵)
رسالہ افسر کا تعارف کراتے ہوئے اس سے مولانا عبدالحق کے دو مضامین پیش کئے ہیں .

۱۵۰ عابد حسین
غزل کا مستقبل
(جامعہ دہلی ٦٢ مئی ۲۸۷-۲۹۰)
ایک نشریہ ہے .

۱۵۱ عبدالستار صدیقی
حرف ق
(مجلہ علوم اسلامیہ علی گڑھ ٦۱ جون ۱-۱٦)
معرب لفظوں میں حرف « ق » کی اہمیت واضح کی ہے .

۱۵۲ عبدالرحمن صاحب طارق
احادیث نبوی اور علامہ اقبال
(عارف لاہور ٦٢ اپریل ۱۵-۱۷)
احادیث سے متعلق اقبال کے عقیدے سے بحث کی ہے .

۱۵۳ عبدالودود
اقبال ، سہیل اور اردو قصیدہ نگاری
(ادیب علی گڑھ ٦٢ اپریل ۲٦-۳۴)

۱۵۴ عثمان صدیقی
خیام اردو
(ادیب علی گڑھ ٦٢ مئی و جون ۱٦-۲۵)
جوش ملیح آبادی کے کلام کا جائزہ ہے .

۱۵۵ عثمان غنی عراقی
« بنت ہمالہ » - پرویز شاہدی کی قومی نظم
(شاعر بمبئی ٦٢ اپریل و مئی ۳۱-۳۳)
پرویز شاہدی کی نظم « بنت ہمالہ » پر تبصرہ ہے .

۱۵٦ علیم اللہ حالی
اردو شاعری کے نئے عناصر
(اشارہ پٹنہ ٦٢ اپریل)
اشتراکی ادب اور زندگی کے نئے مسائل نے اردو شاعری کو کس درجہ متاثر اور اسے کس نئی راہوں سے روشناس

کرایا ہے ان راہوں سے محبت کی ہے.

۱۵۷ غبار یاور

شاعری میں موزونیت

(جام نوکراچی ٦۲ جون ۱۵-۱۹)

حقیقت یہ ہے کہ اوزان و قوافی اعلیٰ شاعری کے لئے سب سے بڑی رکاوٹ ہیں لیکن شعر کی بنیاد نظم کے کسی نہ کسی اسلوب پر رکھے بغیر چارہ نہیں. صرف مسلسل بغاوت اور تجربات ہمیں ان سے چھٹکارہ دلاسکتے ہیں.

۱۵۸ غبار یاور

عبد العزیز شاویش

(تعمیر انسانیت لاہور ٦۲ اپریل ۹-۱٦)

ایک مصری مفکر، شاعر و رہنما کا تعارف کرایا ہے.

۱۵۹ غوری شبیر احمد

علم المثلثات

(مجلہ علوم اسلامیہ علی گڑھ ٦۲ جون ۱۷-۱۸)

البیرونی سے پہلے علم المثلثات کے ارتقا پر روشنی ڈالی ہے.

۱٦۰ غوری شبیر احمد

علامہ اقبال اور مسئلہ زماں

(معارف اعظم گڑھ ٦۲ جون)

مسئلہ زماں کے سلسلے کی اہم کڑیوں کو پیش کیا ہے. اس کے علاوہ فلاسفۂ یونان، متکلمین اور اکابر علماء کے تدریجی خیالات بھی ذکر کئے ہیں.

۱٦۱ غوری شبیر احمد

عمر خیام کی رباعیاں

(فروغ اردو لکھنؤ ٦۲ مئی ۷-۲۵)

خیام کے بارے میں حضرت ناطق گلاؤٹھی کے اعتراضات کا جواب ہے.

۱٦۲ غلام رسول مہر

آزاد بلگرامی

(معارف اعظم گڈھ ٦۲ مئی)

عبد الرزاق صاحب قریشی کے مقالہ سید آزاد بلگرامی (مطبوعہ معارف مارچ ۱۹٦۲) پر استدراک، بعض اشعار کی صحت اور ان کی ترتیب پر اشارے کئے ہیں.

۱٦۳ غلام مصطفےٰ خاں

دیوان ظہیر اور اس کا مصنف

(معارف اعظم گڑھ ٦۲ اپریل)

ظہیر فاریابی سے جو فارسی دیوان منسوب کیا جاتا ہے، اس کے بارے میں تحقیق کی ہے کہ وہ دیوان در اصل ظہیر اصفہانی کا ہے. اس سلسلہ میں کئی ثبوت پیش کئے ہیں. کئی اشعار بطور نمونہ لکھے ہیں. جس سے قیاس ہوتا ہے کہ ظہیر اصفہانی بہت اونچے درجہ کا شاعر نہ تھا.

۱٦۴ فارانی فضل کریم

مسکرات اور صحت

(ثقافت لاہور ٦۲ جون ۵۰-٦۵)

منشیات کے استعمال، فوائد، نقصانات اور دنیا میں رواج کا تفصیلی

تذکرہ ہے ۔

۱۶۵　فتحپوری نیاز

قصائد مومن میں عنصر تغزل

(نگار لکھنؤ ۶۲ اپریل ۲۸-۳۴)

۱۶۶　فتحپوری نیاز

مبالغہ، طنز و مزاح فارسی شاعری میں

(نگار لکھنؤ ۶۲ اپریل ۱۷-۲۲)

فارسی شاعری میں مبالغہ، طنز و مزاح کے عناصر کی مثالیں دی ہیں ۔

۱۶۷　فتحپوری نیاز

ابوالہذیل معتزلی امام کی مناظرانہ فراست

(نگار لکھنؤ ۶۲ مئی ۲۷-۲۹)

ابو الہذیل معتزلی کی مناظرانہ صلاحیتوں کا دلچسپ تذکرہ ہے ۔

۱۶۸　محمد فضل الرحمن ندوی

مثنوی مظہر البرکات

(مجلہ علوم اسلامیہ علی گڑھ ۶۰ دسمبر ۸۱-۹۹)

مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کی ایک عربی مثنوی کا تذکرہ ہے ۔

۱۶۹　فضل الرحمن ندوی

چہار صد ایراد بر کلام آزاد

(مجلہ علوم اسلامیہ علی گڑھ ۶۱ دسمبر ۹۳-۱۲۰)

غلام علی آزاد بلگرامی پر ملا باقر آگاہ کی کتاب عثرات آزادیہ یعنی « چہار صد ایراد بر کلام آزاد » کا تذکرہ ہے ۔

۱۷۰　فیاض الدین حیدر

میرزا فاخر مکین

(مجلہ علوم اسلامیہ علی گڑھ ۶۰ دسمبر ۴۸-۵۷)

میرزا فاخر مکین کو ان کے خطوط کی روشنی میں پیش کیا ہے ۔

۱۷۱　فیضی سید

دیوانۂ آتش نوا

(ماہ نو کراچی ۶۲ مئی ۶-۸)

قاضی نذر الاسلام کی انقلابی شاعری کا تذکرہ کیا ہے ۔

۱۷۲　قاضی عبد الودود

محرق قاطع برہان

(نوائے ادب بمبئی ۶۲ اپریل ۵-۱۲)

محرق قاطع برہان مصنفۂ میرسعادت علی کا حاصل مطالعہ پیش کیا ہے ۔

۱۷۳　قاضی عبد الودود

غالب کا کلیات نظم فارسی

(مجلہ علوم اسلامیہ علی گڑھ ۶۰ دسمبر ۱-۲۶)

غالب کے کلیات نظم فارسی کے قدیم ترین موجودہ نسخے پر تبصرہ ہے ۔

۱۷۴　قاضی عبد الودود

فرہنگ ابوحفص سغدی

(مجلہ علوم اسلامیہ علی گڑھ ۶۰ جون ۹-۱۶)

شہرود کے موجد ابوحفص اور فرہنگ ابوحفص کے مصنف حقیقی کا پتہ لگانے کی کوشش کی ہے ۔

۱۷۵　قاضی عبد الودود

دیوان نجیب الدین جربادقانی

(مجلہ علوم اسلامیہ علی گڑھ ۶۱ دسمبر ۷۹-۹۲)

عہد سلجوقیہ کے ایک شاعر کا انتخاب کلام ہے ۔

۱۷۶ قاضی مشتاق احمد
آسان زبان کی ضرورت
(صبح امید بمبئی ۶۲ جون ۹-۱۱)
ادیب کا فرض ہے کہ وہ آسان عوامی زبان میں اپنی تخلیقات پیش کرے۔

۱۷۷ قریشی اقبال حسین
اقبال اور قرآن
(برہان دہلی ۶۲ اپریل)
اقبال کے کلام میں قرآنی تلمیحات کے تحت جو آیتیں آتی ہیں انہیں بیان کیا ہے۔ اس مقالہ میں اقبال کی کتابوں کی ترتیب تاریخی رکھی گئی ہے۔

۱۷۸ قمر رئیس
ٹیگور کا اثر اردو نثر پر
(ادیب علی گڑھ ۶۲ اپریل ۱۸-۲۰)

۱۷۹ کبیر احمد جائسی
فراق گورکھپوری
(ادیب علی گڑھ ۶۲ مئی و جون ۲۶-۳۳)
فراق کی شاعری اور تنقیدی نظریات کا بیان ہے۔

۱۸۰ کرامت علی کرامت
ادب اور فکری شعور
(نگار لکھنؤ ۶۲ اپریل ۷-۱۶)
ادب کی جڑیں انسانی ذہن و شعور میں پیوست ہیں۔

۱۸۱ کلب علی خاں فائق رامپوری
میر سوز
(اورینٹل کالج میگزین لاہور ۶۲ مئی ۱-۲۶)
محمد میر سوز کا مختصر تذکرہ ہے۔

۱۸۲ گیان چند ڈاکٹر
اردو ٹائپ میں تلفظ کا مسئلہ
(اردو ادب بمبئی ۶۲ اپریل ۶۶-۷۱)
مذکورہ موضوع پر سید شہاب الدین دسنوی کے مضمون پر تنقید کرتے ہوئے مضمون نگار نے اپنی تجویز پیش کی ہے۔

۱۸۳ مبارز الدین رفعت
عطائی
(سب رس ۶۲ اپریل)
عہد محمد قلی قطب شاہ کے ایک گمنام شاعر کا مختصر تعارف۔

۱۸۴ محمد احسن فاروقی
جدید ادب اور اشاریت
(ساقی کراچی ۶۲ مئی)
سمبلزم اور نیچرازم کے ارتقا پر روشنی ڈالی ہے اور ثابت کیا ہے کہ اشاریت انسانی تخئیل کی تخلیقات میں سب سے بلند درجہ پر فائز ہے۔

۱۸۵ محمد احمد صدیقی
اقبال کی غزل گوئی
(جام نو ۶۲ مئی ۱۵-۲۲)
اقبال کی غزل پر تبصرہ ہے۔

۱۸۶ محمد شفیع
ایک خط
(اورینٹل کالج میگزین لاہور ۶۲ فروری ۱-۵)
مالک بن الریب کے مطول مرثیہ کا تذکرہ ہے۔

۱۸۷ محمد عبد الرحیم

پاکستانی عدالتیں اور زبان اردو
(قومی زبان کراچی ۶۲ مئی ۱۹-۲۱)
پاکستانی عدالتوں میں اردو زبان کے استعمال کی ترغیب دلائی ہے۔

۱۸۸ محمد مجیب
میری ادبی زندگی
(فروغ اردو لکھنؤ ۶۲ اپریل ۹-۱۵)
آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ کا ایک نشریہ ہے جس میں مقرر نے انتہائی بے تکلفی سے ان ناقابل فراموش واقعات اور شخصیتوں کا ذکر کیا ہے جن سے وہ متاثر ہوئے۔

۱۸۹ محمد مسعود احمد
بابائے اردو سے چند ملاقاتیں
(قومی زبان کراچی ۶۲ مئی ۲۵-۳۰)

۱۹۰ محمود حسن قیصر امروہوی
رجال نہج البلاغہ
(مجلہ علوم اسلامیہ علی گڑھ ۶۱ جون ۸۱-۱۲۸)
حضرت علی علیہ السلام کے خطبات کے راویوں کا تذکرہ ہے۔

۱۹۱ محمود حسن قیصر امروہوی
رجال نہج البلاغہ (۲)
(مجلہ علوم اسلامیہ علی گڑھ ۶۱ دسمبر ۳۰-۷۸)
حضرت علی علیہ السلام کے خطبات نہج البلاغہ کے راویوں کا تذکرہ ہے

۱۹۲ محی الدین زور
غلام محی الدین خان متین
(ادیب علی گڑھ ۶۲ اپریل ۴-۸)
حیدرآباد کے ایک مشہور شاعر کا تذکرہ ہے

۱۹۳ مرزا خانم ممتاز
حافظ شیراز
(نگار لکھنؤ ۶۲ جون ۳۵-۴۰)
حافظ کی زندگی، کلام اور افادیت کا تفصیلی تعارف ہے

۱۹۴ مرزا سعید الظفر چغتائی
پند نامۂ جوش پر ایک نظر
(فروغ اردو ۶۲ اپریل ۱۷-۳۳)
جوش ملیح آبادی کی طویل نظم «پند نامہ» کا مطالعہ خود شاعر کی گذشتہ رندانہ زندگی کی روشنی میں کیا گیا ہے

۱۹۵ مغنی تبسم
خورشید احمد جامی کی غزل گوئی
(شاعر بمبئی ۶۲ اپریل و مئی ۱۵-۱۹)
خورشید احمد جامی کی غزل گوئی کا تنقیدی جائزہ لیا ہے

۱۹۶ مفتون کوٹوی
پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی
(ادیب علی گڑھ ۶۲ اپریل ۲۱-۲۵)

۱۹۷ میری شمیل
اقبال اور عشق رسول
(قومی زبان کراچی ۶۲ مئی ۳۸-۴۴)
ایک جرمن مستشرق ڈاکٹر این میری شمیل کا اردو مقالہ ہے

۱۹۸ نارنگ گوپی چند
آج کا اردو ادب
(صبا حیدرآباد ۶۲ فروری و مارچ ۹-۱۵)
اردو ادب کا سرسری جائزہ لیا ہے

۱۹۹ ندوی سید احتشام احمد
ابوالعلا معری پر ہندوستانی فلسفہ کے اثرات
(نگار لکھنؤ ۶۲ جون ۲۷-۳۱)
ہندوستانی فلسفہ اور معری کے خیالات میں مطابقت کی مثالیں دی ہیں

۲۰۰ نذیر احمد
دیوان حافظ
(مجلہ علوم اسلامیہ علی گڑھ ۶۰ دسمبر ۵۸-۶۸)
کتب خانہ آصفیہ کے ایک نسخۂ دیوان حافظ کا ذکر ہے

۲۰۱ نصیرالدین ہاشمی
آئینۂ سکندر یعنی بمبئی کا پہلا اردو اخبار (۱۸۳۴ع)
(نوائے ادب، بمبئی ۶۲ اپریل ۱۳-۲۰)
آئینۂ سکندر کا ایک فائل حیدرآباد میں محفوظ ہے جس کے بعض شماروں سے بطور تعارف اقتباسات پیش کئے ہیں

۲۰۲ نقوی سید قدرت
اردو رسم‌الخط
(ماہ نو کراچی ۶۲ مئی ۱۸-۲۸)
اردو رسم‌الخط کی دشواری سے متعلق ہے

۲۰۳ وحشی سحری
محزون چکمکوی
(فروغ اردو لکھنؤ ۶۲ مئی ۵۱-۵۹)
بہار کے ایک غیر معروف ادیب و شاعر کا تذکرہ ہے

۲۰۴ ویریندر پرشاد سکسینہ
منشی دیبی پرشاد مائل مین پوری
(قومی زبان کراچی ۶۲ مئی ۳۱-۳۲)
داغ کے ایک شاگرد کا تعارف کرایا ہے

۲۰۵ ویریندر پرشاد سکسینہ
جسونت سنگھ پروانہ
(قومی زبان کراچی ۶۲ اپریل ۵۰-۵۱)
شجاع‌الدولہ کے دور کے ایک شاعر کا تعارف کرایا ہے

۲۰۶ یوسف سرمست
مومن کی عشقیہ شاعری
(نوائے ادب، بمبئی ۶۲ اپریل ۳۰-۳۸)
مومن کے تغزل کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے بتایا ہے کہ مومن نے اپنی عشقیہ شاعری میں ناز حسن اور نیاز عشق کی تفصیل کو پیش کرتے ہوئے گہرے نفسیاتی شعور کا ثبوت دیا ہے

تعلیمات

۲۰۷ دل عافیہ
تدریس اردو (بنگالی مبتدیوں کے لئے)
(ماہ نو کراچی ۶۲ اپریل ۴۲-۴۴)

۲۰۸ سلامت‌اللہ
تعلیم اور فلسفہ کا باہمی تعلق
(جامعہ دہلی ۶۲ مئی ۴۰۰-۴۰۸)

۲۰۹ محمد احمد صدیقی

پاکستان کے نظام تعلیم کا عملی پہلو
(جام نو کراچی ۶۲ آئین نمبر ۲۷-۳۳)
نظام تعلیم میں زبانوں کی اہمیت کو واضح کیا ہے

۲۱۰ نند گوپال
ہندوستان میں اندھوں کی تعلیم
(ہندوستانی ادب، حیدرآباد ۶۲ جون ۲۲-۲۳)
اندھوں کی تعلیم کے طریقے اور سرکاری کوششوں سے متعلق ضروری معلومات دی ہیں

متفرقات

۲۱۱ سیتا نارائن. ایم
ہندوستانی ثقافت میں دکن کا حصہ
(ہندوستانی ادب، حیدرآباد ۶۲ اپریل ۲۰-۲۱)

۲۱۲ سکارز اسراللہ
مترجم سرہندی وارث
جس کا مفہوم نفسیات جنس کا پہلا باب
(فاران کراچی ۶۲ مئی ۳۶ ۶)
مسئلہ جنسیات پر تفصیلی اور مدلل بحث ہے

ایڈیٹر: نجیب اشرف ندوی
پرنٹر پبلشر حامد اللہ ندوی نے ادبی پرنٹنگ پریس، ۸ شیفرڈ روڈ، بمبئی ۸ میں چھپواکر انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی ۱ سے شائع کیا

اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی تازہ پیشکش

دیوانِ عزلتؔ

گجرات کے ایک قدیم اور مایۂ ناز اردو شاعر

کا نایاب دیوان

جسے انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی، کے رفیق

جناب عبدالرزاق قریشی

نے بڑی تحقیق اور کاوش سے مرتب کیا ہے

شروع میں مرتب کا ۱۸۰ صفحہ کا عالمانہ مقدمہ درج ہے

کتاب ادبی پریس کے نہایت

خوب صورت نسخ ٹائپ میں چھپی ہے

ضخامت ۱۸۲ + ۲۱۶ قیمت : دس روپے

ملنے کا پتہ :

ادبی پبلشرس، ۸ شیفرڈ روڈ، بمبئی ۸

فارم IV

دیکھو رول نمبر ۸

نوائے ادب ، بمبئی

مقام اشاعت	:	انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹیٹیوٹ دادا بھائی نوروجی روڈ، بمبئی ۱
نوعیت اشاعت	:	سہ ماہی
نام پرنٹر	:	حامد اللہ ندوی
قومیت	:	ہندوستانی
پتہ	:	۲، مسینا بلڈنگ ، کلیر روڈ، بمبئی ۸
نام پبلشر قومیت پتہ		ایضاً
نام ایڈیٹر	:	نجیب اشرف ندوی
قومیت	:	ہندوستانی
پتہ	:	اندھیری، بمبئی ۴۱
نام ، پتہ مالک رسالہ	:	انجمن اسلام ۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ ، بمبئی

میں حامد اللہ ندوی تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم میں صحیح ہیں ۔

Nawa-e-Adab

A QUARTERLY JOURNAL OF

THE ANJUMAN-I-ISLAM URDU RESEARCH INSTITUTE

Annual Subscription :

Inland & Pakistan : Rs. 4 Foreign : Shillings 8

(inclusive of postage)

Price per copy: Rupee One

Vol 13] January-March 1962 [No. 1

All remittances be made to

THE ADABI PUBLISHERS.

8 Shepherd Raod, Bombay 8. (India)